1938

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ

لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ ۝ ؏

ترجمہ

کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں
رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں (اور) نصیحت
تو وہی پکڑتے ہیں جو عقلمند ہیں (الزّمر - ۹)

اُردو لازمی

جماعت نہم و دہم

نیو کریسنٹ پبلشرز۔ اُردو بازار لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بُک بورڈ لاہور

تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	ایڈیشن
اپریل 1976	95,000	اوّل

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور و منظور کردہ حکومتِ پنجاب (محکمہ تعلیم) لاہور
بذریعہ سرکلر نمبر 74/25-10(C)-S-O مورخہ 15-7-1975
نظرثانی شدہ، قومی ریویو کمیٹی وفاقی وزارتِ تعلیم و صوبائی رابطہ حکومتِ پاکستان

تالیف:

پروفیسر عمر فیضی
انتظار حسین
سرور ایوبی
مسز توصیف افضل
مسز سعیدہ سلیم اختر
سید وحید الحسن ہاشمی

تدوین:

سید سجاد رضوی

ناشر: الحاج عبد المجید قریشی
طابع: کیمبرج پریس۔ لاہور

فہرست مضامین

حصۂ نثر

حصۂ نظم

پیش لفظ

نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق تیار شدہ یہ کتاب نویں دسویں جماعتوں کے لئے لازمی نصاب کے طور پر مرتب کی گئی ہے۔ اسے مرتب کرتے وقت دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اول یہ کہ اس کا مطالعہ طلبہ کو زبان اور بیان پر قدرت حاصل کرنے میں مدد دے اور وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ سے صحیح اور سادہ زبان میں اظہار مطالب پر قادر ہو سکیں۔ دوّم ان میں پاکستانی قومیت کے صحیح شعور کی نشوونما ہو۔

سیرت اور کردار کی تعمیر کے لئے کسی اعلیٰ نصب العین کا پیش نظر ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر نئی نسل کی تربیت کے ضمن میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کئے بغیر ایک آزاد قوم کی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ طَلبہ اُن عوامل و مقاصد کا بھرپور شعور رکھتے ہوں جن کی بنا پر اس خطۂ ارض کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک الگ ملک قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس ملک کو قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی تعبیر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے ہر فرد کے دل میں پاکستان کے مشن کی شمع روشن ہو۔

یہ کتاب تمام مندرجۂ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں جن مصنفین کی تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے وہ اردو کے مستند ادیب اور شاعر ہیں۔ مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ

موضوعات کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اصناف ادب کو نمائندگی دی جائے۔ ہر سبق سے پہلے مصنف کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی نوٹ بھی دیا گیا ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر مصنف اور اس کی تصنیف کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

کتاب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ طلبہ کو آسان اسباق سے مشکل اسباق کی طرف لے جایا جائے۔ اس لئے مصنفین کی تخلیقات تاریخی اعتبار سے مرتب نہیں کی گئیں۔ ہر سبق کے آخر میں مختلف قسم کے سوالات دیے گئے ہیں۔ جن میں قواعد و علم بیان سے متعلق ایسے سوال بھی شامل ہیں جو طلبہ کو قواعد و انشاء کے نصاب کا عملی تجربہ حاصل کرنے میں مدد دے سکیں۔

اساتذہ اور طلبہ کی آسانی کے لئے کتاب کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصۂ نثر پہلے رکھا گیا ہے اور حصۂ نظم بعد میں اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ نظم کو سمجھنا اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا نسبتاً مشکل ہے۔

امید ہے کہ اساتذۂ کرام اس کتاب کی تدریس کے تجربات کی روشنی میں اپنی تجاویز و آراء سے مؤلفین اور پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو نوازیں گے تا کہ اس کتاب کو مفید سے مفید تر بنایا جا سکے۔

مؤلفین

بابائے قوم قائدِ اعظمؒ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا - ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان بنانے کی پاداش میں بھیانک مظالم کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کیا گیا - سربراہ مملکت بننے کے بعد لاہور کے شہریوں سے قائداعظم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ میں پہلی بار خطاب فرمایا - اس میں ان المناک واقعات کا ذکر ہے - قوم کو در پیش مسائل کا بیان ہے اور قرآن پاک کو مشعل ہدایت بنا کر آگے بڑھنے کی تلقین ہے -

قوم سے خطاب

ہم نے آزادی کی منزل مقصود پا لی ہے اور ایک آزاد اور خود مختار ملک "پاکستان" قائم کر لیا ہے جو دنیا کی پانچویں بڑی مملکت ہے - کوئی قوم بھی مصیبتوں اور قربانیوں کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتی اور بر صغیر میں رونما ہونے والے حالیہ المناک واقعات اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں - ہم ایسی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی اور ایسے مصائب سے دوچار ہیں جو اندازے سے باہر ہیں - ہمیں خوف اور کرب کے تاریک دن دیکھنا پڑے ہیں - مگر میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمت اور خود اعتمادی کے بل پر اور خدا کے فضل و کرم سے ہم

اس مرحلے سے کامیاب گزر جائیں گے ۔

ممکن ہے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء والے منصوبے کو مان کر مسلم لیگ نے غلطی کی ہے ۔ میں ان پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی اور حل کے نتائج اس قدر تباہ کن اور ہولناک ہوتے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس منصوبے پر نہایت صاف دلی اور نیک نیتی سے عمل پیرا ہوئے ہیں ۔ وقت اور تاریخ اس کی تصدیق کریں گے ۔ دوسری طرف تاریخ ان لوگوں کے خلاف بھی فتویٰ صادر کرے گی ، جن کی دغا بازیوں اور سازشوں نے برصغیر کو بدامنی اور انتشار کی آگ میں جھونک دیا ۔ لاکھوں قتل کر دیے گئے ، بے اندازہ املاک تباہ ہوئیں ، لاکھوں انسانوں کو گھروں سے بے گھر کر کے ان کے عزیزوں اور ہر اس چیز سے جو انھیں پیاری تھی ، محروم کر کے شدید آلام و مصائب میں مبتلا کر دیا گیا ۔ نہتے اور بے گناہ لوگوں کے اس منظم قتل عام کے سامنے ان خونخوار لوگوں کے وحشیانہ مظالم بھی بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں جن کی درندگی تاریخ میں ضرب المثل ہے ، ہم ایک بہت گہری اور ایسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے ہیں ، جسے ایمانداری ، جوانمردی اور شرافت کی ابجد تک کو بالائے طاق رکھ کر بروئے کار لایا گیا ہے ۔ پروردگار عالم کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں باطل کی ان قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمت اور اعتماد سے نوازا ۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ فتح بالآخر ہماری ہوگی بشرطیکہ ہم قرآن کریم کو اپنے لیے فیضان و ہدایت کا سر چشمہ بنائے رکھیں ۔

ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہ کیجیے کہ دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جس صورت حال کا ہمیں سامنا ہے ، اسے معمولی بھی نہ سمجھیے اپنے دلوں کو

ٹٹولیے اور جائزہ لیجیے کہ آپ اس نئی اور عظیم مملکت کی تعمیر میں کہاں تک شریک ہیں ۔ کام یقیناً بڑا ہے ، مگر دل چھوٹا نہ کیجیے تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ ابھرتی ہوئی قوموں نے محض عزم اور قوت کردار سے اپنے لیے بلند مقام پیدا کیا ہو ۔ آپ بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں اور کسی سے کم تر نہیں ۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ بھی صرف دوسروں کی طرح ہی نہیں بلکہ اپنے اسلاف کی طرح اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکیں ۔ آپ کو اپنے اندر صرف مجاہدانہ جذبہ پیدا کرنا ہے ۔ آپ وہ ہیں قوم جس کی تاریخ جگرداری ، عظمت کردار اور شجاعت کے حیرت انگیز تذکروں سے بھری پڑی ہے ۔ اپنی روایات کو برقرار رکھیے اور تاریخ میں ایک اور درخشاں باب کا اضافہ کیجیے ۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص ، جس تک بھی میرا پیغام پُہنچے ، اس مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا نہ صرف عہد کرے بلکہ ضرورت پڑنے پر اس کے لیے تیار بھی رہے کہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانا ہے اور ایسی قوموں کی صف میں کھڑا کرنا ہے جن کا مقصد ملک کے اندر اور ہر جگہ امن ہو ۔ آپ کا اولین کام لاکھوں مصیبت زدہ اور بدقسمت بھائیوں کی بحالی ہے ۔ جو اپنا سارا دنیاوی سامان لٹا کر ہمارے پاس پاکستان میں آ گئے ہیں ۔ یا ابھی ہجرت کر کے آ رہے ہیں ۔ سرِ دست ہم ان کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ حقیقی بھائیوں کی طرح ان کا خیر مقدم کریں کسی مہذب اور ہوشمند شخص کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہمارے لیے ایسا بوجھ ہیں جسے خواہ مخواہ ہم پر ٹھونسا گیا ہو ۔ آپ جو کچھ بچا سکتے ہیں ، بچائیے اور ان لوگوں کی بحالی کے لیے دیجیے جو تشدد ، بہیمیت اور بربریت کا شکار ہوے ہیں اور جنھیں یہ سب کچھ محض اس لیے بھگتنا پڑا کہ وہ مسلمان ہیں ۔ اس کے ساتھ اپنی ہمتیں بلند رکھیے ۔ موت سے

ڈرتے نہیں - ہمارا دین ہمیں ہر وقت موت کے لیے تیار رہنے کا سبق دیتا ہے - پاکستان اور اسلام کی حرمت کے لیے حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیے - مسلمان کے لیے راہ حق میں شہادت کی نعمت سے بڑی کوئی سعادت نہیں -

میں ملک کے ہر فرد کو اور خاص طور پر اپنے جوانوں کو یہ تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تن دہی ، ہمت اور مستقل مزاجی کے صحیح اوصاف سے کام لیتے ہوئے دوسروں کی رہنمائی کریں اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک اچھی اور اعلیٰ مثال قائم کریں -

یاد رکھیے ! ہر قسم کی ترقی کے لیے نظم و ضبط کی سختی سے پابندی اور نفاذ ہی بنیادی شرطیں ہیں - شریعت اسلامی کی رو سے ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے ہمسایوں اور اقلیّتوں کی حفاظت کرے - ہندوستان میں مسلم اقلیّت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس کے باوجود ہمیں اقلیتوں کی حفاظت اور ان میں احساسِ تحفظ پیدا کرنے کے سوال کو اپنی عزت اور وقار کا مسئلہ سمجھنا چاہیے - میں ہر اس مسلمان کو جو پاکستان کی فلاح و بہبود کا دل سے آرزو مند ہے ، تاکید کرتا ہوں کہ وہ انتقامی کارروائی سے باز رہے اور تحمّل سے کام لے - کیونکہ انتقامی کارروائی اور قانون شکنی بالآخر اس عظیم عمارت کی بنیاد ہی کو کمزور کر دے گی ، جس کی تعمیر کا آپ اس تمام مدت میں خواب دیکھتے رہے ہیں -

اپنا فرض ادا کیجیے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے - دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کر سکتی - یہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے - ہمارے عمل نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ساری دنیا اور خاص طور پر اسلامی ممالک کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں ہم ہر ایسی قوم کے

ممنون ہیں جس نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔

آخر میں، میں اپنے ملک کے ہر باشندے اور شہری کی شرافتِ نفس سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا اور اپنے رویے اور عمل سے اپنی حکومت اور ان رہنماؤں کے لیے طاقت کا ستون ثابت ہوگا جو خلوص دل سے ہمارے ان بدقسمت بھائیوں کے آلام و مصائب کا اِزالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، جو ہمارے پاس پناہ حاصل کرنے آئے ہیں۔ اور ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو خود ہمیں در پیش ہیں۔

سوالات

۱ - ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ کیا تھا؟

۲ - کیا ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کو مان کر مسلم لیگ نے غلطی کی تھی؟ اس کے سوا کسی اور حل کے نتائج کیا ہوتے؟

۳ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مسلمانوں سے کیا سلوک کیا گیا؟

۴ - قائد اعظم نے اس تقریر میں نوجوانوں کو کیا تلقین کی ہے؟

۵ - کیا پاکستان کے مسلمانوں نے قائد اعظمؒ کے ان ارشادات پر عمل کیا؟ ایک مختصر سے مضمون میں بتائیے کہ قائد اعظمؒ کے انتقال کے بعد پاکستان میں کیا کچھ ہوا۔

—— : ٥ : ——

سیّد علی ناصر زیدی

سید علی ناصر زیدی کوتپور ضلع بجنور میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اسلاف علم و فضل میں ممتاز تھے سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور پھر ڈیرہ دون میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طبیعیّات میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کیا ۱۹۴۸ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں ملازمت اختیار کی پھر کچھ مدت کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں استاد رہے بعد ازاں فوج کے ایجوکیشن کور سے متعلق ہو گئے ۱۹۶۶ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے فوج سے مستعار طور پر ان کی خدمات حاصل کیں۔ یہاں وہ ۱۹۷۴ء تک ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ آج کل پھر فوج کی ایجوکیشن کور سے متعلق ہیں۔

سید صاحب تقریباً ایک سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے سائنسی موضوعات پر بڑے عام فہم اور دلنشیں انداز میں لکھا ہے۔ ان کی نثر میں بڑی سادگی اور روانی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو نہایت سادہ زبان میں بیان کرتے ہیں حکومت پاکستان سید صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں ''تمغۂ امتیاز'' دے چکی ہے۔

غرق شدہ خزانے کی بازیابی

بحری جہاز ہر سال لاکھوں کروڑوں روپیہ کا سونا دنیا کے مختلف ملکوں تک پہنچاتے ہیں۔ اب جہاز رانی اتنی ترقی کر چکی ہے

کہ ان جہازوں کو شاذ و نادر ہی کوئی حادثہ پیش آتا ہے - لیکن پرانے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ بعض جہاز طوفان کی نظر ہو جاتے تھے اور مع اپنے قیمتی ساز و سامان کے غرق ہوجاتے تھے - تاریخ میں ایسے کتنے ہی جہازوں کا ذکر ملتا ہے اور جدید سائنس کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس نے بعض ایسے جہازوں کو سمندر کی تہ سے برآمد کیا ہے - اس کی زندہ مثال (Egypt) نامی جہاز ہے جو ۲۰ مئی ۱۹۲۲ء کو غرقاب ہوا تھا - اس پر دس لاکھ پونڈ سے زیادہ مالیت کا سونا چاندی لدا ہوا تھا -

یہ حادثہ اس وقت رو نما ہوا جب یہ جہاز ساحلِ فرانس کے قریب رواں دواں تھا - سمندر پر گہرا کہرا چھایا ہوا تھا اور دھند کی یہ کیفیت تھی کہ آس پاس کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ شام کے سات بجے ہوں گے کہ کسی دوسرے جہاز سے یکایک ایک مہیب آواز آئی جس کا منشا یہ تھا کہ اگر کوئی دوسرا جہاز اس طرف سے گزر رہا ہو تو وہ متنبہ ہوجائے - ایجپٹ والوں نے یہ آواز تو سن لی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ جہاز کس سمت سے آ رہا ہے - ایجپٹ نے جواباً ویسی ہی آواز بلند کی ، مگر اس کے جواب میں اجنبی جہاز کا پھر کوئی پیغام نہ آیا - اس کے بجائے مخالف سمت سے وہ جہاز ہی نمودار ہو گیا - دیکھنے والے گھبراہٹ میں چیخنے لگے کیونکہ وہ جہاز اس قدر قریب آ گیا تھا کہ حادثہ ہو جانا یقینی تھا - مشکل سے بیس سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ دونوں میں شدید ٹکر ہوئی اور ایجپٹ کے پہلو میں بہت بڑا شگاف پیدا ہو گیا - پانی تیزی سے اندر داخل ہونے لگا اور جہاز ڈوبنے لگا - حادثے کے اٹھارہ منٹ بعد وہ غرقاب ہو گیا - کچھ مسافروں کو لائف بوٹ کی مدد سے بچا لیا گیا - لیکن سب نہ بچ سکے - پندرہ مسافر ، جہاز کا عملہ جو اکہتر (۷۱) افراد پر مشتمل تھا اور دس لاکھ سے زائد

مالیت کا سونا چاندی سب کا سب جہاز کے ساتھ سمندر کی تہ میں پہنچ گیا۔

جانوں کی قیمت تو کون لگا سکتا ہے لیکن جہاز کی قیمت اور سونے چاندی کی تمام مالیت جہازراں کمپنی کو وصول ہوگئی کیونکہ جہاز بیمہ شدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنی کے لیے یہ نقصان غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ اب وہ اس جہاز اور اس سونے چاندی کی مالک تھی۔ جو سمندر کی تہ میں محفوظ تھا۔ لیکن ایسی ملکیت سے کیا فائدہ؟ کمپنی اس فکر میں رہتی تھی کہ کسی صورت وہ جہاز نہیں تو کم از کم وہ سونا چاندی تو برآمد کر ہی لیا جائے جو مضبوط تجوریوں میں بند، گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا۔ اس علاقے کا تو سب کو علم تھا جہاں یہ عظیم جہاز غرق ہوا تھا لیکن ٹھیک کس جگہ؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک دقت یہ بھی تھی کہ اس تمام علاقے میں سمندر بہت گہرا ہے ساٹھ فیدم (یعنی ۳۶۰ فٹ) سے بھی زیادہ۔ اِتنی گہرائی پر پانی کا دباؤ اس قدر ہوجاتا ہے کہ انسان کا نازک جسم اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ سائنس دانوں نے ایسے لباس ایجاد کیے ہیں جو غوطہ خوروں کو سمندر کی گہرائیوں میں محفوظ رکھتے ہیں لیکن ساٹھ فیدم کی گہرائی میں ایسے لباسوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا ایجپٹ کے خزانے کو سمندر کی تہ سے برآمد کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی حائل تھی۔ کئی سال تک لاکھوں روپیہ کا سونا چاندی یونہیں پڑا رہا لیکن کمپنی کے حصہ دار اسے فراموش نہ کرسکے۔ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جن کو نئے تجربات کرنے میں لطف آتا تھا اور جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس خزانے کا کھوج لگانے کے لیے چاہتے تھے کہ کوئی ایسا لباس ایجاد ہو جائے جسے پہن کر غوطہ خور سمندر کی تہ میں پہنچ جائیں اور ان کے جسم

کو کسی قسم کی تکلیف نہ پنہچے ۔ تبھی یہ ممکن ہے کہ وہ جہاز کی فولادی دیواروں کو کاٹ کر ان تجوریوں کو نکال سکیں ، جن میں سونا چاندی محفوظ تھا ۔ انگلستان ، جرمنی اور اٹلی کے کچھ انجینئروں نے اس طرف توجہ دی ۔ اس دوڑ میں اٹلی والوں کو کامیابی حاصل ہوئی ۔ اس ملک میں ''سوریما'' نام کی ایک کمپنی تھی جس نے متعدد تجربات کے بعد ایک خاص طرز کا لباس ایجاد کیا ۔ لباس کیا وہ دھات کا سلنڈر نما ایک کمرہ تھا ۔ جس کی دیواروں میں چند کھڑکیاں رکھی گئی تھیں جن میں پانی تو داخل نہیں ہوسکتا تھا لیکن خود غوطہ خور ان کی مدد سے باہر جھانک سکتا تھا ۔ غوطہ غور زیادہ گہرائی حاصل کرنے کے لیے اس میں سمندر کا پانی داخل کرسکتا تھا تاکہ وہ بھاری ہو کر نیچے اترتا چلا جائے ۔ اس پانی کو باہر نکال کر فولادی کمرے کو ہلکا کیا جاسکتا تھا کہ وہ اوپر اٹھتا چلا جائے ۔

اس کمرے میں آکسیجن کے سلنڈر محفوظ کئے گئے تھے تاکہ غوطہ خور کو سانس لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئے ۔ ایک ٹیلیفون بھی نصب کیا گیا تھا تاکہ غوطہ خور اس جہاز کے عملے سے گفتگو بھی کرسکے جس سے اسے نیچے اتارا جائے ۔ یہ سلنڈر نما کمرہ اتنا مضبوط بنایا گیا تھا کہ اس کے اندر بیٹھنے والے لوگ ڈیڑھ سو فیدم کی گہرائی تک نیچے اتر سکتے تھے ۔ لہٰذا بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ غرق شدہ جہاز کا خزانہ برآمد کیا جاسکے گا ۔ یہ تیاری کرنے کے بعد سوریما کمپنی نے اس کارِ عظیم کا آغاز کیا ۔ بیمہ کمپنی سے معاہدہ ہوا کہ اگر یہ خزانہ برآمد ہوگیا تو وہ دونوں میں برابر تقسیم کر لیا جائے گا ۔ سب سے پہلا کام تو یہ تھا کہ اس جگہ کا تعین کیا جائے جہاں یہ جہاز غرق ہوا تھا ۔ اس مقصد کے لیے دو بڑے بڑے جہاز مقرر کیے گئے ۔ ان دونوں

کے درمیان ایک موٹا اور لمبا کیبل باندھ دیا گیا جو سمندر کی تہ تک پہنچ گیا۔ دونوں جہازوں نے اس علاقے کو چھاننا شروع کیا جہاں ''ایجپٹ'' غرق ہوا تھا۔ ان کی ترکیب نہایت سادہ تھی انجینئروں کا خیال تھا کہ اس طرح کیبل غرق شدہ جہاز میں پھنس کر رہ جائے گا اور وہ اسے دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۱۹۲۹ء یوں ہی گزر گیا اور یہ کوشش ناکام رہی۔ سمندر کی تہ میں بہت سی چٹانوں کا پتہ تو لگا لیکن "ایجپٹ" کا نشان نہ ملا۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی یہ کام ملتوی کر دیا گیا۔

اگلے سال موسم گرما میں غرق شدہ جہاز کی تلاش پھر شروع کی گئی۔ وہی دونوں جہاز کیبل باندھ کر سمندر پر آگئے۔ ''ایجپٹ'' کا پتا لگانے کے لیے دن رات کام ہوتا رہا حتیٰ کہ ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء کو کیبل کسی بڑی شے میں پھنس گیا۔ یہ شے کیا تھی؟ کیا ''ایجپٹ'' کا پتہ چل گیا تھا؟ تلاش کنندگان کو یقین تھا کہ گوہر مراد مل گیا۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر فولادی چیمبر کی مدد سے غوطہ خور کو نیچے اتارا گیا۔ وہ اترتا چلا گیا۔ سو فٹ۔ دو سو فٹ۔ تین سو فٹ۔ چار سو فٹ کی گہرائی طے کرنے کے بعد بھی سمندر کی تہ نہ ملی لیکن مزید ۲۶ فٹ اترنے کے بعد سلنڈر تہ پر رک گیا۔ جس جہاز سے غوطہ خور نیچے اتارا گیا تھا، اس کا عملہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کے ذریعے "ایجپٹ" کی بازیابی کی اطلاع آتی ہے یا نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں متوقع آواز سنائی دی۔ یہاں ایک جہاز پڑا ہوا ہے یہ بہت بڑا ہے۔ اس کے دو بڑے بڑے قیف نما بھونپو ہیں۔ ''ایجپٹ'' یہی ہے اس غرق شدہ جہاز کو باہر نکالنا تو مقصود نہ تھا اس کا سونا چاندی برآمد کرنا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ بھی مشکل اور طویل کام تھا۔

غوطہ خوروں کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ سمندر کی تہ میں

پہنچ کر "ایجپٹ" کی فولادی دیواروں کو دھماکو اشیاء کی مدد سے کاٹیں اور کمرے تک پہنچیں جس میں تجوریاں محفوظ تھیں۔ پانی کم گہرا ہو تو یہ کام آسان ہوتا ہے لیکن سینکڑوں فٹ کی گہرائی پر حالات بالکل مختلف ہوجاتے ہیں۔ اس کارِ عظیم میں پانچ سال کا طویل عرصہ لگتا تھا۔ کیونکہ صرف موسم گرما میں کام جاری رکھا جاسکتا تھا، سرما میں نہیں۔ انسان اس گہرائی تک ۱۹۳۰ء سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

ستر فیدم کی گہرائی پر سمندر میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں پہنچتی۔ غوطہ خور اسی وقت کام کر سکتے تھے جب روشنی کا معقول انتظام موجود ہو۔ چنانچہ یہ کیا گیا۔ ہر غوطہ خور سلنڈر میں ایک قیدی کی طرح بند تھا۔ وہ اس جہاز کے عملے سے بات چیت ضرور کر سکتا تھا، جس سے اتر کر وہ سمندر کی گہرائی میں پہنچا تھا۔ ان دقتوں کے باوجود ان غوطہ خوروں ہی نے یہ کام کیا۔ اگر وہ نہ ہوتے "ایجپٹ" کا سونا چاندی کبھی برآمد نہ کیا جا سکتا تھا۔ جس جہاز سے غوطہ خور کو نیچے بھیجا گیا تھا اس سے دھماکو چارج بھی نیچے بھیجا جاتا رہتا تھا۔ غوطہ خور اپنے سلنڈر میں بیٹھا ہوا، ٹیلیفون کے ذریعہ اوپر جہاز والوں کو ہدایت کرتا رہتا تھا کہ چارج کو ادھر ادھر ہٹایا جائے یہاں تک کہ وہ صحیح جگہ پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت سلنڈر کو مع غوطہ خور کے باہر نکال لیا جاتا تھا۔ اور اوپر ہی سے چارج کو مشتعل کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد غوطہ خور اس سلنڈر میں بیٹھ کر پھر سمندر کی تہ تک پہنچتا تھا۔ چارج نیچے اتارا جاتا تھا اور اسے وہ اپنی مرضی کے مطابق صحیح جگہ پر رکھواکو باہر نکل آتا تھا اور چارج مشتعل کردیا جاتا تھا۔ یہ عمل یوں ہی جاری رکھا گیا۔ اس کے لیے وقت ہمت اور استقلال سب ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔

بعض اوقات تو ایک چارج کو غرق شدہ جہاز کے مطلوبہ حصے تک پہنچانے میں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا تھا ۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ چارج صحیح جگہ پہنچ رہا ہے اور ہوا یا کسی بڑی لہر نے اس جہاز کو ذرا جنبش دے دی جو سطح سمندر پر کھڑا ہوا سب کام انجام دے رہا ہے ۔ اس جنبش کے ساتھ چارج بھی ہل گیا اور سب محنت اکارت گی ۔

ان تمام رکاوٹوں پر استقلال نے فتح پائی ۔ غرق شدہ جہاز کا ایک ڈیک کاٹا گیا اور ایک شام ایسی آئی جب غوطہ خور اس کمرے پر پہنچ گیا جس میں وہ بیش بہا خزانہ محفوظ تھا ۔ اس نے ایک سوراخ کے ذریعے تجوریوں پر پہلی مرتبہ نظر ڈالی باقی سب کام آسان تھا ۔ صرف یہ کرنا تھا کہ تجوریوں کو وہاں سے نکال کر اوپر لایا جائے ۔ اس مقصد کے لیے خاص قسم کی ٹوکریاں خزانے کے کمرے میں اتاری گئیں اور جون ۱۹۳۲ء میں پہلی تجوری برآمد کی گئی ، اس سال چھ لاکھ چھیالیس ہزار پونڈ کا سونا چاندی نکالا گیا ۔ اگلے سال یعنی ۱۹۳۳ء میں دو لاکھ چودہ ہزار پونڈ کا سونا چاندی برآمد کیا گیا اور ۱۹۳۴ء میں مزید ایک لاکھ نوے ہزار پونڈ کی مالیت کا خزانہ سمندر کی تہ سے نکال لیا گیا ۔ لیکن ابھی کام ختم نہیں ہوا تھا ۔ ۱۹۳۵ء میں تیس ہزار پونڈ کا سونا اور نکالا گیا ۔ اس طرح جولائی ۱۹۳۵ء تک دس لاکھ پونڈ کا سونا چاندی سمندر کی تہ سے حاصل کیا گیا ۔

جو جہاز ۱۹۲۲ء میں غرق ہوا تھا اس کا خزانہ تیرہ سال بعد نکال لیا گیا ۔

یہ کارِ عظیم جدید سائنس کے نمایاں کارناموں میں شمار ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس ناممکن کام کو کتنے ہی آدمیوں کی ہمت ، استقلال ، محنت اور عزم ہی نے ممکن بنایا ۔

سوالات

۱ - غرق شدہ خزانے کی بازیابی کے سلسلے میں جدید سائنس کا معجزہ بیان کیجیے -

۲ - ''ایجپٹ'' نامی جہاز کب غرق ہوا اور اس جہاز پر کتنی مالیت کا سامان لدا ہوا تھا ؟

۳ - جہاز کس وجہ سے غرق ہوا ؟

۴ - ''ایجپٹ'' کے خزانے کو سمندر کی تہ سے برآمد کرنے میں کون سی بڑی رکاوٹ تھی ؟

۵ - غوطہ خوری کا خاص قسم کا لباس کس کمپنی نے ایجاد کیا ؟

۶ - تمام سونا کتنی مدت میں نکالا جاسکا اور اس کی کل مالیت کیا تھی ؟

۷ - مندرجہ ذیل کے جمع تحریر کیجیے :
حادثہ - پیغام - نقصان - ایجاد - ترکیب - ہدایت - وقت - مقصد - عزم -

۸ - مندرجہ ذیل کے متضاد لکھیے -
تکلیف - پانی - محفوظ - مشکل - طویل - روشنی

۹ - مندرجہ ذیل الفاظ پر حرکات لگائیے - :
مہیب - شگاف - دقت - تعین - بھونپو - مشتعل - اکارت -

۱۰ - مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے -
بازیابی - مہیب - شگاف - غرقاب - مشتعل ، اکارت - استقلال -

۱۱ - اس مضمون میں مختلف قسم کے اسم استعمال ہوئے ہیں - ان اسماء کی ایک فہرست تیار کیجیے اور انھیں مختلف قسموں کے اعتبار سے مرتب کیجیے -

———:o:———

ابن انشاء

ابن انشاء ۱۹۲۷ء میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لدھیانہ اور لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے ۱۹۵۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے کیا۔

ملازمت کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان، آئین ساز اسمبلی اور محکمہ ترقی دیہات سے منسلک رہے۔ ۱۹۶۲ء سے مرکزی حکومت کے خود مختار ادارے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے ڈائرکٹر ہیں۔ قیام کراچی میں ہے۔

ابن انشاء اردو کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "چاند نگر" اور متعدد غیر زبانوں کے شعرا کی نظموں کے تراجم مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں۔ "آوارہ گرد کی ڈائری" "اردو کی آخری کتاب" "دنیا گول ہے" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" "چلتے ہو تو چین کو چلیے" ان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کے اسی سفر نامے کا ایک اقتباس ہے۔ یہ سفر نامہ بڑی شگفتہ زبان میں لکھا گیا ہے اور یہی ابن انشاء کی نثر کا امتیازی نشان ہے۔

چین میں چند روز

پچھلے سال کا ذکر ہے ہمارے ایک عزیز دوست ہمارے پاس تشریف لائے۔ مزاج پرسی کے بعد کہنے لگے کہ مجھے وضو کرنا

سکھا دو اور نماز کی سورتیں ہوں تو وہ بھی یاد کرا دو ، وضو کرنا تو ایک کتاب میں دیکھ کر ہم نے انھیں سکھا دیا لیکن سورتوں کے متعلق معذرت کر دی کہ ہمیں بس چار سورتیں نماز کی یاد ہیں۔ وہ آپ کو سکھا دیں تو ہمارے پاس کیا رہے گا۔ لیکن یہ آخری وقت میں مسلمان ہونے کا خیال کیوں آیا ؟

فرمانے لگے میں چین جا رہا ہوں۔ یہاں تو اگر نماز نہ پڑھوں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اسلامی ملک ہے لیکن دوسرے دیس میں جا کر تو باقاعدہ نماز پڑھنی چاہیے ورنہ وہ لوگ جانے کیا خیال کریں اور پھر وہ لوگ تو کمیونسٹ ہیں۔ بالکل ہی خدا کو بھول گئے ہیں۔ مجھے تم اسلام سے ایسا بھی بیگانہ نہ سمجھو۔ ریس کورس بھی جاتا ہوں تو میرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور کسی گھوڑے پر داؤ لگانے سے پہلے ایک بزرگ سے فال ضرور لیتا ہوں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ امریکہ یا برطانیہ کو شاید لوگ دارالسلام سمجھتے ہیں۔ وہاں جاتے ہوئے کوئی اس قسم کا تردد نہیں کرتا لیکن چین یا روس جاتے وقت اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے اسلام کو بھی ڈرائی کلین کرا کے لیے جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ایک آدھ نماز تو پیکنگ یا ماسکو کی جامع مسجد میں پڑھ کر اپنی تصویر کھنچوا لے۔ پھر ان ملکوں میں کوئی مسلمان مل جائے تو پہلا خیال لوگ یہی کرتے ہیں کہ ضرور کوئی جعلیا ہے ان کی حکومت نے ابھی اسے سکھا پڑھا کر اور السلام علیکم کہنا سکھا کر ہمارے لیے تیار کیا ہے۔ ہم سے بھی کنٹین کی مسجد میں کہ وہاں کے مسلمانوں کے محلے میں واقع ہے ، دو صاحبوں سے ملوایا گیا تو ہم نے گمان کیا کہ مولوی صاحب کی ڈاڑھی پر جو پانچ چھ بال ہیں محض ہمارے اعزاز میں لگائے گئے ہیں۔ نام ان دونوں صاحبوں نے ہمیں مسلمانوں کے سے بتائے۔ ایک ابراہیم صاحب تھے ، اگرچہ اس کے

ساتھ چوں چوں چن وغیرہ بھی لگتا تھا ۔ دوسرے صاحب کا نام ہم بھول گئے ۔ ہمارے ساتھیوں نے وہاں قرآن مجید کے نسخے ملاحظہ کرنے کے بعد شک کا فائدہ ملزموں کو دیا ، وہ بھی تب جب کہ ایک صاحب نے مولوی صاحب سے سورۃ فاتحہ سن لی ۔ اس ایک سورۃ کو سن کر انھوں نے مولوی صاحب کو پاس ہونے کے نمبر اس لیے دے دیے کہ خود ان کو صرف یہی سورۃ آتی تھی ۔

اوروں کی بات تو جانے دیجئے ۔ ہم تو سمجھ دار آدمی ہیں ۔ ہم نے ان لوگوں کے آٹو گراف اپنی نوٹ بک میں لیے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ عربی رسم الخط سے واقف ہیں یا نہیں ؟ بیچاروں نے یہ سمجھا کہ ہم ان کی یاد گار رکھنے کے لیے ایسا کر رہے ہیں چپ چاپ دستخط کر دے ۔ ایک نے ان میں سے بتایا کہ وہ عربی بھی بول لیتے ہیں ۔ یہ زبان چونکہ ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا اس لیے ان کی لیاقت کا امتحان کرنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہ کی بلکہ ان کے بیان کو کافی سمجھا ۔ ہاں اس خیال سے کہ یہ لوگ ہمیں عربی سے بالکل نابلد ہی نہ سمجھ لیں ، ہر فقرے کے ساتھ ساتھ (جو ہم انگریزی میں بولتے تھے) "الحمد للّٰہ الحمد للّٰہ" کا التزام ہم ضرور رکھتے تھے۔ ایک آدھ بار ہم نے "ماشاء اللّٰہ" اور جزاک اللّٰہ" کہہ کر بھی اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیا ۔

تفنّن بر طرف یہاں سے جانے والے بہت سے مسلمان چین جاتے ہوے واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پہلے مسلمان ہیں جو چین کی دھرتی پر قدم رکھیں گے وہاں جا کر انھیں تعجّب ہوتا اور شاید افسوس بھی ہوتا ہے کہ ان سے کوئی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ہی کچھ لوگ وہاں جا کر فضیلت کا یہ شرف چھین چکے ہیں ۔ چین کے تانگ خاندان کی تاریخ قدیم میں مرقوم ہے کہ بادشاہ کاوسنگ نے جس کا پایۂ تخت سیان تھا ، ۲۵ اگست ۶۵۱ء کو جو ۳۱ ہجری کے پہلے مہینے

کا دوسرا روز تھا، خلیفۃ المسلمین کے بھیجے ہوئے ایک وفد کو شرف باریابی بخشا۔ عرب ملاح اپنے بیڑے لے کر جنوبی چین کی بندرگاہوں میں زمانۂ قبل اسلام میں بھی آتے جاتے تھے لیکن وہ سلسلہ محض تجارتی تھا۔ تہذیبی تعلقات کی بنا ظہور اسلام کے بعد پڑی اور جیسا کہ بیان کیا گیا پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی میں اموی اور عباسی خلفاء کے عہد میں چین میں جو سفارتیں عرب سے آئیں، ان کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سیان میں جو کھدائی ہوئی تو وہاں سے اموی عہد کے سکے برآمد ہوئے بعد کی داستان طویل ہے جن کو دلچسپی ہو وہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کردہ کتاب "چین و عرب کے تعلقات" میں دیکھ سکتے ہیں جو ایک چینی عالم مولوی بدر الدین چینی نے لکھی تھی یہ صاحب جامعۂ ملیہ دہلی میں زیر تعلیم بھی رہے ہیں۔

چین میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ عالم اسلام سے آنے والوں کا اثر صرف دین مبین کی تبلیغ تک محدود نہیں رہا بلکہ اسلامی دنیا سے وہ سائنس اور طب، ریاضیات اور ہیئت کے علوم کے تحفے بھی لائے۔ چینی کیلنڈر کی تدوین میں بھی ہجری تقویم سے مدد لی گئی۔ چینی سائنس دان جمال الدین جو بارہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے ایک بڑا ہیئت دان تھا۔ چودھویں صدی میں ماشیخ اور دوسرے مترجموں نے عربی سے ترجمے کر کے چین کی سائنس کو ایسے ہی مالا مال کیا جیسے عباسی عہد کے مترجموں نے اپنے ہاں کے علوم کی زمین کو آسمان کیا تھا۔ تیرھویں صدی کے سر برآوردہ چینی مصوروں میں بھی کاؤ کے کنگ نام کے ایک مسلمان تھے اور اسی عہد کے ایک عالم شمس الدین تو بہت مشہور ہیں جنھوں نے فلسفے، تاریخ، ادب، ریاضی، فلکیات، جغرافیے۔ حتیٰ کہ انجینئرنگ پر بیسیوں تصانیف چھوڑی ہیں۔ چینِ خاص کے مسلمان

گورنروں اور جرنیلوں کے تذکرے کا یہاں موقع نہیں جنھوں نے ہر عہد میں بڑے معرکے مارے ، نہ دینی علوم کی درسگاہوں کا تفصیلی احوال ہم لکھ سکتے ہیں ۔

چین کی ایک کتاب "مسلمانان چین کی اصلیت" میں جو سولھویں صدی کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ اسلام چین میں ۶۲۸ء میں پہنچا ۔ وہ یوں کہ بادشاہ چینگ کوان نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب الشکل جانور اس پر حملہ کر رہا ہے اور ایک سفید عمامے والا شیخ آ کر اسے بچاتا ہے ۔ صبح کو بادشاہ نے وزیر سے اس کی تعبیر پوچھی تو ایک بڑے عالم نے بتایا کہ "سفید عمامے والا شیخ وہ عرب قوم ہے جو غرب میں رہتی ہے ۔ ان کی بڑی شوکت اور قوت ہے معلوم ہوتا ہے کوئی مخالف عنصر بغاوت کرنے والا ہے جس کا مقابلہ عرب کی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ یہ سن کر بادشاہ نے ایک سفیر بلاد عرب کو بھیجا اور عرب فوج کی کمک مانگی تین ہزار عرب سپاہی اس دعوت کے جواب میں آئے جو چینی مسلمانوں کے آباء و اجداد ہوے اس وفد کی قیادت تین معرکہ آرا کر رہے تھے ایک کا نام قیس تھا ۔ دوسرے کا اویس تھا اور تیسرے کا وقاص ۔ پہلے دونوں ہوا کی تاثیر سے راستے میں انتقال کر گئے ۔ مگر وقاص کو اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا ۔ وہ بادشاہ کے بڑے مکرم مہمان ہوئے ۔

کچھ اور کتابوں میں بھی روایتیں آئی ہیں ۔ کچھ قوی کچھ ضعیف ۔ بہرحال کینٹن کے نواح میں جو مقبرہ حضرت وقاص کا ہے اس کے متعلق بیان اور روایت یہی ہے کہ رسول اللہ کے صحابی تھے جن کو اس میں شک ہے وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ وہ عالم عرب کی کوئی ممتاز شخصیت تھے جو پہلی صدی ہجری میں وارد چین ہوے ۔

پیکنگ کی شاندار مساجد کا جلال و جمال دیکھنے والے کو مبہوت و متحیّر کرتا ہے ۔ ہانگ چو میں بھی مسلمانوں کی بڑی

تعداد ہے۔ یاد رہے اس وقت ہم خالص چینی الاصل علاقوں اور آبادیوں کی بات کر رہے ہیں ورنہ سنکیانگ کے ایغور ترک اور تاجکستانی اور قزاق تو ہیں ہی مسلمان، جو وسط ایشیا کا حصہ ہیں اور قوقندوختن سے ہم تہذیبی اور تاریخی طور پر آشنا ہیں۔ کینٹن کی جس مسجد میں ابراہیم صاحب اور دوسرے بزرگ ہمیں ملے پرانے زمانے کی ہے اور اس کے احاطے میں ایک مینار ہے جسے ہم نے مازنہ خیال کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ لائٹ ہاؤس کا کام دیتا رہا ہے۔ ہماری منزل حضرت ابن وقاص کا روضہ تھی۔ یہ شہر سے چار پانچ میل دور ہے۔ راستے میں مسلمانوں کا پرانا قبرستان آیا۔ بڑی ہری بھری جگہ ہے اور ان قبروں کے درمیان گزرتے ہوئے دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ اس روضۂ مطہر کا اثر دل پر گہرا اور پائیدار ثابت ہوا۔ بزرگ دفن تو یہاں ہیں لیکن ان کے قدم ہانگ‌چو اور مشرق چین کے دوسرے شہروں میں بھی پہنچے اور یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کا پودا چین کی سرزمین میں انھیں بزرگ نے کاشت کیا روضے کے اندر بھی ایک مسجد ہے۔ ایک دروازے کے روضے کی گنبدی عمارت میں داخل ہوکر ہم سب نے فاتحہ پڑھی اور دل کو گداز کیا۔

سوچو میں کہ شنگھائی سے ڈیڑھ سو میل شمال میں ایک شہر باغات ہے اور پر فضا ہونے میں ہمارے نزدیک ہانگ چوکی دلکشائی کو بھی مات کرتا ہے۔ ایک شام ہم یونھیں بازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک بڑا ہجوم ہمارے گرد جمع ہوگیا۔ کنٹین یا شنگھائی یا پیکنگ میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا لیکن سوچو چھوٹا قصبہ ہے ان کا استعجاب قدرتی تھا۔ خیر سگالی کے سلاموں اور نعروں کے بعد ہم نے ان لوگوں کو رخصت کرنا چاہا لیکن (Pied piper) کی کہانی کی طرح نہ ساری جمعیت ہمارے پیچھے ہو لی۔ ان سے پیچھا چھڑانے

کے لیے ہم ایک احاطے میں داخل ہوگئے جو لاوزے کا معبد تھا اور اس میں کوئی بیس گز اونچی مورتی اس کی رکھی تھی وہاں سے نکلے تو معلوم ہوا کہ ہجوم چھٹا نہیں اور بڑھ گیا ہے۔ اب ہم نے ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی بھول بھلیوں میں جانے میں عافیت دیکھی۔ یہاں کچھ امان ملی۔ یکایک کسی صاحب نے اشارہ کیا۔ ادھر دیکھ ہم نے نظر دوڑائی تو بورڈ نظر آیا ''اسلامیہ ہوٹل''۔

اسلامیہ ہوٹل والوں نے ہماری تواضع کرنے کی تو بہت کوشش کی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی مسلمان ہیں۔ یعنی کریلے اور نیم چڑھے۔ لیکن اس کا موقع نہ تھا اور پھر یہ ہوٹل بہت صاف بھی نہ تھا۔ جیسا کہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے اور ہمارے ہاں ہوتا ہے، ویسا ہی تھا۔ ہماری براہ راست گفتگو تو السّلام علیکم اور الحمد للہ تک محدود رہی لیکن ترجمان کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ ساری آبادی مسلمانوں کی ہے یعنی اس حصۂ شہر میں بارہ مسجدیں ہیں اور اٹھائیس سو گھر مسلمانوں کے ہیں۔ ہم پاکستانی حلال و حرام کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ حتٰی کہ لندن میں بھی بڑے بڑے بورڈ لگے ہوتے ہیں: ''یہاں حلال گوشت ملتا ہے'' دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس ہوٹل میں بھی ذبیحہ ہوتا ہے۔ کتے بلیوں کا گوشت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چینی کھاتے ہیں (اس میں بھی بہت مبالغہ ہے) اسلامی ہوٹلوں میں نہیں ہوتا۔ ان پر مشرق وسطی کا ایک اسلامی ملک یاد آیا جس کے ایک سولہ آنے اسلامی ریستوران میں ہم جا کر بیٹھتے تو بیرے نے کہا صاحب کیا کھائیے گا۔ بکرے کا گوشت بھی ہے، گائے کا بھی ہے اور سؤر کا گوشت تو بہت ہی عمدہ ہے۔

سوالات

۱۔ حضرت ابن وقاص کا روضہ کہاں واقع ہے؟

٢ ۔ حضرت ابن وقاص کون تھے اور کس سلسلے میں چین گئے تھے ؟
٣ ۔ اسلامیہ ہوٹل کے بارے میں مصنف نے کیا تحریر کیا ہے ؟
٤ ۔ پیکنگ کی شاندار مساجد کے بارے میں مصنف کے کیا احساسات ہیں ؟
٥ ۔ مندرجہ ذیل ترکیبوں کو جملوں میں استعمال کیجیے ۔
چپ چاپ ۔ شوکت اور قوت ۔ مخالف عنصر ۔ معرکہ آرا ۔ دلکشائی ۔
٦ ۔ مندرجہ ذیل پر حرکات لگائیے ۔
تردد ۔ ملاحظہ ۔ نابلد ۔ بلاد ۔ مضائقہ ۔ فاتحہ ۔ مترجم ۔
٧ ۔ مندرجہ ذیل کے معانی تحریر کیجیے ۔
دارالسلام ۔ بیگانہ ۔ معذرت ۔ التزام ۔ تفنّن ۔ سفیر ۔ مکرم ۔ متحیر ۔
٨ ۔ ''مبہوت و متحیّر'' میں 'و' حرف عطف ہے اس سبق سے ایسی ہی چند اور تراکیب تلاش کیجیے ۔

——: ٥ :——

عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرکے اٹاوہ کے ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے اور پھر ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیے اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا۔

عظیم بیگ چغتائی اردو کے مشہور مزاح نگار تھے۔ ان کے طرز بیان میں بڑی سادگی اور روانی ہے۔ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں کے لیے عموماً ایسے واقعات انتخاب کرتے ہیں جو شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو ہنساتے چلے جاتے ہیں وہ الفاظ کے بجائے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور واقعات کو ایسی سادگی اور معصومیت سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

میں نے پڑھا ہے

میں نے پڑھا ہے کتب خانے کی پُرسکون فضا میں جو مختصر لمحے گزرتے ہیں، میرے لیے وہ نپولین اور سکندرِ اعظم کی تمنائے زندگی کی صدیوں سے زیادہ بیش بہا اور قابلِ قدر ہیں۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے اور ارد گرد مجلد اور منقش خزانہ انبار در انبار چنا ہوتا ہے۔ اس پر کتب خانے کا سکوتِ نیم شبی سناٹے کو مات کرتا ہے اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ الہ دین کے غار میں ہوں اور ہر چہار طرف زر و جواہر کے انبار ہیں۔ سب میرے اور ذاتی

تصرف کے لیے - میں ایک دلچسپ کتاب ہاتھ میں لیے دنیا و مافیہا کے تفکرات سب سے بے نیاز ہو کر گویا جنت الفردوس میں تھا بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ زندگی ایک دلچسپ شیریں خواب ہے کہ اتنے میں کسی صاحب نے دھماکے کے ساتھ اپنا منحوس قدم دروازے میں رکھ کر کہا "کوئی ہے ؟" میرے سر پر برچھی سی لگی - میں نے ایک دم سر پکڑ لیا اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی - "کوئی اخبار وخبار نہیں ہے - - - - ہم - - - - ن - - - -" اتنا کہا اور لپک کر انھوں نے اپنی انگریزی ٹوپی پٹک دی - اور پھر عجیب کھڑ بڑ شروع ہو گئی - لمبی چوڑی میز پر نظر دوڑا کر ایک دم سے اخباروں کو اکٹھا اٹھا کر پٹکنا اور پھینکنا شروع کردیا - اس قدر تیزی سے ورق الٹنے شروع کیے کہ ایک شورِ بے ہنگام بپا ہوگیا - کوئی دس منٹ تک ان کی یہ اخبار بینی جاری رہی - اتنے میں لائبریرین صاحب آگئے تو یہ بولے - "کوئی نیا اخبار نہیں آیا ؟" "سب تازہ اخبار آپ کے سامنے چنے ہوئے ہیں -" لائبریرین نے کہا - "فہرست بھی آج کی سامنے آویزاں ہے کہ کون کون سے اخبار موجود ہیں - آپ نے دیکھی نہیں ؟"

"اچھا" - انھوں نے کہا اور فہرست جو دیوار پر آویزاں تھی اس کو کھڑے ہو کر غور سے پڑھنے لگے -

اچھا تو یہ سب اخبار موجود ہیں - یہ کہتے ہوئے میز پر بڑھے اور اب تصدیق کی - "کیا واہیات ہے ؟" لائبریرین صاحب سے مخاطب ہوکر بولے "لائبریری کی یہ بدتمیزی نہ گئی کہ تمام اخبار پھینٹ کر رکھ دے جاتے ہیں - یہ دیکھیے دوئی احمق 'لیڈر' کے صفحے 'پاؤنیر' میں ملا گیا ہے - یہ دیکھیے ! پھر پرانے اخبارات کی موجودگی میز پر کچھ سمجھ میں نہیں آتی - خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کے لیے -" لائبریرین نے مؤدبانہ

عرض کی ۔ ”جناب صرف ایک روز قبل کے پرانے اخبار لازمی رکھے جاتے ہیں ۔ وہ دوسری لائن میں ہوتے ہیں ۔ مگر صاحب میں کیا کروں ؟ کوئی بدتمیز آیا اور تمام میز کرید کر ڈال گیا ۔ ابھی ابھی تو میں قرینے سے جما کر گیا ہوں ۔ شاید ان حضرت کو اب پتہ چلا کہ وہ بدتمیز شخص جو اس بدعت کا ذمہ دار تھا ان کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا ۔ اخباروں پر سرسری نظر ڈال کر دو ایک کو جو خود انھوں نے تتر بتر کر دیے تھے ، قرینے سے جما کر بولے ۔ کوئی عمدہ کتاب نکلوا کر دیجیے ۔ گویا اخبار بینی کرچکے ۔

”بہت بہتر ! فرمائیے کون سی ؟“

”کوئی اردو کی ہو ۔ نہیں خیر انگریزی کی سہی ۔“

لائبریرین نے کتابوں کی فہرست سامنے کردی اور یہ حضرت کتاب پسند کرنے میں مشغول ہوگئے ۔

(۲)

میرے پراگندہ دماغ کو قدرے سکون ملا ۔ جب یہ حضرت لائبریرین سے کتاب لینے دوسرے کمرے میں چلے تو گئے ۔ میں نے کتاب دوبارہ اٹھائی ۔ عبارت تلاش کی ۔ دماغ میں سلسلۂ مضمون کو دوبارہ قائم کیا اور خیالات کو ایک مرکز پر لاکر میں پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگیا ۔ وہ حضرت آئے ۔ اور مجھ سے کوئی پانچ چھ قدم پر ایک صوفے پر تکیہ لگا کر میری طرف پشت کرکے بیٹھ گئے ۔ اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر پڑھنے میں مشغول ہوگئے ۔ مگر حضرت نہایت ہی خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے ۔ کوئی بیس منٹ تک تو کتاب پڑھتے رہے پھر زور سے کھنکار کر میری طرف دیکھا ۔ نظریں چار ہوتے ہی عجیب حیرت و استعجاب سے بولے ”کمال کردیا ہے ۔“ میں نے ان کی بات سے

کوئی دلچسپی نہ لی۔ اور کچھ نہ بولا تو بولے۔ "تاج محل۔۔۔۔ عجیب و غریب عمارت ہے۔ استاد عیسیٰ نے بنایا ہے۔ واللہ اب تک میں یہی جانتا تھا۔ کہ نقشہ اس کا ایک اٹلی کے رہنے والے نے بنایا ہے۔" "جی ہاں۔" میں نے کہا اور گفتگو ختم کرنے کی نیت سے فوراً ہی اپنی کتاب پر پھر نظر جما لی۔ کیونکہ میں کتاب کے نہایت دلچسپ مقام پر پہنچ گیا تھا اور کسی کا مخل ہونا مجھے ذرا بھی گوارا نہ تھا۔ مگر پانچ منٹ بعد وہ اچک کر بولے "یہ دیکھیے خود دوسرے منصف مزاج مؤرخوں کے اقوال سے مصنف ثابت کرتا اور۔۔۔۔۔"

"جی ہاں"۔ میں نے کہا۔ "میں نے پڑھا ہے۔ پوری کتاب میں نے پڑھی ہے"۔ وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا اور میں بھی مشغول ہو گیا۔ مگر دس منٹ بعد وہ پھر پڑھتے پڑھتے اچھل پڑے۔ "کیا کہنا ہے! مصنف کی قابلیت کا، چودہ مستند حوالے۔ ذرا غور تو فرمائیے"۔ "میں نے پڑھا ہے۔" میں نے تنگ آ کر کہا۔

"مگر یہ سب۔۔۔۔"

"میں نے پڑھا ہے۔ میں نے کل یہ کتاب پڑھی ہے۔ یہ کہہ کر میں اندازِ بے نیازی کے ساتھ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا"۔ مگر دس منٹ مشکل سے گزرے ہوں گے کہ انھوں نے بے تاب ہو کر مجھ سے کہا۔ "یعنی یہ بھی دیکھیئے کہ۔۔۔۔۔"

"میں نے پڑھا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا۔۔۔۔"

"تو پھر آپ نے دیکھا ہو گا۔"

"ارے صاحب میں نے پڑھا ہے۔ اب کے میں نے زور دے کر کہا۔ "سب پڑھا ہے۔"

میں آپ کو عبارت ہی سنائے دیتا ہوں۔۔۔۔۔"

"میں نے پڑھا ہے" ۔ موت کی سی تکلیف اٹھاتے ہوئے میں نے کہا مگر وہ میری کب سنتے تھے مست ہو کر ہوا میں انگلی بار بار اٹھا کر بہ آوازِ بلند کتاب پڑھ کر مجھے سنانے لگے ------ "تمام دنیا کے مؤرخین اس بات پر متفق" ------ کسی نے سچ کہا ہے تنگ آمد بجنگ آمد ۔ ان حضرت کی ضد ، بدتمیزی اور جارحانہ کارروائی نے میرے لیے موت اور زیست کا سوال پیدا کر دیا۔ میں کمزور آدمی ، پاگل ہو گیا ۔ وہ میری طرف پشت کیے بیٹھے تھے ۔ میں نے اپنی کرسی کا بڑا گدا گھسیٹ کر پوری قوت سے آ ------ ہم ، کر کے بے خبری میں ان کے سر پر نہایت زور سے گھما کر مارا اور کرسی پھاند کر بدحواسی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا ۔

(۳)

چشم زدن میں لائبریری کے احاطہ کی دیوار پھاند کر کھیتوں کھیت ڈاک گاڑی کی رفتار سے اڑا جا رہا تھا ۔ نہ دیکھوں خندق نہ کھائی ۔ سامنے سے ایک باڑ نظر آئی چاہا کہ کترا کر نکل جاؤں ۔ مگر حضرت کہاں ؟ للہذا اس اِدھر کے جھانکڑوں کو باڑھ پر سے اُڑنے کی کوشش جو کی تو اُلجھ کر گر پڑا ۔ بوکھلا کر اٹھا ۔ مڑ کے لائبریری کے برآمدے کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کھڑے رہے ہیں ۔ بے اختیاری کے عالم میں ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی زور زور سے پکار کر میں نے وہیں سے ہاتھ اٹھا کر کہا ۔ "میں نے پڑھا ہے" ۔

سوالات

۱ ۔ جب نووارد نے مصنف کے کام میں دخل دیا تو اسے کیوں برا لگا ؟

۲ - جب نووارد نے بلند آواز سے کتاب پڑھنی شروع کی تو مصنف کا کیا حال ہوا ؟

۳ - مصنف لائبریری سے بھاگ کر کدھر چلے گئے -

۴ - 'نیم شبی' میں 'نیم' سابقہ ہے ایسے ہی چند الفاظ بنائیے جن میں یہی سابقہ استعمال کیا گیا ہو -

۵ - استعجاب سے کیا مراد ہے ؟ اس سبق میں ایسے حروف تلاش کیجیے جنھیں استعجاب کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے -

٦ - 'پراگندہ دماغ میں پراگندہ کا کلمہ دماغ کی صفت بیان کرتا ہے - اسے اسم صفت کہتے ہیں اور دوسرے کلمے 'دماغ' کو موصوف اس قسم کے مجموعے کو مرکب توصیفی کہا جاتا ہے - آپ اسی نمونے کے دس مرکبات تحریر کریں اور صفت و موصوف کی نشان دہی کریں -

———:o:———

خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۵ء)

خواجہ حسن نظامی دلی میں پیدا ہوئے ۔ درویشی اور قناعت ورثے میں پائی تھی ۔ ابتدائی زندگی بڑی تنگ دستی میں گزری ۔ خواجہ صاحب کو بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا ۔ وہ متعدد اخباروں میں لکھتے رہے اور خود بھی کئی اخبار اور رسالے نکالے ۔ مضامین کے علاوہ خواجہ صاحب نے ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ۔

خواجہ صاحب کو مذہب سے والہانہ عشق تھا اور انھوں نے ساری زندگی مذہبی اور ادبی کاموں میں بسر کی وہ ایک صاحب دل صوفی تھے ہندوستان اور پاکستان میں ان کے بے شمار مرید اور عقیدت مند موجود ہیں ۔

خواجہ حسن نظامی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی طبیعت میں بڑی جدت تھی ۔ انھیں معمولی واقعات سے بڑے بڑے اخلاقی نتائج نکالنے میں کمال حاصل تھا خواجہ صاحب کی زبان میں سادگی اور روانی ہے وہ عام طور پر بول چال کی زبان لکھتے ہیں اور معمولی معمولی الفاظ سے بڑے بڑے مطالب ادا کرنے میں جیسا کمال انھیں حاصل ہے وہ اردو کے بہت کم ادیبوں کو حاصل ہے ۔ انھوں نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق ان کے افسانوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی ۔ ان افسانوں سے جہاں مغل

شہزادوں کی بے کسی اور بے چارگی پر روشنی پڑتی ہے وہاں انگریزوں کے ظلم و ستم اور اس دور کی عام ابتلا کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ "یتیم شہزادہ" اس زمانے کا ایک عبرت ناک قصہ ہے۔

یتیم شہزادہ

ماہ عالم، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں تھا۔ غدر میں اس کی عمر گیارہ برس کی تھی شہزادہ ماہ عالم کے باپ، مرزا نوروز حیدر، بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں۔ اسی بیماری میں اس روز جب کہ بہادر شاہ قلعے سے نکلے اور شہر کی رعایا پریشان ہو کر بھاگنے لگی، ماہ عالم کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ایسے موقع پر سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس موت نے عجیب ہراس پیدا کر دیا۔ اس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا، نہ دفن کا۔ نہ غسل دینے والی عورت میسر آسکتی تھی نہ کوئی مردے کے پاس بیٹھنے والا۔ غدر کی عالمگیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز و تکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں۔ لیکن وہ مردے کو نہلانا نہ جانتی تھیں،

القصہ ان لوگوں کو اسی پریشانی میں کئی گھنٹے گذر گئے۔ اتنے میں سنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے۔ اس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ جلدی سے لاش کو نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اوپر سے ڈال دیے۔ کفن کہاں سے ملتا۔ شہر تو بند تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی دو اجلی چادریں تھیں، ان میں لاش کو لپیٹ دیا۔ اب فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں اسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے اور آتے ہی مرزا اور ان کے

لڑکے ماہ عالم کو گرفتار کر لیا گھر کا سامان لوٹا ۔ صندوق توڑ ڈالے ۔ الماریوں کے کواڑ اکھیڑ دیے ۔ کتابوں کو آگ لگا دی ۔ اگرچہ فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا ۔ مگر انہوں نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور برابر لوٹ مار کرتے رہے ۔ آخر قیمتی سامان کی گٹھڑیاں لونڈیوں اور خود مرزا نوروز حیدر اور ان کے ماہ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لے چلے ۔ اس وقت مرزا نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کی بے گور و کفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر ظلمی سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا ۔ لونڈیوں کو تو بوجھ اٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی ۔ مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے ۔ مگر غریب ماہ عالم کی بری حالت تھی ۔ اول تو اس کے سر پر بوجھ اس کی بساط اور عمر سے زیادہ تھا دوسرے شہزادہ نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا ۔ اس پر ماں کے مرنے کا غم خالی ہاتھ چلنے سے بھی چکر آتے تھے ۔ کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ ، پیچھے چمکتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی قہرناک تاکید ۔ بیچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے ، بدن پسینے پسینے ہو گیا تھا آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا ”ابا حضرت ! مجھ سے تو چلا نہیں جاتا ۔ گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے ، ایسا نہ ہو گر پڑوں باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بچے کی یہ مصیبت بھری باتیں نہ سنی گئیں اور اس نے مڑ کر سپاہی سے کہا ”صاحب ! اس بچے کا اسباب بھی مجھے دے دو یہ بیمار ہے ۔“ گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا ۔ اس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی سمجھ کر دو تین مکے کمر میں مارے اور آگے دھکا دے دیا ۔ مظلوم مرزا نے مار کھا کر بھی بچے کا بوجھ بغل میں لے لیا ۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اس نے جبراً مرزا سے گٹھڑی

لے کر ماہ عالم کے سر پر رکھ دی اور ایک گھونسا اس بے کس و ناتواں کے بھی مارا ۔ گھونسا کھا کر ماہ عالم آہ کہہ کر گرا اور بے ہوش ہو گیا ۔ مرزا نوروز اپنے لخت جگر کی حالت دیکھ کر جوش میں آ گئے اور اسباب پھینک کر ایک مکہ گورے کے کلے پر رسید کیا اور پھر فوراً ہی دوسرا گھونسا اس کی ناک پر مارا تو ناک کا بانسا پھٹ گیا ۔ خون کا پھوارہ چلنے لگا ۔ سکھ سپاہی دوسری طرف چلے گئے تھے ۔ اس وقت فقط دو گورے ان کے ساتھ تھے ۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری مگر خدا کی قدرت وار اوچھا پڑا ۔ تیموری شہزادے نے اس موقع کو غنیمت جانا اور لپک کر ایک مکہ اس گورے کی ناک پر بھی مارا ۔ یہ مکہ بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی ۔ گورے یہ حالت دیکھ کر پستول کرچ تو بھول گئے اور یک بارگی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک کر رستے کی خاک مٹھیوں میں بھر کر گوروں کی آنکھ میں جھونک دی ۔ اس ناگہانی آفت سے تھوڑی دیر کے لیے بیکار ہو گئے اور ان کی کرچ مرزا کے ہاتھ میں آ گئی ۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ ایک بھر پور ہاتھ مارا کہ کرچ نے شانے سے سینے تک کاٹ ڈالا ۔ اس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اسے بھی ذبح کر ڈالا ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہ عالم کی طرف متوجہ ہوئے وہ بالکل بے ہوش تھا ۔ باپ کی گود میں لیٹتے ہی آنکھیں کھول دیں ۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور سکھ سپاہی آ گئے ۔ انھوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے سے جدا کر کے حال پوچھا ۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہہ دیا ۔ سنتے ہی گوروں کی حالت غصے سے غیر ہو گئی ۔ انھوں

نے پستول کے چھے فائر یک دم کر دیے جس سے مرزا آناً فاناً تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت کیمپ میں لے گئے۔

اس کے بعد لونڈیاں دو پنجابی افسروں کو دے دی گئیں اور ماہ عالم ایک انگریز افسر کی خدمت پر مامور ہوئے۔ جب تک یہ انگریز دہلی میں رہا ماہ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی مگر چند روز کے بعد یہ صاحب رخصت لے کر ولایت چلے گئے۔ اور ماہ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالے کر گئے۔ جو میرٹھ چھاؤنی میں تھا۔ اس افسر کا مزاج سخت تھا۔ بات بات پر ٹھوکریں مارتا تھا۔ ماہ عالم اس مار دھاڑ کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن پچھلی رات کو گھر سے نکلے پہرے دار نے ٹوکا تو کہہ دیا فلاں صاحب کا نوکر ہوں اور ان کے کام کو فلاں گاؤں جاتا ہوں۔ اس حیلے سے جان بچائی اور جنگل کا راستہ لیا۔

سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے۔

۱ - ماہ عالم کون تھا؟
۲ - ماہ عالم کی والدہ کا انتقال کب اور کیسے ہوا؟
۳ - ماہ عالم کی والدہ کی تجہیز و تکفین کیسے ہوئی؟
۴ - انگریز سپاہیوں نے مرزا نوروز حیدر، اس کے بیٹے اور گھر کے ساز و سامان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
۵ - لونڈیوں نے مرزا نوروز حیدر کی کس طرح مدد کی؟
۶ - ماہ عالم کے ساتھ باپ کے مرنے کے بعد کیا سلوک ہوا؟
۷ - مندرجہ ذیل کے معنی لکھیے۔
بساط - قہرناک - لختِ جگر - اوچھا - کوچ
۸ - عالم گیر میں گیر لاحقہ ہے اس طرح کے پانچ مرکبات اور بنائیے۔
۹ - اعراب لگائیے - اکھیڑ، کرچ، بساط، جبراً، گھونسا۔
۱۰ - اس سبق میں سے دس اسمائے صفت نکالیے اور ان کے متضاد صفات تحریر کیجیے۔

مولوی عبدالحق

(۱۸۷۰ - ۱۹۶۱ء)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ھاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم فیروز پور اور پھر علی گڑھ میں پائی۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور یہیں انھیں سرسید، حالی اور محسن الملک جیسی عظیم شخصیتوں سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۵ء تک حیدر آباد دکن میں مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پرمامور رہے۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی آ گئے یہاں انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی اور پہلے اس کے سیکریٹری اور بعد میں صدر رہے۔

ان کا شمار ہمارے زمانے کے بلند پایہ نثرنگاروں میں ہوتا ہے۔ نثر میں انھوں نے سرسید اور حالی کی پیروی کی ہے۔ سادگی اور سلاست ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی

اگر کوئی نا واقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پر، جو اکثر اوقات ترکی ہوتی تھی، آدہ آدہ انگل چیکٹ جما ہوتا تھا۔ ڈاڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اجلا۔ جوتے نے کبھی برش کی صورت نہ دیکھی تھی۔ آواز جھینگر سے ملتی جلتی۔ مگر اس

بے ڈول قالب میں بے پایاں روحانی قوت ، اخلاق جرأت اور خلوص و صداقت تھی ۔ آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہوگا ۔ اس کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں ، ایذائیں ، عقوبتیں جھیلیں لیکن ان کے قدم میں کبھی لغزش نہ آئی ۔ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک ، جس طرح انھوں نے کانگریس میں کامل آزادی کی آواز اٹھائی اسی طرح مسلم لیگ میں بھی نعرۂ حق بلند کیا ۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے ۔ بلکہ دوسروں پر چھا جاتے تھے ۔ بھارت کی دستور ساز مجلس اور پارلیمنٹ میں بھی ان کی آزادی اور جرأت کا یہی رنگ تھا ۔ بعض وقت ان کی للکار سے سردار پٹیل اور ان کے ساتھی گھبرا اٹھتے تھے ۔ کبھی کبھی وہ اپنے خیالات میں الجھ جاتے اور متضاد باتیں کہہ جاتے لیکن جلد راستے پر آ جاتے تھے ۔ تصنع اور تکلف ان کو چھو کر نہیں گیا تھا ۔ ان کی زندگی انتہا درجے کی سادہ تھی بالکل درویش صفت تھے ۔ بعض اوقات وہ ہاتھ میں تھیلا لٹکائے اور بغل میں پوٹلی دبائے پیدل سٹیشن کو جاتے نظر آتے تھے ۔ وہ چھوٹے بڑے ، امیر ، غریب سب سے بے تکلف ملتے اور بے تکلف باتیں کرتے ۔ ان کے ہاں کوئی راز نہ تھا ۔ سب کچھ کہتے چلے جاتے تھے ۔ نہایت منکسر المزاج ، حلیم الطبع اور ہمدرد تھے ۔ کوئی ان کے پاس اپنی مصیبت یا بے انصافی کا دکھڑا لے کر جاتا تو اس کے لیے دوڑے پھرتے اور لڑتے جھگڑتے تھے ۔ رائے کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کوئی فرق نہ آتا ۔ ان معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ ۔ لیکن ان کا دل صاف رہتا تھا ۔ وہ ان لوگوں سے بھی جو سیاسی امور میں ان سے اختلاف رکھتے تھے لطف اور اخلاق سے پیش آتے تھے ۔ ان میں بعض ان کے دوست بھی تھے ۔ باوجود اس کے دوستی کا احترام کرتے تھے ۔

سالہا سال تک "اردوے معلیٰ" ان کی ادارت میں نکلتا رہا ۔

اس رسالے نے ادبی ذوق کو پھیلانے میں بڑا کام کیا - اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضامین نکلتے رہے - اس کے علاوہ اس میں ایک بات یہ بڑی اچھی تھی کہ بعض ایسے شعراء کے کلام کا انتخاب بھی چھپتا رہتا تھا جن کا کلام کبھی طبع نہیں ہوا تھا یا کبھی طبع ہوا تھا تو اب نایاب تھا - ہمارے ادیبوں میں بعض ایسے بھی تھے جیسے ابوالکلام آزاد یا مولانا ظفر علی خاں جو ادب سے ہٹ کر سیاست کے میدان میں کود پڑے - ان کے اس عمل سے سیاست کو تو کچھ فائدہ پہنچا نہیں - البتہ ادب کو نقصان پہنچ گیا - مولانا حسرت ایسے ادیب تھے جنھوں نے باوجود اول سے آخر تک سیاست میں شور بور ہونے کے ادب کے دامن کو نہ چھوڑا اور جس طرح انھوں نے سیاست میں ہنگامہ برپا کر کے آزادی ، حق گوئی اور جرأت کی بے نظیر مثال پیش کی ، اس طرح انھوں نے افکار و خیالات سے شعر کا درجہ بلند کر دیا - وہ سوائے شعر کے ہر چیز میں خواہ وہ زندگی کی سادگی ہو یا سیاست انتہا پسند تھے - شعر میں انھوں نے اعتدال ، متانت اور حسن ذوق کا معیار قائم رکھا - اردو شاعری پر ان کا بڑا احسان ہے اور اسی سے ہماری شاعری میں ان کا خاص مقام ہے - ان کی وفات ہر اعتبار سے صدمۂ عظیم ہے - لیکن ایک بات کا مجھے زیادہ افسوس ہے - ان کے کتب خانے میں اردو کا بیش بہا ذخیرہ ہے - بہت سے مخطوطات ، پرانے تذکرے ، قدیم اساتذہ کا کلام ، پرانے اخبار اور رسالے اور بہت سی ایسی مطبوعات ہیں جو اب نایاب ہیں اور جو انھوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے جمع کی تھیں - میں نے بارہا اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس ذخیرے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیجئے کہ تلف ہونے سے بچ جائے - میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اگر ان ذخیروں کو انجمن ترقی اردو کو عنایت فرما دیں تو ہم انجمن کے کتب خانے میں ایک خاص حصہ آپ کی یادگار میں وقف کر دیں گے - انجمن اس

کی قیمت دینے کو تیار ہے ۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے رہے مگر کبھی ایفائے وعدہ کی نوبت نہ آئی ۔ گذشتہ سال میں نے ایک صاحب کو کان پور میں اس کام کے لیے خاص طور پر متعین کیا ۔ کامیابی نہ ہوئی ۔ پچھلی مرتبہ جب وہ کراچی میں تشریف لائے ، میں نے پھر یہی عرض کیا کہنے لگے "پچھلی برسات میں کچھ کتابیں خراب ہو گئی تھیں درست کرا رہا ہوں ۔ اس کے بعد بھیج دوں گا ۔" اب ان کے انتقال کے بعد نہ معلوم اس کا کیا حشر ہو گا ۔ ہماری بے شمار عزیز چیزیں خاص کتب خانے تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں ۔ ان کو تلف ہونے سے بچانا ہمارا بہت بڑا فرض ہے ۔ یہ کام سرمایہ دار ادارے یا حکومتیں ہی کر سکتی ہیں ۔ لیکن انھیں کیونکر سمجھایا جائے ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ میں یہ بھی کر چکا ہوں لیکن قصرِ حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ ان میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے ۔ مجھے کامیابی نہ ہوئی ۔ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں ۔

سوالات

۱ ۔ مولانا حسرت موہانی کا حلیہ بیان کیجیے ۔
۲ ۔ وہ صداقت کے اظہار میں کیسے واقع ہوئے تھے ؟
۳ ۔ اردوئے معلیٰ کی سب سے اچھی بات کون سی تھی ؟
۴ ۔ مولانا حسرت موہانی کیسے ادیب تھے ؟
۵ ۔ انھوں نے سیاست میں کس چیز کی بے نظیر مثال پیش کی ؟
۶ ۔ شعر میں انھوں نے کس چیز کو قائم رکھا ؟
۷ ۔ انھوں نے کتب خانے کو منتقل کرنے کے بارے کیا عذر پیش کیا ؟
۸ ۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے جملے بنائیے ۔
مخبوط الحواس ۔ چیکٹ ۔ عقوبت ۔ تصنع ۔ حلیم الطبع ۔ منکسر المزاج
پیش بہا ۔ ایفائے وعدہ ۔ شاطر ۔

۹ - جمع کے واحد لکھیے -

ایذائیں - عقوبتیں - مخطوطات - اساتذہ - مطبوعات -

۱۰ - مندرجہ ذیل کے متضاد لکھیے -

اُجلا - خلوص - صداقت - تصنع - نایاب - آزادی - اعتدال -

۱۱ - حرکات لگائیے -

تلخ - چیکٹ - شیدائی - للکار - متضاد - حسنِ ذوق -

۱۲ - بے انصافی میں بے سابقہ ہے ایسے ہی چند الفاظ لکھیے جن میں یہی سابقہ استعمال کیا گیا ہو -

مرزا اسداللہ خاں غالب

(۱۷۹۶ - ۱۸۶۹ء)

مرزا غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ مرزا آگرے میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے اور پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے لے لی۔ غالب نو سال کے تھے کہ چچا بھی وفات پا گئے اور ان کے نانا نے ان کی پرورش اور تربیت کی۔ ۱۳ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی سے مرزا کی شادی ہو گئی اور انھوں نے مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لی۔

مرزا غالب اردو کے عظیم شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند مرتبہ اور صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ اگرچہ ان کی نثر خطوط تک محدود ہے تاہم ان خطوط کی بدولت انھیں اردو نثر میں وہ مقام حاصل ہوا جس کی مثال شاید ہی کسی دوسری زبان کے ادب میں مل سکے۔ ان کے خطوط نے اردو نثر کو ایک نئی راہ سے روشناس کیا۔ واقعہ نگاری، بے تکلفی اور شگفتگی ان کی نثر کی جان ہے ان کی تحریر میں بڑی روانی اور سادگی ہے۔ مرزا غالب بہت آسان زبان لکھتے ہیں مگر ان کی پیروی کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کی عبارت میں شعر کا سا حسن ہے۔

خطوطِ غالب

(۱)

بنام مہدی حسین مجروح

واہ واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔

نثر میں خود کو نمایاں کرنے لگے ۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے ۔ آج بسبب کمی کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے ۔ مگر حیران ہوں کہ سحر سازی کروں یا سخن پردازی کروں ۔ بھائی ! تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو ۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو ۔ کیا قتیل کیا رودِ نیل یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں ۔ سنو ، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں ۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا ، اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا ۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا گیا شہر کی آبادی کا حکم خاص کچھ نہیں ہے ۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں ۔ تاج محل ، مرزا قیصر ، مرزا جواں بخت کی سالی ، ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہوئی ۔ بادشاہ ، مرزا جواں بخت ، مرزا عباس شاہ ، زینت محل کلکتہ پہنچے ۔ وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی ۔ دیکھیے کیمپ رہیں یا لندن جائیں ؟ خلق نے از روے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے ۔ یہ بات اڑا دی ہے ۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال سنہ ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر روپے دیے جائیں گے ۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے ۔ اب شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے ۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا ۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو ۔

میری جان سرفراز حسین ! تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو ؟ اب صورت کیا ہے ؟ آئندہ عزیمت کیا ہے ؟ میر

نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلائے۔ حضرت آئیے السلام علیکم، مزاج مبارک؟ کہیے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں میں کہیں، تم کہیں وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ کیونکر تم سے بے ادبیاں کر سکتے؟ انشاء اللہ تعالیٰ جب یک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیونکر یک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔

غالب

(بدھ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء)

(۲)

واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے! اس خرافات لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حجام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور "کوئی آئیو! کوئی آئیو!" فرد ہو گیا۔ میری جان بچی میرے آدمیوں کی جان بچی۔

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی دھری ہوئی خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟ پانچ چار دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج اس کی ایک صورت نظر آئی۔ کہا کہ آؤ

میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

الور کی نا خوشی ، راہ کی محنت کشی ، تپ کی حرارت ، گرمی کی شرارت ، یاس کا عالم ، کثرتِ اندوہِ غم ، حال کی فکر ، مستقبل کا خیال ، تباہی کا راج ، آوارگی کا ملال۔ جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں راجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہو گا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا۔ بارے رفع مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو۔ تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں۔

تندرستی ہزار نعمت ہے۔

ہائے پیش مصرع قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو پسند آیا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔

آ ہا ہا ہا! میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں؟ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔

غالب

صبح جمعہ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ء

(۳)

بنام مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ

جناب مولوی صاحب قبلہ! یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسداللہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ مکرمتِ حال کا شاکر اور آئندہ افزائشِ عنایت کا طالب۔ "دفتر بے مثال" کو عطیۂ کبریٰ اور محبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان جانا۔ پہلے اس قدر افزائشی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ حضرت نے اس ہیچ میرز، ہیچ مدان کو قابلِ خطاب اور لائقِ کتاب جانا۔

میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں، دیوانِ فیض عنوان اسم بہ مسمیٰ ہے۔ "دفتر بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقیر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی نا ہموار روشوں کے ناسخ تھے، آپ ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانائے امورِ اردو زباں ہو۔ سرمایہ نازش قلم روِ ہندوستاں ہو۔

خاکسار نے ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اس روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و سائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں۔ مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا۔ فارسی زبان میں بہت کچھ لکھا۔ اب نہ فارسی کا فکر نہ اردو کا ذکر، نہ دنیا سے توقع، نہ عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور اندوہِ ناکامیٔ جاوید۔

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ اب اور کہاں تک جیوں گا۔

ایک اردو دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا ، تین رسالے نثر کیے - یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے اور کیا کہوں کہ مدح کا صلہ نہ ملا - غزل کی داد نہ پائی - ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی -

سچ تو یہ ہے کہ قوت ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا - طبیعت میں وہ مزہ ، سر میں وہ شور نہ رہا - پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا - اس سبب سے فن ِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں - جو اس کا بقیّہ اس قدر ہے کہ وہ معرض گفتار میں موافق ِ سوال جواب دیتا ہوں - روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں کیا پیش آتا ہے ؟ اور یہ بال بال گناہ گار بندہ کیونکر بخشا جاتا ہے ؟ حضرت سے یہ التماس ہے - آپ جو ابداء کے بادی اور مجھ کو ارسال نامہ کی سبیل کے ہادی ہوئے ہیں - جب تک جیتا رہوں نامہ و پیام سے شاد اور بعد مرنے کے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا - و السلام با لوف الاحترام -

غالب

نومبر ۱۸۶۴ء رجب ۱۲۸۱ھ

(۴)

بنام مرزا حاتم علی مہر

مرزا صاحب ! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا - ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو - کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے ؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے - برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا - نہ اپنی خیر و عافیت

لکھی - نہ کتابوں کا پیوار بھجوایا -

باقی رہا میرا کلام ، سو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا - نواب ضیاءالدین خاں اور نواب حسین میرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا ، انھوں نے لکھ لیا - ان دونوں کے گھر لٹ گئے - ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے - اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں - کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا - اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا ، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا - غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے خط کا جواب چاہتا ہوں -

غالب

۱۵ تا ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

(۵)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

آؤ مرزا تفتہ ! میرے گلے لگ جاؤ - بیٹھو اور میری حقیقت سنو -

یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے - ان سے حال معلوم ہوا - پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بہ موجب حکم رنگتن صاحب کے لکھا تھا - پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا - دونوں دیوان تمھارے اور "نشتر عشق" اور ایک "تذکرہ" اور یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں - صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہو گا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو - فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے - باقی ما بہ خیر شما بہ سلامت -

ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس مشاہدہ کے علاقے ہیں ۔ اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں ان سے کلام کروں ۔

میرا عجب حال ہے ، حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں یاد نہیں آتا ۔ سامعہ مر گیا تھا اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں حواس سراسر مختل ہیں حافظہ گویا کبھی نہ تھا شعر کے فن سے گویا مناسبت نہ تھی ، رئیس رام پور سو روپے مہینہ دیتے ہیں سال گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے ۔ عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں ”سکہ لمبر“ سہی ۔ ورنہ ”خیرات خوار“ سہی اور اگر یہ عطیہ بہ شرط خدمت ہے تو آپ کی مرضی ہے ۔ وہی میری قسمت ہے ۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا ۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے ۔ آج تک نواب صاحب از راہ جواں مردی دیے جاتے ہیں ، اور بھائی ! تمھاری مشق ، چشم بدور ، صاف ہو گئی ۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نہ خواہی تمھارا عقیدہ ہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے ۔ میں تو چراغ دمِ صبح و آفتاب سرِ کوہ ہوں ۔

”انا للہ و انا الیہ راجعون“

۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء
نجات کا طالب
غالب

مرزا تفتہ

جو کچھ تم نے لکھا ، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی ۔ معاذ اللہ

تم سے اور آزردگی ؟ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں ۔ جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے ۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو ۔ رہا غماز کا کہنا : اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا کہ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا ۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور تمھاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا ۔

بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے ۔ برسات کی مصیبت گزر گئی ۔ لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی ۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں ، بیٹھ نہیں سکتا ۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی ۔ خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں ، بہ کار آمدنی نہیں ۔ خیر کبھی دیکھ لوں گا ۔ جلدی کیا ہے ، تین باتیں جمع ہوئیں ۔ میری کاہلی تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا ۔ کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہوتا ۔ نظر ان مراتب پر ، کاغذ پڑے رہے ۔

لالہ بال مکند بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو بہت دن ہوئے آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا ۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا ۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا اس کو دیکھا ، لفافہ کیا ، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا ۔

غالب

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء

سوالات

۱ - غالب کے خطوط کی امتیازی خصوصیات چند الفاظ میں تحریر کیجیے -

۲ - مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کے نام دلی کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں انھیں مختصر طور پر لکھیے -

۳ - مرزا غالب نے میر مجروح کے نام اپنے دوسرے خط میں برسات کا جو نقشہ کھینچا ہے ، اسے سادہ الفاظ میں بیان کیجیے -

۴ - مولوی عبدالغفور کے نام غالب نے اپنے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں ، انھیں آسان زبان میں لکھیے -

۵ - مرزا حاتم علی مہر کے نام مرزا غالب نے لکھا ہے : ''میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے'' آپ کے نزدیک یہ بات کس حد تک درست ہے ؟

۶ - غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں اپنا جو حال بیان کیا ہے ، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے -

۷ - مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مطلب واضح ہو جائے -

عبارت آرائی - خود نمائی - سخن پردازی - شتاب - عزیمت - تقصیر - اقامت - مہورت - نورچشم - حجرہ - ملال - گوشہ نشیں - ہیچ - دروغ گو - سرمایۂ نازش - خامہ فرسائی - عقبٰی -

۸ - مندرجہ ذیل کے مترادف لکھیے -

شتاب - عزیمت - تقصیر - ملال - اقامت -

۹ - مندرجہ ذیل کے متضاد لکھیے -

سحر - خاص - خوشی - بدنام - جدید - دانا -

۱۰ - حرکات لگائیے -

ہیچ - مداح - نساخ - حجرہ - مہورت - کبریٰ - عقبٰی - مجتہدالعصر -

۱۱ - میر مہدی حسین مجروح - ہیں مجروح تخلص ہے آپ بتائیے تخلص کسے کہتے ہیں -

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ - ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا - پانی پت میں پیدا ہوئے - نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا - والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی اور بہن نے ان کی تربیت کی ۱۸۵۴ء میں تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دہلی آئے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف ملازمتیں کیں - کچھ عرصہ لاہور میں محکمۂ تعلیم سے بھی منسلک رہے -

حالی سرسید تحریک کے بڑے اہم رکن تھے - ان کا اندازِ بیان سرسید کی طرح سادہ اور مدلل ہے - ان کی تصانیف میں ''مقدمۂ شعر و شاعری''، ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' بہت مشہور ہیں - حیاتِ جاوید، سرسید کی سوانح عمری ہے - ''سرسید اور اردو'' حیاتِ جاوید ہی کا اقتباس ہے -

سرسیّد اور اردو

سرسید ہمیشہ جیسا کہ ان کی خدمات سے ظاہر ہوتا ہے، اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی، بغیر اس کے کہ ہندوستانی بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں، کسی طرح ممکن نہیں - چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے - مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا -

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید

ہوتے تھے - تاریخِ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصّب آمیز طریقے پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں - اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا - کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے - چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے، وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ ہندوستان میں دیکھ رہا ہے - اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا، وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا - جو عزت اور جاہ و منصب اور امورِ سلطنت میں شوکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی ، مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا عقلیت و بے پروائی ، یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے ان کو اور مٹا دیا تھا - ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور امنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اس بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اڑاتے ہو ؟ اس سے دست و گریبان ہو جائے اور اردو زبان جو کہ درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسماء اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے - اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی -

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ

خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیو ناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ انھی دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ تمام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد، ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔

غرضیکہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی۔ جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں

اور سبھائیں قائم تھیں - یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ انھیں دنوں میں لفٹینٹ گورنر بنگال ، بھاگلپور کی سائینٹِفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے ان کو ایڈریس اردو میں دیا گیا جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کیے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگالے میں رہا ہو آسان نہ تھا - بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگالے میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے ، اسی طرح صوبۂ بہار میں بہاری زبان اور کیھتی حروف جاری کیے جائیں - کیونکہ ہز آنر ایڈریس کے بہت کم الفاظ سمجھتے تھے - انھوں نے کہا جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہے - ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی - چنانچہ انھوں نے چند روز بعد یہ حکم دے دیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے ، جاری ہو - ہر چند مسلمانوں نے اور بہت سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا -

اس واقعے سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں - الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلے کی تحریک کے لیے منعقد ہوے اور آخر کار مجلس کے سکریٹری نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت شروع کی - سکریٹری کی متعدد چٹھیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشہور ہوتا رہا - آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کیے - الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں

کے دستخط تھے، گورنمنٹ میں بھیجیں۔ سنا گیا ہے کہ مسٹر کیمسن ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی اور غالباً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہو گئی کہ فارسی خط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جب سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے، ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن سے تعلق نہیں رکھتا ؛ بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی سر اینٹونی میکڈانلڈ لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزارا تاکہ تمام سرکاری عدالتوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور

ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس وقت رنج و الم کے سبب ایک سکتے کا سا عالم طاری تھا ۔ کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے ۔ مگر اسی عالم میں انھوں نے اس پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کو انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا ۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی ، اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہوسکتا مگر جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہوں ۔ ان کو یقین تھا ۔ کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے ۔

اس بات کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی ۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں یہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے ۔ مگر ایسا کوئی حصہ نہیں ، جہاں اردو کے سمجھنے والے نہ ہوں ۔ فرانس کے مشہور اورینٹیلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے ۔ وہ اس متنازعہ مسئلے کی نسبت اپنے ایک لیکچر میں لکھتے ہیں کہ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں ۔ جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے ۔ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں ۔ مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں ۔

سوالات

۱ ۔ سرسید کس اصول کے پابند تھے ؟

۲ - مسلمانوں کی عزت ، جاہ ، منصب اور امور سلطنت میں دخل کس وجہ سے جاتا رہا ؟

۳ - اردو زبان کس زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے ؟

۴ - اردو میں عربی اور فارسی کے کس قدر اسماء شامل تھے ؟

۵ - ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں کو کیا خیال پیدا ہوا ؟

۶ - سوسائٹی کی طرف سے لیفٹیننٹ گورنر بھاگلپور کو ایڈریس کیسی زبان میں دیا گیا ؟

۷ - بہار کی عدالتوں کے لیے کیا حکم دیا گیا ؟

۸ - سرسید نے اردو زبان کی حمایت میں کیا کچھ کیا ؟

۹ - یہ تحریک کس بنا پر ناکام ہوئی ؟

۱۰ - سرسید کے دوستوں نے پنجاب میں کون سی انجمن قائم کی ؟

۱۱ - گارساں دتاسی نے اپنے لیکچر میں کیا لکھا ہے ؟

۱۲ - مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کو اپنے فقرات میں استعمال کیجیے - گھنا - جاہ و منصب - سربرآوردہ - بھاشا - عناد - سبھائیں - کیتھی - وفا گری - چاؤ -

۱۳ - سرسید کے نام میں 'سر' کیسا کلمہ ہے ؟ اس قسم کے چند کلمات تحریر کیجیے -

۱۴ - اسم صفت کی تعریف کیجیے اور اس سبق سے اسم صفت کی مثالیں نکالیے -

محمود نظامی

(۱۹۱۱ - ۱۹۶۰)

محمود نظامی نے اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان آ گئے اور ریڈیو ہی سے وابستہ رہے کچھ عرصہ محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر رہے۔ وفات سے کچھ مدت پہلے ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے۔

محمود نظامی کو لکھنے کا شوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا۔ انھوں نے اردو میں مضامین اور ڈرامے بھی لکھے ہیں مگر ان کا سفر نامہ جو ''نظر نامہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اردو کے سفر ناموں میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس سفر نامے میں محض واقعات اور مناظر کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ مصنف کے اپنے تاثرات بھی شامل ہیں۔ مختلف چیزوں کو دیکھ کر ان کے دل میں جو خیالات اور کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کے بیان نے اس سفر نامے کی ادبی حیثیت کو بہت بلند کر دیا ہے اور یہ صرف معلومات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک ادبی شاہکار بن گیا ہے۔ ''فرعون و موسیٰ'' اس سفرنامے کا اقتباس ہے۔

فرعون و موسیٰ

ہمارے سامنے دریا کا مٹیالا پانی کسی فلسفی کی طرح اپنے خیالات کی دنیا میں گم ، غالباً اس جلیل القدر تہذیب کے عروج و زوال

کے اسباب پر غور کرتا چپ چاپ بحیرۂ روم کی طرف بڑھ رہا تھا ، جو آج سے چھ ہزار برس قبل اسی کے کناروں پر پھولی پھلی تھی اور ساڑھے تین ہزار برس تک دنیا کو اپنی عظمت سے مرعوب کرنے کے بعد اپنی طبعی موت مر گئی تھی - دور سے اس کے پانیوں پر حرکت کرنے والے بجرے اور ان کے سفید بادبان یوں دکھائی دے رہے تھے ،گویا تتلیاں سطحِ آب پر اپنے پر سکیڑے بے خودی اور خود فراموشی کے عالم میں پانی کے بہاؤ پر نیچے کو پھیل وہی ہیں -

سامنے کی طرف دریا کے وسط میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گائڈ نے کہا : ”یہ روضہ ہے اور اس میں وہ جو مسجد ہے ، بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے - اس کا تعلق خلافت راشدہ کے عہدِ زریں سے ہے - اس مسجد کے قریب میں وہ چوکور کنواں ہے - جسے مقیاس النیل کہتے ہیں - اس کے ذریعے آج بھی صدیوں پہلے کی طرح نیل کی طغیانیوں کا اندازہ کرنے کے لیے دریا کے چڑھتے اور اترتے ہوئے پانی کو ناپا جاتا ہے -

ہم میں کچھ آدمی جب دوربینوں سے اس جزیرے کو دیکھنے لگے تو ان کی دلچسپی کا اندازہ کر کے وہ بولا : ”یہی وہ جزیرہ ہے ، جہاں سے فرعون کی ملکہ آسیہ نے صبح کے دھندلکے میں وہ صندوقچہ دیکھا تھا - جس میں شیر خوار نبی حضرت موسیٰ بڑے اطمینان سے لیٹے امواج نیل پر بہتے چلے جا رہے تھے -

اس فقرے نے مجھے چونکایا اور میں اس روایت کی صحت یا کمزوری پر غور کیے بغیر اس واقعے کی جزئیات کے تصور میں کھو گیا -

ایک لمحے کے لیے وہ منظر صاعقے کی رفتار سے میرے تخیل میں گھوما - جس کی طرف قرآنِ پاک میں سورۃ طٰہٰ میں بڑے تفصیلی اشارے ہیں اور میں نے یوں محسوس کیا گویا جب یہ واقعہ

پیش آیا تو میں یہیں کھڑا اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ۔ یہ اس تخیلی تصویر میں اس سہانی صبح کا منظر ہر طرف جلوہ فرما تھا جو اول سے وادی نیل سے متعلق ہے ۔ قرمزی شفق نیلگوں آسمان ، ٹھنڈے جھونکے ، سبک بادِ نسیم گہرا سکوت گویا ساری کائنات سولہ سنگار کیے نئے دن کے استقبال کے لیے آنکھیں فرش راہ کیے ہوئے ہے اس پس منظر کے اوپر فرعون کا پر شکوہ محل تھا ۔جس کی سنگین دیواروں کے ساتھ رود نیل کی آہستہ خرام موجیں اٹکھیلیاں کر کے ملکہ کی توجہ کو اپنی جانب کر رہی تھیں ۔ جو اس سہانے سمے میں کنیزوں اور خواصوں کے ساتھ محل کی بالائی منزل کے ایک دریچے سے اپنے معمول کے مطابق طلوع صبح کا تماشہ کر رہی تھی ۔ وہ بظاہر اس جاں پرور نظارے کی دید میں کھوئی ہوئی تھی ، لیکن در پردہ اس کا دل گہرے رنج میں ڈوبا ہوا تھا ۔ کہ ایک ایسی سہانی صبح کے پر سکون لمحات میں اس کے شوہر فرعون نے وہ بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے کاہنوں اور منجموں نے یہ دی تھی کہ اس کی حکومت کی بربادی بنی اسرائیل کی مقہور قوم کے نیک لڑکے کے ہاتھوں عمل میں آئے گی اور سوچ رہی تھی کہ آخر وہ قتل و خوں کب تک جاری رہے گا ۔ جو فرعون کے اس حکم کی تعمیل میں کئی برس سے مصر کی سر زمین پر بہایا جا رہا تھا ۔ کہ جب کسی اسرائیلی کے ہاں لڑکا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے ۔

معاً اس کے استغراق کو ایک خواص کی اس چیخ نے پریشان کیا جس میں حیرت و استعجاب کی گہری جھلک موجود تھی ۔ ملکہ اپنے خیالات سے چونکی اور اس نے لڑکی کے ہاتھ کے اشارے کی طرف نگاہیں دوڑائیں تو دیکھا کہ ایک صندوقچہ نیل کے بھاؤ پر چلا آ رہا ہے اور آہستہ آہستہ محل کی دیواروں سے ٹکرا کر ادھر

کو بڑھ گیا ہے ۔ جہاں محل کا زینہ پانی میں اترتا ہے ۔ ملکہ کے حکم پر کنیز نے اس صندوقچے کا ڈھکنا اٹھایا تو دیکھا ایک معصوم بچہ جس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں کھلکھلا کر اس کے شکوک و شبہات پر ہنس رہی تھیں ۔ بڑے اطمینان سے لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا ۔ بچے کو دیکھ کر ملکہ کا دل فرط مسرت سے جھوم اٹھا ۔ وہ اسے نکال ، گود میں لئے محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ کسی شوخ و طرار کنیز نے کہا یہ تو خد و خال سے اسرائیلی معلوم ہوتا ہے ۔ رب رع نہ کرے یہی ہمارے آقا کے خواب کی تعبیر ثابت ہو ۔

لڑکی نے جس وقت یہ خطرناک فقرہ کہا ، عین اسی وقت فرعون ملکہ کی خواب گاہ میں داخل ہو رہا تھا ۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پہنچے تو وہ لپک کر ملکہ کی طرف بڑھا ۔ بچے کو دیکھ کر نفرت و حقارت سے کہنے لگا : "یہ منحوس بچہ اگر اسرائیل کی اولاد میں سے ہے تو اسے قتل کرنے کے لیے جلادوں کے حوالے کر دو" ۔

آسیہ نے بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا ۔ پھر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہنے لگی ۔ "اسے کسی غیبی طاقت نے اگر ہماری پناہ میں لا ڈالا ہے تو میں اسے قتل نہ ہونے دوں گی ۔ کیا عجب کہ یہ اجنبی بچہ ہمارے گہوارۂ محبت اور آغوشِ تربیت میں پروان چڑھ کر تیرے خواب کی تعبیر بننے کی بجائے ہمارے لیے آیۂ رحمت ہو" ۔

جب ملکہ کے اصرار اور سفارش کے سامنے بڈھا فرعون خاموش ہو گیا تو مشیتِ ایزدی جس نے اس کی تمام حزم و احتیاط کے باوجود خود اس کو اس کے دشمن کا ولی مقرر کر دیا تھا ۔ انسانی فہم و وقوف کی کمزوری پر ہنس دی ۔

میں فاصلے پر کھڑا اس جزیرے کو دیکھ رہا تھا تو ایک اور

منظر میرے تصور میں ابھرا جس کا تعلق ان روایات سے تھا جو حضرت موسیٰ کی لکنت کے بارے میں میں نے سن یا پڑھ رکھا تھا۔ غالباً وہ واقعہ بھی یہیں اسی جزیرے میں فرعون کے محل سرا ہی میں کہیں پیش آیا تھا جو اس وقت میرے تصور میں موجود تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ حضرت موسیٰ عہد طفولیت میں فرعون کی گود میں بیٹھے معصومیت سے اس کے جسم پر پہنے ہوئے زیورات سے کھیل رہے ہیں۔ پھر ان کا ہاتھ ان موتیوں کی طرف اٹھا جو فرعون کی داڑھی میں چمک رہے ہیں اور ان کی مضبوط گرفت کو کھولنے کے لیے فرعون کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ موتیوں کے ساتھ اس کی داڑھی کے چند بال بھی اکھڑ آئے ہیں۔ فرعون نے بچے کو خفگی کے عالم میں ایک درباری کے حوالے کیا ہے کہ وہ اسے قتل کر دے لیکن آسیہ کی سفارش پھر آڑے آئی ہے اور فرعون نے ملکہ کے اس خیال کا جائزہ لینے کے لیے قتل کا حکم عارضی طور پر ملتوی کر دیا ہے کہ معصوم بچہ مصر کے زندہ خدا کے احترام سے واقف نہیں۔ وہ تو آگ کی چنگاری اور کھجور کے دانے میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ فرعون کہہ رہا ہے کہ اگر اس بچے نے انگارے سے ہاتھ کھینچ لیا تو اسے قتل کروا دیا جائے گا۔ اب وہ حکم دے رہا ہے کہ چند کھجوریں اور جلتے ہوئے کوئلے امتحان کے لیے شیر خوار نبی کے سامنے رکھے جائیں۔ غلام یہ چیزیں لے کر حاضر ہو گئے ہیں اور سب درباری دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کبھی انگاروں کو اور کبھی موسیٰ کو دیکھ رہے ہیں اور پھر آسیہ کے لبوں سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ہے کیونکہ بچے نے ہمک کر آنکھ جھپکنے میں ایک انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا ہے۔

ملکہ بچے کی بلبلاہٹ کے ساتھ خود تڑپ اٹھی ہے اور اس نے لپک کر یہ انگارہ درد سے چلاتے ہوئے بچے کے منہ میں انگلی ڈال

کر اگلوا دیا ہے - لیکن معصوم بچے کی زبان پر آبلے پڑ گئے ہیں اور اب وہ ہمیشہ کے لیے لکنت کا اسیر ہو گیا ہے -

سوالات

۱ - مصنف نے جب دریائے نیل کا پانی دیکھا تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات پیدا ہوئے ؟

۲ - جزیرے کو دیکھ کر گائڈ نے کیا کہا ؟

۳ - دوربینوں سے جزیرے کو دیکھ کر کچھ آدمیوں نے کیا خیال کیا ؟

۴ - فرعون کی اہلیہ نے محل کی بالائی منزل سے کیا نظارہ دیکھا ؟

۵ - منجموں نے فرعون کے خواب کی کیا تعبیر دی تھی ؟

۶ - ملکہ نے حیرت کے عالم میں کیا دیکھا ؟

۷ - ملکہ نے بچے کو دیکھ کر کیا محسوس کیا - ؟

۸ - فرعون نے بچہ کو دیکھ کر کیا کہا - ؟

۹ - ملکہ نے فرعون کا کیا جواب دیا ؟

۱۰ - حضرت موسیٰ نے فرعون کی گود میں کیا کیا ؟

۱۱ - فرعون نے خفا ہو کر بچہ کے متعلق کیا حکم دیا ؟

۱۲ - مندرجہ ذیل مصادر کے حاصل مصدر بنائیے -
بلبلانا - چلانا - دوڑنا - بہانا - پھسلنا - ناپنا -

۱۲ - مندرجہ ذیل کی تشریح کیجیے -
مقاس النیل - سورۃ القصص - سورۃ طہ - مشیئتِ ایزدی -

سرسیّد احمد خان

(۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء)

سرسید کے بزرگ شاہجہان کے زمانے میں ہندوستان آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے والد ایک قناعت پسند اور گوشہ نشین شخص تھے۔ ان کی والدہ بڑی نیک اور روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے سرسید کو بہت اچھی تربیت دی۔ سرسید کو اپنے والد کے تعلق کی بنا پر مرزا غالب سے بھی قربت حاصل رہی اور اس طرح اس زمانے کے اہلِ علم حضرات سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ سرسید نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا۔

سرسید بیک وقت ایک مصلح، ایک عالمِ دین، ایک سیاسی راہنما اور ایک ادیب تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی کم و بیش ہر صنف کو متأثر کیا۔ انھیں جدید اردو نثر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ سادگی، روانی بے ساختہ پن اور زور ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں، ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت انسان کے بدن میں ایسا مادہ

پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اس وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسانی دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی اپنی خوشامد کر کے دل کو خوش کرتے ہیں - پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے۔ اور جو محبت اور مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبت کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں۔ جب کہ ہمارا دل نرم ہو جاتا ہے، اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے اور مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آ جاتا ہے۔ لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقیناً خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے، جو ہم میں نہیں ہے۔ یا ہم ایسے بننا چاہتے

ہیں جیسے کہ در حقیقت ہم نہیں ہیں ۔ تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگاتے ہیں گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر در حقیقت وہ ہم کو ایسی بد زیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں ۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں ۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف اپنے میں پیدا کریں جو بعض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں ، اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں ۔ ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے ، جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر ۔

خودی انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے ، جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے ۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طری مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے ۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے ۔ دونوں شخص خوش رہتے ہیں ، ایک اپنی لیاقت کے سبب سے دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے ۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور

رنگ ، خد و خال کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو ۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے ۔ بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں ، اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں ، جن کے سبب سے وہ تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں ۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے ۔ جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا ۔ مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے ۔ فیاض آدمی کو بدنامی یا نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے ۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انہیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے ۔ جیسے کہ تھرما میٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے ۔

سوالات

١ ۔ دل کی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک بیماری کون سی ہے ؟
٢ ۔ خوشامد انسان کے دل میں کون سا مادہ پیدا کرتی ہے ؟
٣ ۔ اول خوشامد کا شوق کیسے پیدا ہوتا ہے ؟
٤ ۔ خوشامد کا سبب جاننے کے بعد خوشامد کرنے والا شخص کیسا متصور ہوگا ؟
٥ ۔ ہمیں اپنے آپ میں کون سے اوصاف پیدا کرنے چاہئیں ؟
٦ ۔ ایشیا کے شاعروں کا کون سا بڑا نقص ہے ؟

۷ - عالی ہمت طبیعت کو کن چیزوں سے تقویت ملتی ہے ؟

۸ - مندرجہ ذیل الفاظ کو فقرات میں استعمال کیجیے -

مہلک - مکر و فریب - بدزیب - چھچھورا پن - خدوخال- ناموری-

۹ - مندرجہ ذیل کلمات کی جمعیں لکھیے -

وصف - شاعر - خیال - مرض - حق - اثر - نقص - مثال -

۱۰ - نالائق میں 'نا' سابقہ ہے آپ چند کلمات لکھیے جن میں یہی سابقہ استعمال ہو -

———:o:———

—۲—

گذرا ہوا زمانہ

برس کی آخیر رات کو ایک بڈھا اپنے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے ، رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے - بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے ، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے ، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے - بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے ، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر - وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی اس کا غم بڑھتا ہے - ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں -

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے ، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے ، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر اس کے دل میں نہ تھی - روپے ، اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی - سارا گھر ماں باپ ، بہن بھائی اس کو پیار کرتے تھے - پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں

کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا ۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے ۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلاّ اٹھتا تھا ۔ ''ہائے وقت ! ہائے وقت ! گزرے ہوے زمانے ! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا ۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا ۔ اپنا سرخ و سفید چہرہ ، سڈول ڈیل ، بھرا بھرا بدن ، رسیلی آنکھیں ، موتی کی لڑی جیسے دانت ، امنگ بھرا دل ، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ آہ ابھی بہت وقت ہے ۔ اور بڑھاپے کے زمانے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا ۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا ۔ آہ وقت گزر گیا ! آہ وقت گزر گیا ! اب پچھتانے کیا ہوتا ہے ۔ افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی بہت وقت ہے ۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا ۔ کھڑکی کھولی ، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے ، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے ، بجلی کی کڑک سے دل بیٹھا جاتا ہے ، ہولناک آندھی چل رہی ہے ، درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں ۔ تب وہ چلاّ کر بولتا ہے : "ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی رات ۔" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھتا ہے ۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ ، بہن بھائی اور دوست آشنا یاد

اے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں ۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے ۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا ۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ "کیوں بیٹا ہم تمھارے بھلے کے لیے نہ کہتے تھے ." بھائی بہن دانتوں میں انگلیاں دبے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے ۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں ؟

ایسی حالت میں اس کو اپنی باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت پرانی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ ، بہن بھائی دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں ۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا ، باپ کو ناراض کرنا ، بھائی بہن سے بے مروت رہنا ، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا ۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا ، ہائے وقت نکل گیا ! اب کیونکر اس کا بدلہ ہو ؟

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پنہچا ۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے ، پر رات ویسی ہی اندھیری ہے ۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا ، جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی نہ وہ جوانی کا جوبن ، نہ دل رہا تھا نہ دل کے ولولوں کا جوش ۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا ۔ وہ روزہ رکھنا ،

نمازیں پڑھنی ، حج کرنا ، زکواۃ دینی ، بھوکوں کو کھلانا ، مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا ۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی ، اپنے پیروں کو جن کی بیعت کی تھی ۔ اپنی مدد کو پکارتا تھا ۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی ۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے ۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں ، مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں ۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں ۔ نہ پیر نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے ۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں سے دل لگایا ۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی ، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلّا اٹھتا ۔ ''ہائے وقت ! ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا ؟''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا ۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے ۔ آندھی تھم گئی ہے ، گھٹا کھل گئی ہے ، تارے نکل آئے ہیں ، ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے ۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی ۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا ۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا ، وہ قریب ہوتی جاتی تھی ۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی ۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور پاک لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو ۔ وہ بولی ''میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں ۔'' اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے ۔ وہ بولی ہاں ہے ، نہایت آسان پر بہت مشکل ۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ ''واللہ لا ازید ولا

انقص[۱] ۔" ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوں ۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے ، انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا ۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے ، وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے ۔ نماز ، روزہ ، حج ، زکواۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے ۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں ، مگر انسان کی بھلائی ہمیشہ جاری رہتی ہے ۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں ، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے ، کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں تو دل و جان و مال سے ساعی ہو ۔" یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا ۔

اب پھر اس نے پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا ۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے ۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے ۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا ۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا ۔ اپنا آخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ تھی تب تو نہایت مایوسی کے عالم میں بے قرار ہو کر چلّا اٹھا "ہائے وقت ، ہائے وقت ! کیا پھر تجھے بلا سکتا ہوں ۔ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا ۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا ۔

---

۱ ۔ خدا کی قسم نہ میں زیادہ کرتا ہوں اور نہ کم ۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی ۔ اس کی پیاری ماں اس کے قریب آ کھڑی ہوئی ، اس کو گلے لگا کر اس کی تسلی کی ۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا ۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے قریب آ کھڑے ہوئے ۔ ماں نے کہا بیٹا کیوں برس برس روتا ہے ؟ کیوں تو بے قرار ہے ؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے ؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو ، کپڑے پہن ، نوروز کی خوشی منا ، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں ۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہوگیا تھا ۔ اس نے سارا خواب اپنی ماں سے کہا ۔ اس نے سن کر اس کا جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا ، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا ۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ اوہو یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے ۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت چہرہ مجھ کو دکھایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلا دیا ۔ او خدا ، او خدا ! تو میری مدد کر ، آمین ۔

پس اے میرے نوجوان ہموطنو ! اور اے میری قوم کے بچو ! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ آخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ ۔ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے ، اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے ، آمین ۔

سوالات

۱ ۔ مصنف نے جو خواب دیکھا اس کا خلاصہ بیان کیجیے ۔

۲ ۔ ہمیشہ رہنے والی نیکی کون سی ہے اور کیوں ؟

۳ - مصنف اپنے تمام نیک کاموں کو ذاتی غرض پر مبنی قرار دیتا ہے ؟

۴ - اس مضمون میں نوجوانوں کو کیا نصیحت کی گئی ہے ؟

۵ - مندرجہ ذیل پر حرکات لگائیے -

ریوڑی - سڈول - امنگ - تیار - ٹٹول - کج خلقی - مروت - سوجھی - مسخر - مبنی -

۶ - مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی تحریر کیجیے -

مکتب - خدا پرستی - ہولناک - ٹہنے - مائل - تسخیر - مادی چیزیں - ساعی - پشیمان -

——— : o : ———

شیخ عبدالقادر

(۱۸۷۲ - ۱۹۵۰ء)

سر شیخ عبدالقادر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ مشن کالج لاہور سے بی۔ اے کر کے انگریزی اخبار "آبزرور" میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں ایک اردو کا مشہور ماہنامہ "مخزن" نکالا۔ جو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ ۱۹۰۷ء میں انگلستان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے قائم مقام جج مقرر ہوئے اور بعد میں متعدد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

شیخ عبدالقادر کا شمار اردو کے بڑے محسنوں میں ہوتا ہے۔ ان کے رسالے "مخزن" نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اردو کے کئی نامور اہلِ قلم "مخزن" ہی کے ذریعہ متعارف و مشہور ہوئے۔

شیخ عبدالقار اردو کے اعلیٰ درجہ کے نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ زبان و بیان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی، روانی اور بیساختہ پن پایا جاتا ہے۔

دنیا کی دلچسپیاں

دنیا بھی اک بہشت ہے ، اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

آدمی بسا اوقات تکلیف کے صدموں سے گھبرا کر یا محنت کی سختیوں سے اکتا کر کہہ اٹھتا ہے: "دنیا میں کیا آئے، ایک آفت

میں پھنس گئے ۔" یا "دنیا ہے کہ اک سلسلۂ مصیبت ہے ۔" کوئی اسے دوزخ سے تشبیہ دیتا ہے ، کوئی دارالمحن کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ مگر عملاً سب اس کی محبت میں مبتلا ہیں اور سوا چند خدا رسیدوں کے یہاں سے کوچ کرنے کو کوئی پسند نہیں کرتا ۔ تاہم ایک زمانہ ہے جو اسے میرا کہنے پر تلا ہوا ہے ۔ ایسی حالت میں اس حق پسند کی نظر کی داد دینی پڑتی ہے جس نے دنیا کی الجھنوں سے قطع نظر کر کے اس کی بے شمار دلچسپیوں کا دھیان کیا ہے اور شکر گزاری کا ثبوت دیا ہے اور یوں غفلت کیش انسان کو یاد دلایا ہے کہ اسے خالق نے کیسی کیسی نعمتیں بخشی ہیں ، جن سے وہ ہر دم ، ہر لحظہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ اس پر احسان مندی کا یہ حال ہے کہ ذرا سی تکلیف پہنچے تو اسے مہینوں بلکہ برسوں یاد رکھے اور ہر ایک سے اس کی شکایت کرتا پھرے ۔ جو لطف ہر گھڑی نصیب ہے اسے بھول جائے اور اس کا شکر زبان پر درکنار ، دل میں بھی نہ آنے دے ۔ جو قیدیں مذہبوں نے بعض چیزوں کے متعلق لگا دی ہیں ۔ ان سے تو گھبرائے لیکن ان کے مقابل جو چیزیں جائز ہیں اور جن کی اجازت ہے کہ کھلے بندوں اور دل کھول کر ان سے حظ اٹھاؤ ان کا ذکر نہ کرے ، مبارک ہیں وہ لوگ جو احسانات الٰہی کو نہیں بھولتے اور ان کے سامنے دنیا کی معمولی کلفتوں اور رنج کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ۔

ذرا آنکھ کھول کر دیکھو ، کیا بہار ہے ۔ نسیم کے ہلکے جھونکے ، بادِ صبا کی اٹکھیلیاں ، چلتے ہوئے پانی ، بہتی ہوئی ندیاں شفاف جھیلیں ، زخار سمندر ، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ اور ان کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ، پھولوں کے تختے اور پھلوں سے لدی ڈالیاں ، درخت اور ان کے ہرے ہرے پتے اور سبزے کے فرشِ زمردیں ، پکے ہوئے کھیت اور ان میں قوتِ زندگی سے بھرے ہوئے

سنہرے خوشے ، نگاہ کے لیے جنت نہیں تو کیا ہے ؟ بلبل اور اس کی کوک ، پپیہا اور اس کی "پی کہاں" یہ نغمہ نہیں تو کیا ہے ؟ اس کو فردوسِ گوش کہتے ہیں ۔ قدرت کا یہ ساز ہر وقت تمہارے خوش کرنے کو تیار ہے ۔ اس کا سازندہ نہ کبھی تھکتا ہے اور نہ کبھی اس کی آواز میں ضعف آتا ہے ۔ یہ وہ ساز ہے جس کے لیے بگڑنا نہیں بنا ۔ قدرت کا حسن کچھ مناظر کوہ و دشت اور باغ و راغ ہی پر ختم نہیں ہوا ، نہ اس کی آواز پرندوں کی خوش الحانی تک محدود ہے ۔ آنکھ بینا ہو تو ہر جگہ حسن کا جلوہ موجود ہے ۔

گرمی کے دن اور ان میں ٹھنڈا پانی ، سردی کے دن اور ان میں سورج اور دھوپ ، برسات کا موسم اور اس میں ابر اور گھٹائیں ، بہار کی فصل اور اس کا جوبن ، سب نعمتیں ہیں ۔ جن میں انسان کا حصہ ہے ۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا ہر آب و ہوا کے مطابق کچھ نہ کچھ بندوبست کیا ہے ۔ اس پر چلتے چلتے انسان کے سو کام کر جاتا ہے ۔ کھیتوں میں سے ہو نکلا تو ہرے ہو گئے ۔ باغ میں نکلا تو اس میں پھل پھول آ گئے ۔ کشتی کو اس کی چھاتی پر رکھ کر کہہ دو کہ بھائی ! اسے ساتھ لے جانا ، تو اسے عذر نہیں ۔ اس میں دس بیس سو پچاس یا زیادہ آدمی چڑھ بیٹھیں تو اسے کچھ پروا نہیں اور تو اور بوجھ جس قسم کا اور جتنا چاہو لادو ، انکار نہیں ۔ بہائے لیے جاتا ہے ۔

آگ آدمی کے لیے کھانا پکاتی ہے ، روشنی مہیا کرتی ہے اور اس کے سوا کسی اور کام میں جوت دو تو اپنی قوت خدمت کے لیے حاضر کر دیتی ہے ۔ ریلوے کے انجن ، دخانی جہاز اور کارخانوں کی کلیں آگ ہی کے زور سے چل رہی ہیں ۔ ان قوتوں سے بالا تر ایک قوت ہے جسے برق کہتے ہیں ۔ یہ پہلے چمک کر آنِ واحد میں غائب ہو جاتی تھی اور انسان کی شائق نظر کو ایک جھلک

دکھا کر اس سے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھی - اسے دیکھ کر انسان پہلے دہل جاتا تھا یا غش کھا کر گر پڑتا تھا - اب یہ بھی عقلِ انسان کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے - انسان کبھی اسے پیامبری کی خدمت سپرد کر دیتا ہے اور کبھی اسے گھوڑے کی جگہ گاڑی میں جوتتا ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ جس نے یہ عظمت اور عزت دی ، اس کا شکریہ تک ادا نہیں کرتا - ممکن ہے کہ کوئی ستایا ہوا دل پکار اٹھے - دنیا کی خوبیاں تو گن ڈالیں مگر تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھو - غور کرو - دنیا میں کتنی مصیبت ہے ، کتنا افلاس ہے ، کتنی بیماریاں ہیں ، کتنی لڑائیاں اور کیسی خوں ریزیاں ہیں ، ہزار آفتیں ہیں اور ایک انسان کی جان ہے - بے چارہ ستم سہے جاتا ہے اور اف نہیں کرتا - قادر مطلق کا احسان مند ہے کہ اس کو ایک ایسی چیز دی ہے جس کے زور پر نہ صرف اپنی حفاظت کا بلکہ اپنے آرام و آسائش کا پورا پورا سامان کر سکتا ہے اور وہ چیز عقل ہے -

عقل انسانی نے صفحۂ قدرت کے متن پر خوب حاشیے چڑھائے ہیں اور ان میں عجب عجب گل کاریاں کی ہیں - خس خانہ اور برفاب راحت گرما ہیں تو قہوہ خانہ اور گرمابہ فرصت سرما باریک ریشمی ململ اور جالیاں گرمی کے لیے اور سمور اور پشمینہ سردی کے لیے پہننے کے سامان ہیں - جاڑوں کی راتوں کے لیے لحاف اور گرمی کی تپش کے لیے پنکھے -

یہ سب دولت مندوں کے لیے ہے - مگر غریب بھی خدا کے فضل و کرم سے محروم نہیں - لاکھوں دولتوں کی ایک دولت قناعت ہے ، جس کو نصیب ہو - غریبوں میں امیروں کی نسبت اس کا وجود زیادہ ثابت ہے - امیر کو جوں جوں آرام کے اسباب ملتے جاتے ہیں ، اور ہوس کیے جاتا ہے اور غریب کو جو مل گیا اس کو لے کر

صبر و شکر سے بال بچوں میں خوش ہو بیٹھتا ہے ۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت درختوں کا سایہ اسے خس خانے سے بہتر اور سردی میں سورج اس کے کمرے کی انگیٹھی ہے ۔ رات کو اگر مکلف لحاف میسر نہیں تو کیا ہوا ۔ گدڑی یا کملی میں لیٹا ہوا ہے ۔ یا چند سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر جمع کر لیتا ہے اور ان کو جلا کر ان کے قریب رات کاٹ دیتا ہے ۔ گھر ہو ، اس میں اتفاق ہو تو ایسی غریبی میں بھی کٹ جاتی ہے ۔ دولت تو ڈھلتی چھاؤں ہے ۔ کیا جو غریب ہیں وہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے ؟ کیا ان کی فریاد کبھی نہیں سنی جائے گی ؟

انسان نہ دیکھے تو اور بات ہے ، ورنہ خود اس سے کئی درجے افضل چیزیں حکمت ایزدی سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں ۔ آفتاب اس کے لیے سمندروں سے پانی کو ابھارتا ہے اور ان کے بخارات کو اڑا کر بادل بناتا ہے ۔ بادل برستے ہیں تو زمین سرسبز ہوتی ہے ۔ پھر آفتاب چمکتا ہے تو کھیت پکتے ہیں اور میوے کھانے کے لائق بنتے ہیں ۔ ہوا جو انسان کی زندگی کا سہارا اور بہت سی چیزوں کی ہستی کا راز ہے انسان کے لیے چکی تک پیستی ہے ۔

مگر یہ شکایت کرنے والے خواہ کتنے ہی حق بجانب ہوں ، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا اضداد سے پیدا کی گئی ہے ۔ ہر ایک چیز کا وجود اس کے ضد کے وجود کا تقاضا کرتا ہے ۔ دھوپ کے ساتھ سایہ لگا ہوا ہے اور دھوپ کا احساس نا ممکن ہوتا اگر سایہ نہ ہوتا ۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں انسان کا کیا حصہ ہے ۔ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جائے تو تمام تکالیف خیر محض دکھائی دینے لگیں ۔ یہی وہ سرمہ ہے جس کے لگاتے ہی آنکھ گرد و پیش میں جنت ہی جنت دیکھتی ہے اور دل داغ مرحوم

شیریں بیان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مسرت و شکر کے ساتھ یہ صدا لگاتا ہے :

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

سوالات

۱ - انسان تکلیفوں سے گبھرا کر دنیا کو برا کہنے لگتا ہے - کیا ایسا کرنا مناسب ہے ؟ اگر نہیں تو اسے کیا کرنا چاہیے -

۲ - خدا نے انسان کو عقل کی دولت سے نوازا ہے - عقل سے انسان اپنے لیے کیا کیا آسائشیں پیدا کرتا ہے ؟

۳ - مصنف لکھتا ہے - ''لاکھوں دولتوں کی ایک دولت قناعت ہے'' اس کی تشریح کیجیے -

۴ - خدا نے کیا چیزیں بنائی ہیں - جو دن رات انسان کی خدمت میں مصروف ہیں ؟

——— : ٥ : ———

مولانا غلام رسول مہر

(۱۸۹۵ - ۱۹۷۱)

غلام رسول مہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مشن ہائی سکول جالندھر سے میٹرک کیا ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں "زمیندار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں مولانا عبدالمجید سالک کے ساتھ مل کر "انقلاب" اخبار جاری کیا۔

مولانا ایک اعلیٰ درجے کے صحافی، بلند پایہ محقق اور مورخ تھے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں "سید احمد شہید اور ان کی تحریک" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے مرتب کردہ خطوط غالب کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم جنگ آزادی کے بعد

جنگ آزادی جسے غیر ملکیوں کے دور اقتدار میں غدر کے نام سے شہرت دی گئی بجائے خود ہمارے برعظیم کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ نہ تھی لیکن نتائج و عواقب کے اعتبار سے اس جنگ کو ہماری تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ اجنبی اقتدار کی زنجیروں کو ٹکڑے کر ڈالنے کی ایک نہایت پر خلوص کوشش تھی۔ اگرچہ بعض اتفاقی حوادث و سوانح کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس لیے بھی کہ جنگ کے نتیجے میں ہمارے تمدن، ہماری

سیاست ، ہماری ثقافت ، ہمارے مذہبی رجحانات ، اخلاق و عادات اور زندگی کے تمام دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑا ، میں اپنی بات چیت صرف مذہبی رجحانات تک محدود رکھوں گا ۔

غیر ملکی اقتدار کی توسیع کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو خطرے پیدا ہوئے ان میں سے تین خطرے جنگ آزادی کے بعد نہایت خوفناک شکل میں سامنے آ چکے تھے ۔ ایک طرف مسیحی مشنری تھے جن کے حملے سب سے بڑھ کر اسلام پر ہو رہے تھے ۔ اولاً اس لیے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں پر سخت ضرب لگ چکی تھی ان کا برائے نام اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا اور وہ انگریز حاکموں کے نزدیک معتوب ہونے کے باعث پریشان حال تھے ۔ اس حالت میں ان کے مذہب کو ہدف بنا لینا مشنریوں کو سہل بھی نظر آیا اور نتیجہ خیز بھی ۔ ثانیاً بعض مشنری سمجھتے تھے کہ اگر وہ معاذ اللہ عالم اسلام کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر کوئی دوسرا مذہب ان کے مقابلے پر اڑ نہ سکے گا تیسرے انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار چھینا تھا ۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمان ہی ان کے خلاف اٹھنے کی ہمت رکھتے ہیں ۔ لہٰذا مسلمانوں کی سیاسی شکست کو مکمل و فیصلہ کن بنانے کے خیال سے ان کے مذہب پر اعتراضات کا سیل بنا دیا گیا ۔ مشنریوں کی ان کوششوں کے خلاف متعدد مذہبی عالموں نے مردانگی سے جہاد کا سرو سامان کیا جن میں مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانی مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) اور ڈاکٹر وزیر خاں مرحوم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ سر سید مرحوم و مغفور نے اس سیل کی روک تھام اور اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لیے جو مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ان کا سرسری ذکر میں آگے چل کر کروں گا ۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا

تھا ۔ طبعاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نہایت سخت ملال تھا اور انگریز چونکہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ہی سے خائف تھے اس لیے نظم و نسق ملک میں ان پر اعتماد کے لیے تیار نہ تھے ۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا ۔ اس لیے انگریزوں کو یقین ہو چکا تھا کہ مسلمان کبھی ان سے تعاون نہ کریں گے ۔ یوں ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں مسلمان نظم و نسق میں حصہ داری سے محروم ہو کر اس پستی میں گر جاتے جس میں ہزاروں سال سے اچھوت گرے ہوئے تھے ۔ تیسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہونے کے بعد انگریزی تعلیم جاری ہو گئی تھی اور روز بروز اس کا دائرہ پھیل رہا تھا ۔ مسلمان چاہتے بھی تو اس تعلیم سے بالکل بے تعلق نہ رہ سکتے تھے ۔ اگر وہ انگریزی تعلیم پاتے تو اندیشہ تھا ۔ کہ ان کے مذہبی معتقدات پر بہت بڑا اثر پڑے گا ۔ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ دور زوال میں مذہبی معتقدات بھی بڑی حد تک بگڑ چکے تھے ۔ صحیح دینی تعلیم کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا ۔ ان حالات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشنریوں کے لیے مسلمانوں میں اشاعت مسیحیت کا راستہ صاف ہو جاتا ۔

سر سید مرحوم وہ بزرگ تھے جنہیں تینوں خطروں کا پورا احساس ہوا اور ۵۷ء سے زندگی کے آخری سانس تک انھوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد یہی تھا کہ ان تینوں خطروں کا انسداد ہو یعنی مشنریوں کے اعتراضات کے محض الزامی جوابات پر قناعت نہ کر لی جائے بلکہ تحقیقی اور علمی جوابات دیے جائیں اور اس سلسلے میں اسلام کی برتری محکم حقائق کی بنا پر ثابت کی جائے ۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بے اعتمادی اور بدظنی کی جو خلیج حائل ہو

چکی تھی اسے پاٹا جائے تاکہ مسلمان اس سر زمین میں ایک معزز قوم کی حیثیت میں ملکی نظم و نسق کے حصہ دار بن سکیں ۔ ان کے لیے انگریزی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی اسلامیت نہ صرف محکم و پائیدار بن جائے بلکہ ان میں اسلام کی حقانیت و افضلیت کا سچا جذبہ اور جوش پیدا ہو جائے ۔ ان کو صرف رسمی اور موروثی حیثیت ہی میں مسلمان نہ سمجھا جائے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں پرجوش مسلمان بن جائیں ۔

مسلمان اگر انگریزی تعلیم سرکاری درسگاہوں یا مشن سکولوں اور کالجوں میں پاتے تو سخت خطرہ تھا کہ ان کے اسلامی عقائد پر اچھا اثر نہ پڑے گا لہٰذا سر سید نے اپنے زیر اہتمام ایک معیاری درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ فرمایا ۔ جہاں مسلمانوں کو بہتر مسلمان بنانے کا پختہ انتظام موجود ہو ۔ اس ادارے نے علی گڑھ کالج کی شکل اختیار کی اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ سر سید کی یہ سکیم بہ اعتبار نتائج بہت کامیاب ہوئی اور علی گڑھ کے نمونے پر مسلمانوں نے جا بجا جتنی درسگاہیں قائم کیں ان کی خدمات جلیلہ روز روشن کی طرح سب پر آشکار ہیں ۔ اس سلسلے میں سر سید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پائیں ان کے سامنے مذہب کو نئی عقلیت کے نقطہ نگاہ سے معقول طریق پر پیش کیا جائے ۔ پیش نظر موضوع اس امر کا متحمل نہیں کہ سر سید مرحوم کی تفسیر پر مخالف و موافق بحثوں کا جائزہ لیا جائے ۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ سر سید نے اس سلسلے میں جو قدم اٹھایا وہ ان کے اختیار کردہ مسلک کا ایک لازمی حصہ تھا ۔ جن اصحاب کو بعض مسائل و امور میں ان سے اختلاف رہا وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ سر سید نے ایک نہایت ضروری اور اہم کام انجام دیا اور اس کے فوائد مضرتوں سے یقیناً زیادہ تھے ۔

علی گڑھ کالج کے خواب کو جامۂ عمل پہنانے سے پیشتر سر سید نے بائبل کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی ۔ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق وہ "عہد عتیق" سے "کتاب پیدائش" کے گیارھویں باب تک پہنچے تھے اور اسلوب یہ اختیار کیا تھا کہ بائبل کے جو بیانات قرآن مجید کے مطابق تھے ان کی توضیح کرتے ۔ جہاں اختلاف نظر آتا اس کی وجہ بیان فرماتے اور اسلام کی محکمیت ثابت کرتے ۔ اس کوشش کا مقصد بھی یہی تھا کہ اختلاف کے بجائے موافقات سامنے آئیں اوز انھیں پر توجہ مرتکز ہو ۔ اجنبیت کی خلیج کو پاٹنے کی یہ ایک شکل تھی ۔ اس سے ہمارے الہامی مذاہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پڑی ۔ یہ سلسلہ دینی مقاصد کی پیش برد کے لیے بے حد مفید تھا علمائے کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا ۔ جو ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روا دار نہ ہوا ۔ انھوں نے جا بجا خالص دینی درسگاہیں قائم کیں تاکہ مسلمانوں میں دینی حمیت کو زندہ رکھیں اور ان کے لیے ان سے استفادے کے مواقع بہم پہنچائیں جو دین کے حقیقی سر چشمے تھے اور زوال کے بعد ان کے بہرہ مندی کے مواقع بڑی حد تک ختم ہو چکے تھے اس سلسلے میں بہت سی درسگاہوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو اس برعظیم کے طول و عرض میں جا بجا قائم ہوئیں اور اب تک موجود ہیں اس سلسلے کی جس درسگاہ نے سب سے بڑھ کر شہرت پائی وہ دیوبند کی درسگاہ تھی اس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی نے رکھی یہ بالکل معمولی سرو سامان کے ساتھ شروع ہوئی تھی لیکن بانیوں کے اخلاص اور حب اسلام کی بدولت اس برعظیم کی نہایت اہم دینی درسگاہ بن گئی ۔ حضرت مولانا محمد قاسم، دین اسلام پر مخالفوں کی نکتہ چینیوں کے جوابات دیتے رہے خواہ وہ نکتہ چینیاں مشنریوں کی طرف سے ہوں یا دوسرے مذاہب کے پیروؤں

کی طرف سے ۔ اس سلسلے میں ان کے خطبات اور تقریریں ادب اسلامیہ کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں ۔

علیگڑھ اور دیو بند بظاہر دو قسم کی درسگاہیں تھیں لیکن ان دونوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی ، علمی و سیاسی اور اخلاق و ثقافتی میراث کو بہتر سے بہتر طریق پر محفوظ رکھنے کی جو کوششیں کیں ان کی مشکوریت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے ۔ جو مسلمان ۱۸۵۷ میں بہ ظاہر اپنا سب کچھ کھو چکے تھے ، وہ تھوڑی ہی مدت میں سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ۔ اور مجاہد قوم بن گئے ۔ جزوی یا بعض معاملات میں ناکامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن سے کسی قوم کو بھی زندگی کے مختلف مراحل میں مفر نہیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جن مسلمانوں کے متعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سمجھا جا چکا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکے ہیں وہ نہ صرف اٹھے بلکہ اس وسیع سر زمین کی تقدیر میں نہایت اہم وظیفہ بجا لانے کے قابل بن گئے ۔ حالانکہ انھیں کسی دائرے میں وہ وسائل مہیا نہ رہے تھے جو اس ملک میں ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک قومی میراث بنے رہے ۔

ان دینی اور قومی مجاہدوں کی فہرست بہت طویل ہے ۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کا خونیں دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ نتائج سے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے لیکن نہ اسلام کے ایمان کی پختگی میں فرق آیا نہ ان کے قدم ہمت میں لغزش پیدا ہوئی ۔ نہ ان کی غیرت و حمیت کی حرارت میں افسردگی آئی ۔ نہ وسائل کا فقدان ان کا دامن گیر ہو سکا ۔ وہ اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے اٹھے اور انھوں نے عمل کے جو راستے ہموار کر دیے تھے ان پر چلنے کے لیے پوری قوم میں بے پناہ جوش پیدا کر دیا ۔ انھیں بزرگوں کے پر خلوص کارناموں کی برکت تھی کہ مسلمانوں نے حقیقی مذہبی میراث کے تحفظ کو اپنا

نصب العین بنایا ۔ باقی رہا یہ امر کہ ہم اس میراث کی عظمت و جلالت کو بحال رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔ یا کامیاب ہوں گے تو اس بارے میں فیصلے کا علم حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے ۔

سوالات

1 ۔ جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمانوں کے لیے تین سب سے بڑے خطرے کون سے تھے ۔

2 ۔ سر سید مرحوم نے ان خطروں کا انسداد کس طرح کیا ؟

3 دیو بند کی درسگاہ کے قیام کا مقصد کیا تھا ؟

4 ۔ سر سید نے علی گڑھ کالج کس مقصد سے قائم کیا اور اس کالج نے مسلمانوں کی کیا خدمت کی ؟

5 ۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھئے ۔
زوال ۔ سہل ۔ سرسری ۔ اجنبی ۔ حال ۔ مضرت ۔

6 ۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھئے ۔
عواقب ۔ اختلافات ۔ خدمات ۔ موافقات ۔ خطبات ۔ مراحل ۔ وسائل ۔

7 ۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے ۔
بدظنی ۔ افضلیت ۔ سرسری ۔ اخلاص ۔ انسداد ۔ متحمل ۔ مرکز استفادہ ۔

8 ۔ خونیں کا کلمہ خون سے بنا ہے ۔ یعنی خون کے یں کا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ یہ صفت ہے ۔ اسی قسم کی اور صفات تلاش کریں جو اسی طریقے پر بنائی گئی ہوں ۔

9 ۔ خلیج جغرافیے کی اصطلاح ہے ۔ لیکن اس سبق میں خلیج کا کلمہ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ۔ اسی انداز کی پانچ مثالیں لکھیے جن میں کوئی کلمہ اپنے اصلی معنوں سے ہٹ کر استعمال ہوا ہو ۔

مولانا شبلی نعمانی

(۱۸۵۷-۱۹۱۳)

مولانا شبلی نعمانی ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں پیدا ہوئے ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے - مولانا شبلی نے انیس برس کی عمر میں وکالت کا امتحان پاس کیا - مگر اس پیشے میں ان کا دل نہ لگا - کچھ عرصہ علی گڑھ میں پروفیسر رہے اس کے بعد ندوۃ العلماء قائم کیا - پھر دارالمصنفین کی بنیاد رکھی اور ساری زندگی تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے -

مولانا شبلی نعمانی سرسید کے ساتھیوں میں سے تھے اور قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، انہوں نے زیادہ تر تنقیدی اور تاریخی موضوعات پر لکھا ہے - ان کی تاریخی کتابوں میں "سیرت النبی ؐ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ سیرت رسول اکرم ؐ کے موضوع پر اردو میں اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے - جو بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہیں، یہ کتاب جہاں تاریخی واقعات کے اعتبار سے مستند ہے وہاں اس میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی پوری طرح موجود ہیں - مولانا شبلی کا یہ کمال ہے کہ وہ خشک مضامین کو بھی دلچسپ بنا دیتے ہیں - مولانا کی تحریروں میں متانت، جوش اور شگفتگی پائی جاتی ہے - "دعوت حق" "سیرت النبی" کی پہلی جلد سے لیا گیا ہے - اس میں اشاعت اسلام کے اولین دور کا تذکرہ ایسے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے - کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے -

دعوت حق

تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت راز داری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا (فاصدع بما تؤمر) اور تجھ کو حکم دیا گیا ہے واشگاف کر دے، اور نیز حکم آیا (وانذر عشیرتک الاقربین) "اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا"

آنحضرت نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا (یا معشر قریش) "اے گروہ قریش" لوگ جمع ہوئے، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا، سب نے کہا ہاں! کیونکہ تم کو ہمیشہ سے سچ بولتے دیکھا ہے آپ نے فرمایا "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا" یہ سن کر سب لوگ، جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا، سخت برہم ہو کر چلے گئے۔

چند روز بعد آپ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو، یہ[1] در اصل تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابوطالب، عباس، سب شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بار گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا"۔

۱- یعنی پہلی وار وحی نازل ہونے کے بعد

تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعۃً حضرت علی ؑ نے اٹھ کر کہا گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نو عمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ قریش کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک تیرہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ لیکن آگے چل کر زمانے نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت تیار ہو گئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی۔ اس لیے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ گھر میں تھے۔ ان کو خبر ہوئی۔ دوڑے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی اعلانیہ مذمت شروع کی۔ تو قریش کے چند معززوں نے ابوطالب سے آ کے شکایت کی، ابوطالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن کیونکہ بنائے نزاع قائم تھی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی اس میں تمام رؤسائے قریش شریک تھے ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔

ہمارے آباء و اجداد کو گمراہ کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے۔ قریش اب تحمل نہیں کر سکتے۔ اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا کہ جان عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر رکھ دیں۔ تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ یا خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔ آپ کی پر اثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا، جا کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بدستور دعوت اسلام میں مصروف رہے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے۔ بد زبانیاں کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے عتبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جاں باری کا مقصد جاہ و دولت اور

نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے ، قریش نے بھی یہی خیال کیا ۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ ، قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آیا ۔ اور کہا محمدؐ کیا چاہتے ہو ؟ کیا مکے کی ریاست ؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی ؟ کیا دولت کا ذخیرہ ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں ۔ اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارے زیر فرمان ہو جائے ، لیکن ان باتوں سے باز آ جاؤ ۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا ۔ لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں ..... عتبہ واپس گیا تو عتبہ نہ تھا ۔ اس نے قریش سے کہ دیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں ، وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو ۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا ۔ لیکن قریش نے یہ رائے نا منظور کی ۔

سوالات

1 ۔ آنحضرت کو خاتم النبین کیوں کہتے ہیں ؟

2 ۔ کتنی مدت تک تبلیغ کا کام راز داری سے ہوا ؟

3 ۔ آپ نے تبلیغ کے لئے سب سے پہلے کون سی جگہ پسند کی ؟

4 ۔ تبلیغ کے موقع پر آپ نے لوگوں سے کیا کہا ؟

5 ۔ جب خاندان عبدالمطلب کو دعوت حق دی گئی تو سب سے پہلے کس نے آپ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا ؟

6 ۔ اسلام کی راہ میں پہلا خون کس نے دیا ؟

7 ۔ عتبہ نے قریش سے جا کر کیا کہا ؟

8 - مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کو اپنے فقروں میں استعمال کیجئے ۔

اکتفا - تدریج - ہمہ تن - ماہر نفسیات - صائب الرائے - مزاحم - واشگاف - سراپا - پائے ثبات - لغزش - غم - نجاست -

9 - مندرجہ ذیل کے متضاد الفاظ لکھیئے

صدق - غالب - عزت - فنا شہید -

10 - جمع کے واحد اور واحد کی جمع لکھیئے -

کفار - تدبیر - فرض - مجلس - حرم - ذخیرہ - ترغیبات - ماہر - ارباب - انساب - شہید - حرکات - اوصاف - معززین - موقعہ -

11 - اعراب لگائیے -

نبوت - منور - سناٹا - مذمت - لغزش - اذیتیں - متحیر - تحمل -

کرنل محمد خاں

(ولادت ۱۹۲۰)

کرنل محمد خاں ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں فوج میں ملازم ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں کافی مدت تک مشرق اوسط میں رہے۔

کرنل محمد خان اردو کے صاحب طرز مزاح نگار ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ چیزوں کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھتے ہیں۔ اور اپنے مشاہدے کو ایسے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہ اردو کے مزاحیہ ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

قدر ایاز

کرنیلوں کو رہنے کے لئے اکثر عمدہ 'سی' کلاس بنگلے ملتے ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک ایسا بنگلا مل گیا جو اپنی کلاس میں بھی انتخاب تھا۔ یعنی مجھے کرنیلوں میں وہ امتیاز حاصل نہ تھا جو میرے بنگلے کو بنگلوں میں تھا۔ بوڑھے بیروں کی روایت تھی کہ ولسن روڈ کا یہ لاشریک بنگلا ولسن صاحب نے خاص طور پر اپنے لئے بنوایا تھا۔ یعنی موصوف نے اس کی تعمیر میں چھاؤنی کے کچھ دوسرے بنگلوں کا خون بھی شامل کر دیا تھا کئی انگریزوں کی انگریزی ہمارے ملک میں رہ کر کمزور ہو گئی تھی۔

یہ بنگلہ کم و بیش دو ایکڑ قطعہ زمین پر واقع تھا۔ یعنی قسام ازل ہی نے اسے خاصا شاہانہ طول و عرض بخشا تھا۔ عمارت کے سامنے وسیع چمن تھا۔ جس کے حاشیے پر مہندی کی گھری سبز باڑ کے سر پر نیزوں اونچے سرو اور سفیدے کے پیڑ تھے۔ چمن میں جا بجا سرخ وسپید گلاب کے پودے جن کے پھولوں میں گمنام مالیوں اور میموں کی پرورش اور پیار کا رنگ جھلکتا تھا۔ بنگلے کے دونوں پہلو بھی گلزار تھے اور پائیں باغ تو ایک نہایت ہی دلربا سی سیر گاہ تھی جس کی وسعت میں ہمارے فرنگی پیشہ اپنی میموں کی کمر میں بازو ڈالے گشت کیا کرتے تھے۔ عمارت کے اندر بیٹھنے، کھانے اور مطالعہ کے علاوہ چار سونے کے کمرے تھے۔ اور ہر خواب گاہ کے ساتھ احتراماً ڈرائنگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان چھوٹے کمروں کا ایک انداز تکبر بھی تھا۔ کہ ان میں دوسری اشیأ کے علاوہ قدآدم آئینے اور بجلی کے سرکاری حمام بھی لگے ہوئے تھے۔ جو ہر غسل خانے کا نصیب نہیں۔

الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے امیرانہ تھا مقابلے میں ہمارے اثاثے کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے، تاہم اپنے مکان کی شان کے پیش نظر ہم نے جوں توں کرکے ہر کمرے کے لئے ایک قالین یا دری پیدا کرلی۔ اگرچہ اس کار خیر کا بیشتر حصہ مقامی کباڑیے کو ملا۔

علاوہ ازیں مناسب فرنیچر بھی حاصل کرلیا۔ کچھ اپنا کچھ ایم۔ ای۔ ایس کا۔ کھانے کے کمرے میں کرائے کا ریفریجیٹر بھی رکھ دیا جو خریدے ہوئے ریفریجیٹر سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھا۔ سوائے اس کے ضعف پیری سے اس کا ذوق برودت کسی قدر سست ہو گیا بہر حال یہ ہمارے ریفریجیٹر کا اندرونی معاملہ

تھا ۔ ہمارے گول کمرے میں لیفشی کے زمانے کا ریڈیو تو تھا جو نئے ریشمی غلاف میں اچھا خاصا کم عمر نظر آتا تھا ۔ شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا ۔ کہ قسطوں پر خریدا گیا ہے ۔ الغرض ہمیں نہیں تو ہمارے سننے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک آور احساس ہوتا تھا ۔ بلکہ ہمارے بچوں نے بھی اس مصنوعی فارغ البالی کی مرصع جالی کے پیچھے کبھی نہ جھانکا تھا ۔ اور جالی کے فرنٹ ویو پر ناز کرنے میں حق بجانب تھے اور کرتے تھے ۔

سلیم میاں جو ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے ۔ دوسرے کرنیل زادوں کی طرح اور ان کے ہمراہ دن بھر بے فکری سے بیڈمنٹن کھیلتے تھے اور شام ہی سے دوستوں کے ساتھ ٹیلی ویژن کے سامنے جم جاتے ۔ کیا مجال جو کوئی غیر اس مشاہدے میں مخل یا شریک ہو ۔ سوائے اس کے کہ ہمارا بوڑھا ملازم علی بخش ان کی تواضع کے لیے کمرے میں خاموشی سے داخل اور خارج ہوتا رہتا ۔ علی بخش کو یوں بھی سلیم سے انس تھا ۔ کہ سلیم اسی کے ہاتھوں پلا تھا ۔ ایک دن میں اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا تھا ۔ کہ علی بخش خلاف معمول رونی صورت بنائے داخل ہوا ۔ وجہ گرانی پوچھی تو بولا سلیم صاحب نے ڈانٹا ہے ۔ کہتے ہیں بدتمیز ہو ، گنوار ہو دیہاتی ہو ، میں نے ارشادات کی شان نزول پوچھی تو بولا : کل سلیم میاں کی غیر حاضری میں ان کے ایک نئے دوست امجد صاحب آئے اور باہر برآمدے ہی میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے ۔ میں نے ان کے کہنے پر انہیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا کافی دیر سلیم کا انتظار کرتے رہے لیکن آخر مایوس ہو کر چل دیے ۔ بعد میں سلیم صاحب کو بتایا تو

برس پڑے کہنے لگے ، انہیں گول کمرے میں صوفے پر کیوں نہیں بٹھایا ؟ ریفریجیٹر سے نکال کر کوکا کولا کیوں نہ پیش کیا اب امجد سمجھے گا کہ ان لوگوں کو تواضع کا سلیقہ نہیں دیہاتی ہیں ۔ جنگلی ہیں ۔ اور پھر جو منہ میں آیا کہہ دیا ۔

علی بخش کی داستان غم ختم ہوئی تو سلیم میاں بھی آ گئے ۔ علی بخش کے چہرے پر شکایت لکھی ہوئی دیکھی ۔ تو اپنے دل پر لکھی ہوئی شکایت بیان کرنے لگے ۔ ہم نے یہ قصہ بھی سنا ۔ طرفین کے بیانوں سے واضح تھا کہ تنازعہ خفیف ہے اور یہ کہ اس دو طرفہ طوفان کا حدود اربعہ ایک چائے کی پیالی میں سما سکتا ہے ۔ علی بخش اس لئے ناخوش تھا کہ اسے دیہاتی کہا گیا ہے ۔ اور سیلم میاں اس بات پر برہم تھے ۔ کہ علی بخش کی غلطی کی وجہ سے امجد نے انہیں دیہاتی سمجھا ہو گا ۔ ہمارے نزدیک دیہاتی ہونا یا سمجھا جانا ایسی قباحت نہ تھی ۔ چنانچہ ہم نے ہنسی ہنسی میں دیہاتی پن کے فضائل بیان کرنا شروع کیئے اور اس بلاغت کے ساتھ کہ سیلم اور علی بخش مسکرا دیے اور باہم راضی ہوگئے ۔ باتوں باتوں میں ہم انہیں ایک دیہاتی قصہ سنانے لگے ۔ ایک تھا دیہاتی لڑکا جو اپنے گاؤں سے پرائمری سکول میں پہلی جماعیت پاس کرنے کے بعد ایک شہر کے ہائی سکول میں جا داخل ہوا ۔ اپنے ماسٹر جی اسے چھوٹا چودھری بھی مذاقاً کہتے تھے ۔ لیکن چودھری کی توقع تھی ۔ کہ ماسٹرجی مذاق کو مذاق کی حد تک رکھیں گے ۔ مگر آج وہ حد پھلانگ کر اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے تھے تو چودھری کو میزبانی کے بغیر چارہ نہ تھا ۔

یہ نہیں کہ چھوٹا چودھری یا اس کے گھر والے مہمان نواز نہ تھے انہیں صرف اس بات کا یقین نہ تھا ۔ کہ ماسٹرجی کو ان

کی مہمان نوازی موافق بھی آئے گی یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنی تو اضع کی ابتدا کی۔ چھوٹا چودھری اور اس کا بڑا بھائی ماسٹرجی کو بعد تعظیم اپنی چوپال میں لے گئے۔ چوپال کے دو حصے تھے۔ ایک میں گھوڑی بندھی تھی۔ دوسرے کے عین مرکز میں آتشدان تھا۔ جس کی آگ سے شعلے اور دھواں بیک وقت بلند ہو کر چوپال میں روشنی اور تاریکی پھیلا رہے تھے۔ آتشدان کے اردگرد خشک گھاس کا نرم اور گرم فرش تھا۔ جسے مقامی بولی میں ستھر کہتے تھے۔ گاؤں کے بیس بائیس آدمی ستھر پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ماسٹرجی داخل ہوئے تو سب کھڑے ہو گئے۔ ماسٹرجی کو "آؤجی خیرنال" کہا۔ ہر ایک نے ان سے مصافحہ کیا۔ ہر ایک نے بال بچوں کی خیریت پوچھی ماسٹرجی نے چھوٹتے ہی ذرا شرما کر کہ دیا کہ ابھی بال بچوں تک نوبت نہیں آئی۔ لیکن ان نو مولود برخورداروں کی خیریت بہرحال ہر ملاقاتی نے پوچھی۔ یہی ان کی تواضع کی ترکیب تھی۔ چونکہ ماسٹر جی نے پتلون پہن رکھی تھی۔ لہذا فرش پر بٹھانے کے بجائے ان کے لئے رنگیلی چارپائی بچھادی۔

سیلم حیران ہو کر بولے"۔ ابا جان ان میں اتنی عقل نہیں تھی کہ ان کو کرسی دے دیتے"؟

جس نے کہا بیٹا عقل تو تھی کرسی نہ تھی۔"

سیلم نے فیصلہ کن انداز میں کہا "۔ اگر کرسی نہ تھی۔" تو چودھری کس بات کے تھے"۔

میں نے کہا ایک تو وہ چودھری ذرا چھوٹی قسم کے تھے۔

دوسرے گاؤں میں چودھری پن کی نمائش کرسیوں سے نہیں کی جاتی۔ سیلم دیہاتیوں کی کوئی غلطی، یا کمزوری پکڑنے پر

تلا ہوا تھا۔ بولا۔ مگر کوئی گول کمرے میں بھی گھوڑی باندھتا ہے؟

میں نے سیلم کو سمجھایا۔ اگر گھوڑی کے لئے کوئی علیٰحدہ مستطیل کمرہ نہ ہو تو پھر گول کمرے ہی میں رہتی ہے۔ علاوہ ازیں گاؤں کے کمرے اتنے گول بھی نہیں ہوتے۔

سیلم طنز کو پا گیا اور بولا۔ ''گول کمرہ تو ویسے نام پڑ گیا ہے۔ ہمارا اپنا گول کمرہ بھی تو چوکور ہے۔ مگر بات یہ ہے۔ کہ ڈرائنگ روم میں گھوڑے گدھے کا کیا کام؟''

میں نے ہنس کر کہا۔'' بیٹا دیہاتی لوگ اتنے مہذب نہیں ہوتے کہ ڈرائنگ روم میں کتے لے آئیں۔ وہ گھوڑوں ہی سے گزارہ کر لیتے ہیں'' ۔ علی بخش مسکرایا۔ سیلم کسی قدر چکرایا لیکن کہانی بہر حال اشتیاق سے سن رہا تھا۔ بولا'' پھر کیا ہوا؟''

''پھر گاؤں کا نائی ان کے پیر دبانے لگا۔ ایک نوکر دوڑ گیا کہ ماسٹرجی کے لئے تازہ مکئی کے بھٹے بھنوا کر لائے۔''

سیلم جھٹ بول اٹھے'' آبا جان مکئی کے بھٹے تو پک نک پر کھائے جاتے ہیں۔ گھر میں تو چائے پلائی جاتی ہے۔ وہ لوگ اتنی بات بھی نہ جانتے تھے''۔

میں نے کہا۔'' گھر میں پک نک منانے کی غلطی دیہاتیوں سے اکثر ہو جاتی ہے۔ بہرحال ماسٹرجی نے خود ان کی اصلاح کر دی اور بھٹے کا نام لے کر کہنے لگے۔ یہ تکلیف نہ کریں۔ ہو سکے تو ایک پیالی چائے پلا دیں۔ ذرا سردی بھی ہے۔''

سیلم نے فوری تائید کی ''۔ بات'' بڑی ٹھیک تھی۔ وقت جو چائے کا تھا'' میں نے کہا۔ بات ٹھیک تھی۔ بشرطیکہ ان کے گھر چائے بھی ہوتی۔''

اس مقام پر سلیم میاں تیزی سے سوال کرنے لگے اور ہماری کہانی نے مکالمے کی شکل اختیار کر لی - چنانچہ فوراً بولے -

تو کیا ان کے گھر میں چائے ختم ہو گئی تھی ؟

نہیں بیٹا کبھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی - ان دنوں چائے دیہات میں نہیں پہنچی تھی -

"تو کیا انہوں نے مہمان سے صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس چائے نہیں ہے - کتنی شرم کی بات ہے"؟

میں نے کہا - " بھئی میرے خیال میں پہلے تو گھر میں چائے کا نہ ہونا شرم کی بات نہیں - دوسرے انہوں نے مہمان کی خاطر چائے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور آخر مقامی حکیم کے گھر سے تھوڑی سی چائے مل گئی - ان دنوں چائے صرف مریضوں کو پلائی جاتی تھی ،، سلیم نے لمبا سانس لیا اور بولا - "چلو شکر ہے - چائے تو ملی" - میں نے کہا - "یہاں چائے مل گئی لیکن پھر ایک عجیب سا سوال پیدا ہو گیا" -

" یہی نہ کہ چائے کے ساتھ کھانے کو کیا دیا جائے ؟ وہاں تو لے دے کے مکئی کے بھٹے ہی تھے - ،،

"نہیں بیٹے یہ بات نہ تھی - سوال ذرا بنیادی نوعیت کا تھا - وہ یہ کہ چائے کیسے بنائی جاتی" ؟

"سلیم نیم وحشت کے عالم میں میرا منہ تکنے لگا اور بولا - ابا جان چائے تو آپ کا جمعدار بھی بنا سکتا ہے - اور دن بھر پیتا رہتا ہے - کیا وہ اتنے ہی اناڑی تھے -

میں نے کہا بھئی وہاں چائے پینے پلانے کا ہنر پنہچا ہی نہ تھا - وہاں لسی کا رواج تھا اور اس ہنر میں وہ یکتا تھے ،، -

"تو کیا ماسٹر جی کو آخر لسی پلا دی،، ؟

" نہیں ، پلائی تو چائے ہی ، لیکن وہ ایسی کامیاب چائے نہ تھی،، ۔

"یعنی چائے کی لسی بنادی ؟ ،،

"ہاں بیٹا کچھ ایسا ہی ذائقہ ہو گا ۔ چھوٹے چودھری کا کہنا ہے کہ ماسٹر جی نے ایک گھونٹ پیا اور پیالی رکھ دی" ۔

"تو چودھری شرم سے غرق نہ ہو گیا ،،

"نہیں ایسا حادثہ تو نہ ہوا البتہ چودھری کو اس بات کا رنج بہت ہوا کو ماسٹر جی کی فرمائش پوری نہ کی جاسکی بہر حال انہوں نے کچھ تلافی رات کے کھانے پر مرغ کے سالن سے کر دی"۔

سلیم نے کسی قدر شرارتاً کہا ابا جان سالن کھانے کے بعد ماسٹر جی کی صحت پر کوئی فوری اثر نہ پڑا ،، ؟

میں نے کہا ۔ "ہاں بڑا صحت افزا اثر پڑا ماسٹر جی نے پیٹ بھر کر کھایا اور ان کے چہرے پر رونق آ گئی ،، ۔

"پھر ؟" "ماسٹر جی کے لئے بستر لگا دیا گیا چودھری نے ان کے لئے اکلوتی ریشمی رضائی نکلوائی اور سفید جھالر والا تکیہ بھی جس کے غلاف پر بارہ سنگھے کی تصویر کڑھی ہوئی تھی ۔ بے شک تکیے میں لچک کی نسبت اکڑ زیادہ تھی اور ماسٹر جی کو اسے سر کے نیچے فٹ کرنے میں کچھ دقت پیش آئی ۔ لیکن آرام سے سو گئے ۔ صرف ایک مرتبہ آدھی رات کے قریب گھوڑی کے کھانسنے سے ذرا انگریزی میں بڑ بڑا کر جاگ اٹھے ۔ لیکن برابر ہی چودھری اور اس کا نوکر سو رہے تھے ۔ انہوں نے گھوڑی کو چارہ اور ماسٹر جی کو دلاسا دیا ۔ اور پھر صبح تک کوئی قابل ذکر واقع نہ ہوا " ۔

" ابا جان صبح ہوتے ہی ماسٹر جی تو بھاگ نکلے ہوں گے؟ "
" نہیں تو ۔ وہ اطمینان سے جاگے ، پہلے انہیں ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرائی گئی ۔ پھر انہوں نے غسل کیا " ۔

"غسل بھی بیٹھک ہی میں کیا ہو گا " " نہیں بیٹا بیٹھک میں نہیں مسجد میں ۔ "

"مسجد میں ؟" سلیم نے حیرت سے کہا ، ''خانۂ خدا کو غسل خانہ بنا دیا " ؟"بھئی گاؤں میں اکثر لوگ مسجد کے غسل خانوں میں نہاتے ہیں اور بظاہر اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں - دیہاتی گھروں میں ہر کام کے لیے علیحدہ خانے کم ہی ہوتے ہیں"۔ سلیم کان پر ہاتھ رکھ کر بولے ۔ "خدا اس دیہاتی زندگی سے بچائے ابا جان اچھا ہوا آپ فوج میں آ گئے ۔ ورنہ ہم بھی چھوٹے چودھری کی طرح مویشیوں کے ساتھ سو رہے ہوتے اور مسجد میں جا کر نہاتے " ۔ ''لیکن چھوٹا چودھری اس زندگی سے بھی نا خوش نہ تھا"۔"ابا جان ۔ اس نے کبھی کوئی بنگلہ اندر سے دیکھا تھا"۔ میرا خیال ہے ۔ نہیں ؟ تو پھر وہ نا خوش کس بات سے ہوتا ۔ انگریزی کہاوت ہے ۔ کہ لاعلمی بھی نعمت ہے " ۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے سلیم میاں یہ کہاوتیں تازہ تازہ یاد کی تھیں ۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ۔ " کہاوت تو تمہاری ٹھیک ہی کہتی ہے" ۔ "مگر ابا جان بے چارے ماسٹر جی کا کیا بنا " ؟ "بنا یہ کہ ماسٹر جی نے غسل کے بعد ناشتہ کیا اور پھر رخصت ہو گئے ۔" "ناشتہ ؟ چوھردی کے گھر کارن فلیک تھے؟ " " کارن فلیک تو نہ تھے، البتہ جو کچھ دال دلیا تھا ۔ غریب نے حاضر کر دیا ،، ۔ "ابا جان اس کے بعد چھوٹا چودھری تو اسکول میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا ہو گا"۔ "نہیں بیٹا اسکول تو وہ اسی منہ کے

ساتھ گیا اور شہری لڑکوں نے اس سے مذاق بھی کیا مگر وہ مگن رہا" - "چوہدری کی جگہ میں ہوتا تو شرم سے مر جاتا" - "مگر چودھری تو جیتا رہا بلکہ خاموشی سے پڑھتا بھی رہا - اور آخر کار میٹرک پاس کرکے لاہور کالج میں چلا گیا"۔"وہ کالج میں بھی گیا ؟ کیا ان کے پاس اتنے پیسے تھے" ؟ "پیسے تو کم ہی تھے - مگر انہوں نے تھوڑی سی زمین بیچ دی" -

مگر تھوڑی سی زمین سے کیا بنتا ہے - کالج میں وہ کر کھانا ہوتا ہے - کچھ پہننا ہوتا ہے۔ کیا وہ مکئی بھٹے کھاتا تھا ؟ کیا وہ تہمد باندھتا تھا" ؟

" بس گزارا کر لیتا تھا" "گزارا ہی کرتا رہا یا کچھ پڑھ بھی گیا" ؟

"یہاں کچھ پڑھ بھی گیا -" " پھر " - ؟

"پھر جیسا ان لوگوں کا دستور تھا - فوج میں بھی بھرتی ہو گیا - "

"پھر تو آپ اسے جانتے ہوں گے - کیا وہ آپ کے ماتحت کام کرتا ہے" ؟

ماتحت تو نہیں مگر جانتا ضرور ہوں" - " ابا جان اسے بلائیں نا کبھی - ہم چھوٹے چودھری کو دیکھیں گے"۔

"دیکھیں گے ؟ وہ کوئی تماشا تو نہیں - سلیم میاں" -

"ابا جان بلائیے نا چھوٹے چودھری کو - ہم بالکل کچھ نہیں کہیں گے" -

"سچ" ؟

"پھر آؤ ملو اس سے" اور یہ کہ میں نے سلیم کی طرف بازو پھیلا دیئے۔ سلیم ایک لمحے کے لئے مبہوت کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر یہ کہ مجھ سے لپٹ گیا۔" ؟

"آپ ابا جان،، ؟

سلیم اور علی بخش دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک دیہاتی کے لئے، محبت کی چمک تھی ایاز اپنے اصل لباس میں بھی ایسا معیوب نظر نہ آتا تھا۔

سوالات

1 - مصنف کو کس قسم کا بنگلہ ملا تھا ؟

2 - علی نے سلیم کی کیا شکایت کی ؟

3 - نوکر نے سلیم کے دوست کی کس طرح خاطر کی ؟

4 - سلیم نے نوکر سے کیا کہا ؟

5 - ماسٹر صاحب کو چھوٹے چودھری نے کہاں ٹھہرایا ؟

6 - چودھری اپنی گھوڑی کہاں باندھتا تھا ؟

7 - سلیم کو جب یہ علم ہوا۔ کہ وہ چودھری اس کا باپ تھا۔
تو اس نے کیا محسوس کیا ؟

8 - فقروں میں استعمال کیجیے۔
قام ازل - ضعف پیری - وجہ گرانی - شان نزول

9 - اعراب لگائیے۔
برودت - خدا - مرصع - برہم - بلاغت - اثبات - خفیف -

مولانا محمّد حسین آزاد

(۱۸۳۵ء - ۱۹۱۰ء)

مولانا محمد حسین آزاد دلی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی محمد باقر سے حاصل کی - اس کے بعد دلی کالج میں داخل ہو گئے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ان کے والد کو بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی -

مولانا آزاد ترکِ وطن کر کے لاہور آ گئے - یہاں مختلف ملازمتیں کیں -

مولانا آزار شعر بھی کہتے تھے مگر ان کی اصل شہرت نثری کارناموں کی وجہ سے ہے - وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے- ان کی نثر میں شعر کا سا حسن ہے - انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں - جن میں دربارِ اکبری - قصص ہند اور آبِ حیات کو خاص مقام حاصل ہے سید انشاء کا انجام آبِ حیات ہی کا اقتباس ہے - سید انشاء ایک مشہور شاعر گزرے ہیں -

(۱)

سیّد انشاء کا انجام

نہایت افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ سعادت علی خان کے ہاتھوں سید انشاء کا انجام کچھ اچھا نہ ہوا - اس کے مختلف سبب ہیں - اول تو یہ کہ اگرچہ اپنی ہمہ رنگ طبیعت کے زور سے انھوں نے انھیں پرچا لیا تھا - مگر در حقیقت ان کے اور ان کے معاملے کا مصداق ان کا مطلع تھا -

"رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں
میں ہوں ہنسوڑ تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

مثلاً میلوں ٹھیلوں میں چلنے کے لیے کچھ احباب کا تقاضا ، کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضا ۔ غرض انھیں جانا ضرور اور یہ سعادت علی خاں کی طبیعت کے بالکل مخالف ۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں ۔ مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں ۔ اس میں ایک آدھا لطیفہ بھی ہو جاتا ہے انھوں نے عرض کی حضور ، غلام کو اجازت ہے ؟ وہ بولے کہ ہوں ! کہاں ؟ انھوں نے کہا کہ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے انھوں نے کہا لا حول ولا قوۃ ۔ سید انشاء بولے مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے ۔ نواب نے کہا انشاء ایسے ناروا مقاموں میں جانا تجھے کس نے بتایا ہے ؟ عرض کی حضور ! وہاں تو جانا ایک اعتبار سے فرض عین ہے ایک نظر سے واجب کفائی ہے ۔ ایک لحاظ سے سنت ہے ۔ پھر سب کی توجیہ الگ الگ بیان کی ۔ توجیہیں الگ الگ بیان کیں ۔ آخر اس عالم مصروفیت میں سنتے سنتے دق ہو کر نواب نے کہہ دیا قصہ مختصر کرو اور جلد سدھارو ۔ اس وقت مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے ! کون ہے آج سوا انشاء کے کہ جو کچھ ہے اسے عقل سے ، نقل سے آیت سے ، روایت سے ثابت کر دے ، ایسی باتیں بعض موقعوں پر نواب کو موجبِ تفریح ہوتی تھیں بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہو جاتے تھے ۔ خصوصاً جب کہ رخصت کے وقت خرچ مانگتے تھے ۔ کیونکہ یہ شاہ عالم نہ تھا ۔ سعادت علی خاں تھا ۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست[1]
زر می طلبی سخن درین است

---

۱ ۔ اگر جاں طلب کرو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن بات تو یہ ہے کہ پیسے طلب کرتے ہو ۔

غضب یہ ہوا کہ ایک دن سرِ دربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے سعادت علی خاں نے کہا کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں ۔ اسے اتفاق تقدیر کہو یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو ، سید انشا بول اٹھے کہ حضور انجب ۔ سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے ، وہ چپ اور تمام دربار دَہم ہو گیا ۔ اگرچہ انھوں نے پھر اور باتیں بنا بنا کے بات کو مٹانا چاہا ۔ مگر کہاں تقدیر سے تیر نکل چکا تھا ۔ وہ کھٹک دل سے نہ نکلی ۔ وَلَدَ الجَارِیۃ انجب (لونڈی کا بیٹا عجب ہوتا ہے) نواب کے انداز بدلنے لگے اور اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی بہانہ ان کی سخت گیری کے لیے ہاتھ آئے ۔ یہ بھی انواع و اقسام کے چٹکلوں سے اس کے آئینہ عنایت کو چمکاتے ۔ مگر دل کی کدورت صفائی کی صورت نہ بننے دیتی تھی ایک دن سید انشاء نے بہت ہی گرم لطیفہ سنایا ۔ سعادت علی خاں نے کہا "انشاء جب کہتا ہے ایسی کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو" یہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤں گا کہ نہ دیکھی ہو ، نہ سنی ہو ۔ نواب تو تاک میں تھے چیں بجبیں ہو کر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں فقط دو لطیفے روز سنا دیا کیجیے ۔ مگر شرط یہی ہے کہ نا دیکھے ہوں نہ سنے ہوں نہیں تو خیر نہ ہو گی ۔

سید انشاء سمجھ گئے یہ انداز کچھ اور ہے خیر اس دن سے دو لطیفے روز انھوں نے سنانے شروع کر دیے مگر چند روز میں یہ عالم ہو گیا ، کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا ۔ اسی سے کہتے کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ ذرا نواب کو سنائیں ، وہ کہتا کہ جناب بھلا آپ کے سامنے اور ہم چٹکلے کہیں ۔ کہتے میاں کوئی چڑیا کی چھونے کی جو بات تمھیں یاد ہو کہہ دو ۔ میں لون مرچ لگا کر اسے خوش کر لوں گا ۔ اس اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ

سعادت علی خاں نے انھیں بلا بھیجا ۔ یہ کسی اور امیر کے ہاں گئے تھے ۔ چوب دار نے آ کر عرض کی کہ گھر نہیں ملے ۔ خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو ۔ اس قید بے زنجیر نے انھیں بہت دق کیا تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خان کا نوجوان بیٹا مر گیا ۔ اس صدمے سے حواس میں فرق آ گیا ۔ یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری ان کے مکان کی طرف نکلی ۔ کچھ غم و غصہ، کچھ دل بے قابو غرض سرِ راہ کھڑے ہو کر سخت سست کہا ۔ سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی اب جنون میں کیا کسر رہی ۔

سعادت یار خاں رنگین ان کے بڑے یارِ تھے اور دستار بدل بھائی تھے ۔ چنانچہ سید انشاء خود کہتے ہیں ۔

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشاء
ہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

خان موصوف کہا کرتے تھے کہ لکھنؤ میں سید انشاء کے وہ رنگ دیکھے جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے ۔ ایک تو وہ عروج کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کے ناک کے بال تھے دروازے پر گھوڑے ہاتھی پالکی ، نالکی کے ہجوم سے راستہ نہیں ملتا تھا ۔ دوسری وہ حالت کہ پھر جو لکھنؤ گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا ۔ مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی ۔ میں ایک شخص کی ملاقات کو گیا ۔ وہ در اثنائے گفتگو دوستانِ دنیا کی نا آشنائی اور بے وفائی کی شکایت کرنے لگے ۔ میں نے کہا "البتہ ایسا ہے مگر پھر بھی زمانہ خالی نہیں" انھوں نے زیادہ مبالغہ کیا ۔ میں نے کہا کہ ایک میرا دوست انشاء ہے کہ دوست کے نام پر جان دینے کو موجود ہے ۔ وہ خاموش ہوئے اور کہا "اچھا زیادہ نہیں ۔ آج آپ ان کے پاس جائیں اور کہیے ہمیں ایک تربوز

خود بازار سے لا کر کھلا دو ۔ موسم کا میوہ ہے کچھ بڑی بات بھی نہیں ہے ۔ میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی فرمائش ہے ۔

وہ بولے کہ بس یہی فرمائش ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود لا کر کھلائیں ۔ بلکہ چار آنے کے پیسے بھی آپ مجھ سے لے جائیں ۔ میں اسی وقت اٹھ کر پہنچا ۔ انشاء عادتِ قدیم کے بموجب دیکھتے ہی دوڑے صدقے قربان گئے ۔ جم جم آئیے نت نت آئیے بلائیں لینے لگے میں نے کہا یہ نازوانداز ذرا طاق میں رکھو ۔ پہلے ایک تربوز لا کر کھلاؤ گرمی نے مجھے جلا دیا ۔

انھوں نے آدمی کو پکارا میں نے کہا آدمی کی سہی نہیں ۔ تم جاؤ آپ اور ایک اچھا سا شہیدی تربوز دیکھ کر لاؤ انھوں نے کہا کہ نہیں مرد معقول ہے اچھا لائے گا ۔ میں نے کہا نہیں کھاؤں گا ۔ تمھارا ہی لایا ہوا کھاؤں گا ۔ انھوں نے کہا کہ تو دیوانہ ہوا ہے ۔ یہ کیا بات ہے تب میں نے داستان سنائی ۔ اس وقت انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ بھائی وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے ۔ کیا کروں ظالم کی قید میں ہوں ۔ سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں ۔

تیسرا رنگ میاں رنگیں بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لیے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا اور سرا میں اترا شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے ۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسے میں پہنچا ۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے ، لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ حقے پی رہے تھے میں بھی بیٹھا ہوں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے ، سر پر ایک میلا سا پھینٹا ، گھٹنا پاؤں میں گلے میں ، پیکیوں کا توبڑا ڈالے ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا ۔ کسی کسی

نے اس سے مزاج پرسی بھی کی ۔ اس نے ایک توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمباکو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا بھی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا ۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑ گڑی سٹک پیچواں سے لوگ تواضع کرنے لگے ۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا کہ صاحب ! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو ۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں ۔ سب نے اس کی بات تسلیم کی اور تعمیل کی ۔ دم بھر کے بعد بولا "کیوں صاحب ! ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا ؟" لوگوں نے کہا ۔ "جناب لوگ جمع ہو جاتے ہیں سب صاحب آ جائیں تو شروع ہو ۔" وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے لیتے ہیں یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی ۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ کاغذ پھینک ، سلام کہہ کر چلے گئے ، مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا ۔ جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی غزل پڑھنے میں میں نے بھی پہچانا ۔ حال معلوم کیا تو بہت رنج ہوا اور گھر پر جا کر پھر ملاقات کی ۔ چوتھی دفعہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا ۔ افسوس جس دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں ۔ ڈیوڑھی پر دستک دی ۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا "کون ہے ۔" وہ ان کی بی بی تھیں ، میں نے کہا "سعادت یار دلی سے آیا ہے ۔" چونکہ سید انشاء سے انتہا درجے کا اتحاد تھا ۔ اس عفیفہ نے پہچانا ، دروازے پر آ کر بہت روئیں اور کہا "بھیا ان کی تو عجب حالت ہے لو میں ہٹ جاتی ہوں ، تم اندر آؤ اور دیکھ لو ۔" میں اندر گیا ۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں ۔ تن برہنہ

ہے - دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے - آگے راکھ کے ڈھیر ہیں - ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے یا تو وہ شان و شوکت کے جمگھٹ دیکھے تھے ، وہ گرم جوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی - بے اختیار دل بھر آیا - میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا - جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا "سید انشاء ! سید انشاء !" سر اٹھا کر ایسی نظرِ حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھوں میں آنسو نہیں - میں نے کہا "کیا حال ہے ؟" ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا - "شکر ہے -" پھر اسی طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا -

سوالات

۱ - سعادت علی خاں کے ہاتھوں سید انشاء کے برے انجام کی پہلی وجہ کیا تھی ؟

۲ - دربار میں جب سعادت علی خاں نے اپنے نجیب الطرفین ہونے کے بارے میں پوچھا تو سید انشاء نے کیا کہا ؟

۳ - سید انشاء کس پابندی سے زیادہ دق ہوئے ؟

۴ - سید انشاء اپنے دوست کی فرمائش پر بازار سے تربوز لانے کے لیے کیوں نہ گئے ؟

۵ - میاں رنگین نے لکھنؤ میں جو سید انشاء کی مشاعرہ میں حالت دیکھی وہ کیا تھی ؟

۶ - چوتھی دفعہ جب سعادت یار خاں لکھنؤ گئے تو انشاء کے گھر کی کیا حالت دیکھی ؟

۷ - سعادت یار خان گھر میں داخل ہوئے تو انشاء کو کس حالت میں پایا ؟

۸ - مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کو اپنے فقرات میں استعمال کیجیے -
ہمہ رنگ - ہنسوڑ - مقطع ناروا - واجبِ کفائی - انجہ حرم - شکم - چوبدار - قبیلے-زنجیر - دستار بدل - قال - توبڑا - خلیفہ - چہلوں - چیں بجبیں -

—— : ٥ : ——

(۲)

ظہیر الدین بابر

بابر سے بھی مسند پر بیٹھ کر کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ چار دفعہ ہندوستان پر آیا اور ہر بار قدم آگے ہی بڑھایا، مگر پانچویں دفعہ ایسا آیا کہ پھر جنازہ ہی یہاں سے پھرا۔ ہاں اولاد کے لیے پشتوں تک حکومت قائم کر گیا۔

چنانچہ پنجاب کو صاف کرتا ہوا دلی پر چلا۔ ادھر سے ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی جنگی لے کر اس دھوم دھام سے نکلا گویا ہندوستان کی آرائش اور تین پشت کی شان شاہانہ کو نکال کر باہر ڈال دیا۔

بابر جب یلغار سے فتح و ظفر کا غبار اڑاتا پانی پت پر پہنچا تو ایک میدانِ وسیع نظر آیا۔ ادھر ادھر گھوڑا مار کر نشیب و فراز سردارانِ لشکر کو دکھایا۔ بعد اس کے نیزہ زمین پر گاڑ، گھوڑے سے کود پڑا اور حکم دیا کہ یہیں پر ڈیرے ڈال دو۔

دوسرے دن صبح کو اٹھ کر نو طوغیں[1] اور نشان سامنے لشکر کے کھڑے کیے۔ تمام سردار ان کے نیچے آ کر جمع ہوئے۔ ایک نشان آپ لیا، باقی اوروں نے لیے چند سردار ان کے پھریرے تان کر کھڑے ہوئے اور تاتاری رسم کے بموجب اپنی زبان میں کچھ منتر پڑھے۔ بعد اس کے فوج کو آراستہ کر کے کمان[2] سے ناپا تو

۱۔ طوغ ایک قسم کا نشان ترکوں کے لشکر میں ہوتا ہے اور یہ عمل بھی وہ لوگ شگون کے طور پر کیا کرتے ہیں۔

۲۔ اس وقت تک چنگیزی آئین کے بموجب فوج کے شمار کا یہی قاعدہ چلا آتا تھا۔

لشکرِ جرّار بارہ ہزار شمار میں آیا۔

چنانچہ شہر پانی پت کو داہنے ہاتھ پر رکھا۔ شاہ قلی توپچی اپنی رومی قواعد کام میں لایا یعنی چمڑے کے رسوں سے توپوں کا زنجیرا جمایا اور بوروں کے مورچے باندھ، سلامت کوچے اور خندقیں کھود لیں۔ رات کو شبخون بھیجا، مگر حریف کی فوج چھے کوس تک برابر پڑی ہوئی تھی، جاتے جاتے صبح ہو گئی، شب خون پورا نہ پڑا۔ دوسرے دن صبح ہونے پر خبرداروں نے خبر دی کہ دشمن نے اپنے دریائے لشکر کو جنبش دی ہے۔ بابر شیر ببر کی طرح انگڑائی لے کر بستر سے اٹھا؛ ہتھیار سجے اور فوج کو مرتب کر کے سامنے کیا۔ توپیں تو جہاں کھڑی تھیں، وہاں سے ہل ہی نہ سکتی تھیں، بے ٹھکانے گولے مارنے شروع کر دیے اور ترکان تاتاری نے دائیں بائیں سے گر کر زور دیا۔

حریف کا لشکر جب آگے بڑھا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چڑھا چلا آتا ہے، مگر جب اس نے کوئی طرف دبتی نہ دیکھی تو تھم گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سوچتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں، ٹھہروں یا ہٹ جاؤں۔

بابر نے دفعۃً حملے کا حکم دیا۔ بارہ ہزار ترک خونخوار اور اور سوارِ جرار اس دریا میں مچھلیوں کی طرح تیرنے لگے۔ اس طرح کی قیامت برپا ہوئی کہ جس سے نجات کے لیے چالیس ہزار جان بازوں کے ساتھ خود ابراہیم کو جان دینی پڑی۔

سپاہی اس کے بھاگتے پھرتے تھے اور ترک تلواروں سے مارتے پھرتے تھے۔ ایک سردار شمشیر بکف کسی کھنڈر میں جا نکلا۔ دیکھا کہ کئی سو کشتے اور زخمی کٹے پڑے ہیں، مگر سب سردار اور منصب دار معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں میں تاجدارِ ہند بھی

بے تاج و بے کلاہ مرا پڑا تھا۔

خدا کی قدرت ہے! وہ میدان جس میں صبح تک ابراہیم ابراہیم کا نقّارہ بجتا تھا، خیمے، سراچے، سرا پردے کھڑے تھے، بازار لگے تھے دوپہر تک ہو کا عالم ہو گیا! اور زمین و آسمان سے بابر بابر کی صدا آنے لگی! جنھوں نے رستمی اور اسفند یاری کے دعووں سے تلواریں باندھی تھیں، سب فنا ہو گئے اور جو بچے، بھیس بدل بدل کر نکل گئے۔

فتح یاب نے ہمایوں ولی عہد کو مع چند سرداروں کے آگرے روانہ کیا اور آپ دلی میں آیا۔ قدیمی عمارتوں کو دیکھا، درگاہوں کو سلام کیا اور باد رفتار سے اتر کر آبی سواری میں بیٹھا کہ دریا کی راہ آرام سے آگرے پہنچے۔

ابراہیم کے اہل و عیال مع خزانے کے وہیں تھے اور گوالیار کا راجا قلعہ دار تھا کہ سو برس سے پشت بہ پشت راجا چلا آتا تھا، مگر وہ رفیق پرست میدانِ جنگ میں سر کے ساتھ رفاقت کا حق گردن سے اتار چکا تھا۔ چنانچہ ہمایوں بے تکلف قلعے میں داخل ہوا۔ ستارہ اقبال کا چڑھا ہوا تھا اور دل شیر سے کئی میدان آگے بڑھا ہوا تھا۔ فوراً دروازوں کا بند و بست کر، فوج فصیلوں پر پھیلا دی۔

ابراہیم کی ماں دیرینہ سال بھی زندہ تھی۔ اس نے جب سنا کہ حریف کا بیٹا قلعے میں آ گیا تو ایک دم حیرت کا عالم رہا۔ آخر کچھ بن نہ آئی، شرم و حیا کے برقع کو پھاڑ، چادر سر پر ڈالی اور حرم سرا سے نکلی۔

آگے آگے دو خواجہ سرا، پیچھے پیچھے چند یتیم بچے اور بیوہ لاوارثیں، جگر غم سے داغ داغ اور زبانیں ضبط سے چاک چاک

دلوں میں آہیں ، مگر منہ سے دعائیں دیتی شاہزادے کے سامنے آئی اور کہا کہ اے فرزندِ اقبال بلند ! اس چراغِ سحری کی دعا لے اور باپ فتح مند کی سلامتی میں ان بیواؤں اور یتیموں کی جان بخشی کر۔ سعادت مند شہزادہ انقلابِ فلک کو دیکھ کر کانپ گیا اور دنیا کی بے وفائی آئینہ ہو گئی ۔ بہت خاطر جمع کی اور اشارہ کیا کہ انھیں حرم سرا میں لے جاؤ ۔

اس سن رسیدہ بی بی نے تھرتھراتا ہاتھ چادر سے نکال کر صندل کی ڈبیا میں ایک الماس گراں بہا دیا اور کہا کہ نور چشم ! بکرماجیت کے وقت سے اس گوہرِ شب چراغ کے شہرے نے عالم کو روشن کر رکھا تھا ، علاؤالدین کے عہد سے شاہانِ اسلام کے خزانے میں آیا ، تین پشت تک ہم نے بھی امانتداری کی ، وہ آج ہی کے لیے تھی ، اب یہ تمھارا حق ہے ۔

غرض ہمایوں انھیں عزت و حرمت سے بٹھا کر آپ خزانوں کی طرف متوجہ ہوا ۔ ابراہیم کو روپیہ سمیٹنے کا بڑا شوق تھا اور اسی سبب سے فوج اور رعیت پریشان بے سامان رہتی تھی ۔ چنانچہ خزانوں کو دیکھا تو بھرے پڑے پائے سب بند و بست کر کے باپ کی خدمت میں آیا ، سارا حال عرض کیا اور الماس نذر دے کر انعام میں لیا ۔

دریا دل بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ زور تیغ سے لیتے ہیں اور بے دریغ دیتے ہیں ۔ بابر نے خزانوں میں سے کئی کئی لاکھ نقد اور انواع و اقسام کے تحفے ایک ایک بیٹے اور ہر سردار کو دیے لشکر میں ترک افغان ، ہزارے ، عرب بلوچ فرقے فرقے کے لوگ تھے سب سب کو نہال کر دیا ۔ بخارا اور سمرقند میں اپنے خاندانی مشائخوں کو عجیب و غریب تحفے بھیجے ۔ کابل کی رعایا میں بچے بچے تک ایک

ایک شاہ رخی[۱] بٹی ۔

بعد اس کے دفتروں پر متوجہ ہوا اور بند و بست کے ساتھ خانۂ سلطنت کی آرائشیں کرنے لگا ۔ ہندوستان کے حالات اور پیداواروں اور صنعتوں کی تحقیقاتیں شروع کیں ۔ عمارتوں کو دیکھا اور خود ایسے باغ لگائے اور مکانات اور حمام بنائے کہ لوگ ہندوستان آ کر دیکھتے اور کہتے کہ آگرہ بھی کابل قندھار ہو گیا ۔

یہاں کے لوگ سمجھتے تھے کہ جس طرح محمود اور تیمور آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے ، اسی طرح بابر بھی چلا جائے گا ۔

جب اس کا جماؤ دیکھا تو اودے پور کا رانا جس کے خاندان میں صد ہا سال سے راج چلا آتا تھا ، اس نے بہت سے ہندو مسلمان سرداروں کو سمیٹ کر لاکھ آدمی کا جتھا جمع کیا کہ اس ترک بچے کو مار کر نکال دو ۔

بابر نے رفیقوں کو بلا کر گفتگو کی چنانچہ پہلی تجویز یہ ٹھہری کہ جو جو یہاں کے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں ، انھیں اضلاع میں بھیج دینا چاہیے تا کہ میدان میں عین وقت پردغا نہ کریں ۔

بعد اس کے سرداروں نے کہا کہ اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی ظاہر ہے اس لیے مناسب ہے کہ آپ پنجاب میں جا کر عنایت الٰہی کے منتظر رہیں ۔ جاں نثار میدان گرم کریں ، اگر فتح پائی تو حضور دولت و اقبال کو رکاب میں لے کر تشریف لائیں ، اگر ہم شہادت سے سرخرو ہوئے تو پنجاب سے کابل تک کا ملک حضور کو مبارک رہے ۔

اس ہمت والے نے کہا کہ اے میرے رفیقو ! جو فتح تم نے کی ہے ، اس کی عالم میں دھوم مچ گئی ہے ، مگر اس حرکت کو

---

۱ ۔ ایک سکہ تھا جو شاہرخ مرزا امیر تیمور کے بیٹے کے نام سے شاہ رخی کہلاتا تھا اور مقدار میں سات آنے کے قریب ہوتا تھا ۔

سن کر ملک ملک کے بادشاہ یہی کہیں گے کہ اتنا بڑا ملک لے کر یہ خزانے اور جواہرات مارے اور جب تلوار مارنے کا وقت آیا تو سرداروں کو آگے رکھ کر آپ سرک گیا ۔ تیمور و چنگیز کے نام پر داغ لگانے سے مر جانا ہزار درجہ بہتر ہے ۔ خیر اب جو تمہارا حال ، سو میرا حال ۔ یہ سن کر تمام سرداروں نے دعا کی اور فوج مع توپ خانے کے روانہ ہوئی ۔

فتح پور سیکری کے پاس یہ پرچا لگا کہ دشمن بھی بڑھا چلا آتا ہے اور ہراول کی فوجوں کی ٹکر ہو گئی ۔ بادشاہ یہ خبر سنتے ہی خود باگیں اٹھایا چاہتا تھا جو خبر آئی کہ میدان اپنے ہاتھ رہا ۔

غرض جس ڈھنگ سے ابراہیم کی لڑائی میں لشکر اترا تھا اسی طرح یہاں اتارا ، مگر شام کو جب فوج کی موجودات لی تو معلوم ہوا کہ سپاہ کے دل بجھے ہوے ہیں ۔ اسی وقت سرداروں کو میدان میں بلایا اور ایک پرتاثیر تقریر اس طرح ادا کی کہ اے غریب الوطن بادشاہ کے رفیقو ! تم دیکھتے ہو کہ ہم کون ہیں اور کہاں کھڑے ہیں ۔ برسوں محنت کی ، مدتوں مصیبت سہی ، اپنی جان خطروں میں ڈالی ، پیارے رفیقوں کی جانیں دیں ، تب نامور دشمنوں کو زیر کیا اور وہ ملک تم نے لیا کہ روئے زمین کے سلاطین اس کی آرزو کرتے ہیں ۔ بہادرو ! دیکھتا ہوں کہ تمہارے دل گھٹے جاتے ہیں ۔ تم جانتے ہو کہ جمعیت کے گھٹنے کا مضائقہ نہیں ، مگر دلوں کا گھٹنا غضب ہے ، خدا نہ کرے ! کہ ذرا بھی ہوا پائے ، پھر زمین و آسمان میں ٹھکانا نہیں ۔ دیکھو تیموری تلوار جس نے یہاں تک پہنچایا ، وہ تمہارے ہاتھ میں ہے ، پھر خطر کس بات میں ہے ؟ ہاں وہ بات نہ ہو بے وفائی سے روسیاہی کے دفتر میں نام لکھا جائے ۔ اور ہڈیاں سب کی یہاں خاک ہوں ۔ دیکھو ! آخر مرنا ، اول مرنا ، پھر مرنے سے کیا ڈرنا ، مگر تلوار مار کر مرنا ہزار

زندگی سے بہتر ہے - جینا انھیں لوگوں کا ہے جو آقا کے نمک اور بازوؤں کے زور پر لڑے اور مردوں کے دفتر میں نام لکھوا کر خدا کے سامنے سرخرو گئے - لو ! اب یہ قرآن شریف تمھارے سامنے ہے ، تم جانو اور یہ جانے -

قرآن کو دیکھتے ہی سب نے سر جھکا دیے ، چہرے سرخ ہو گئے اور بہتوں کے آنسو نکل پڑے - دوڑ دوڑ کر اس پر سر رکھ دیے اور ہاتھ رکھ کر کہا کہ جب تک دم میں دم ہے ، جو بادشاہ سے پھرے ، خدا اور کلامِ خدا سے پھرے - غرض سب کے دل قوی ہو گئے اور ہنسی خوشی اپنے اپنے خیموں میں آ گئے -

نیا نکتہ یہ نکالا کہ شراب انگوری خاص کابل سے منگائی تھی ، وہ دو دن پہلے پہنچی تھی ، بلکہ ہمایوں کو جسے شراب سے نفرت تھی ، اسے بڑی منتوں سے پلائی تھی - اس موقع پر فتح کی منت مان کر شراب سے توبہ کی اور تمام سونے چاندی کے باسن تڑوا کر نامِ خدا دیے - چند ترکی شعر توبہ کے مضمون میں کہے اور آگرے میں بجائے شراب خانے کے تعمیرِ مسجد کا حکم بھیج دیا -

ساتھ ہی مسلمانوں کے کل محصول معاف کر کے تمام گناہوں سے یہاں تک کہ ڈاڑھی منڈانے سے بھی توبہ کی ، مگر شیطان نے ایک شوشہ چھوڑا ، یعنی وطن سے کوئی نحوست زدہ نجومی پہنچا ، اس نے لشکر میں ہل چل ڈال دی کہ اس لڑائی میں ہماری شکست ہو گی -

لوگ تو بہت گھبرائے مگر بادشاہ نے کچھ پروا نہ کی اور صبح دم ابھی مشرق سے آفتاب بلند نہ ہوا تھا کہ اس نے پھریرا علم کا میدان میں کھول دیا - پہلے ہی توپوں کے منہ سے بسم اللہ ہوئی ، سامنا سامنے قائم رہا اور ترک غول کے غول جدا ہو ہو کر چاروں طرف سے گرنے لگے -

غنیم نے بھی مردانگی کی داد دی ، مگر دوپہر سے اس کا طور بے طور ہونے لگا ۔ بابر نے دفعۃً نقّارہ فتح کا بجا کر ایسا حملہ کیا کہ سب کے قدم اکھڑ گئے ، دور تک بھاگتوں کا پیچھا کیا ، شام کو پھرے اور غنیم کے خیمہ گاہ اور لشکر کے بازاروں کو دیکھتے ہوئے رات کو اپنے ڈیروں میں پہنچے ۔

ہوا خواہ آتے تھے اور مبار کبادیں دیتے تھے ۔ آغا نجومی بھی شرمندہ صورت آئے ۔ بابر نے بہت سی گالیاں دیں ، مگر چونکہ نمک خوار قدیمی تھا ، اس لیے لاکھ ٹنکہ دے کر حکم دیا کہ ابھی لشکر سے نکل جائے ۔

وہاں ایک مینار یادگار بنایا اور فتح کا نقارہ بجاتا ، اقبال کا نشان اڑاتا ، گوالیار میں آیا ۔ پتھر کا ہاتھی اور شمس الدین التتمش کی مسجد دیکھی اور اس فتح سے فرمانوں میں بادشاہِ غازی تحریر ہونے لگا ۔

بابر بادشاہ جیسا مزاج کا رنگین تھا ، ویسا ہی دل کا سخت اور طبیعت کا مصیبت پسند تھا ۔ کئی دفعہ کالپی سے گھوڑا اور ایک سو ساٹھ میل زمین طے کر کے دوسرے دن آگرے میں دم لیا ۔ کشتیاں موجود ہوتیں اور گنگا جیسے دریا پر کپڑے اتار ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کود پڑتا ، تیر کر پار اتر جاتا اور حریف پر دھاوا مارتا ۔

آخر کوچ کے دن نزدیک آئے اور بیمار ہو کر طبیعت بے اعتدال ہوئی ۔ اتفاق یہ کہ انھیں دنوں میں ہمایوں بھی سخت بیمار ہوا ۔ حکیم طبیب سب نے اپنی اپنی حکمت خرچ کی ، مگر کسی سے کچھ نہ ہوا ۔

آخر مشائخوں اور بزرگوں کو بلا کر پوچھا ، انھوں نے عرض

کی کہ جو چیز حضور کی نظر میں نہایت گراں بہا ہو ، وہ نور چشم پر نثار کیجیے کہ اس کی آئی بلا ٹلے ۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ ابراہیم لودھی والے الماس کا اشارہ ہے ۔ ہنس کر کہا کہ پتھر کیا مال ہے ، لختِ جگر پر میں اپنا گوہرِ جان قربان کروں گا ۔

یہ کہہ کر اٹھا ، تین بار گرد پھرا اور کہا ۔ "الٰہی ! اس کی بلا میں نے اپنی جان پر لے لی ، لے لی ، لے لی ۔" بعد اس کے سجدہ کیا اور دیر تک رو رو کر دعا مانگتا رہا ۔ خدا کی قدرت ! کہ اسی وقت سے اس کا مرض گھٹنے لگا اور اس کا بڑھنے لگا ۔ بیٹے سے کہا کہ تخت تمھیں مبارک ہو ، ہمارے لیے حکم دو کہ تختۂ تابوت تیار کریں ۔

آخر بیٹا بسترِ بیماری سے اٹھ کھڑا ہوا اور باپ نے بسترِ عدم پر آرام کیا ۔ تاریخ ہوئی کہ :

ع ہمایوں بود وارث ملک وی

لاش کابل میں بھیجی گئی ۔ چنانچہ جہانگیر نے اس پر ایسا عالیشان مقبرہ بنوایا کہ اب بھی سیاح لوگ اسے دنیا کی بے نظیر عمارتوں میں شمار کرتے ہیں ۔

اس وقت تک امیر تیمور کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ، امیر کی رعایت سے امیرزا کہلاتے تھے ، بابر نے ہندوستان مار کر اپنے نام پر امیر المؤمنین کا تاج رکھا اور شاہی کا تمغہ لگایا ۔

سوالات

۱ ۔ بابر کون تھا ؟ اس کا اور ابراہیم لودھی کا کیا تعلق تھا ؟
۲ ۔ بابر نے ابراہیم لودھی کی ماں سے کیا سلوک کیا ؟
۳ ۔ ابراہیم لودھی سے لوگ پریشان کیوں تھے ؟

۴ - ہمایوں کی بیماری میں بابر نے کیا کیا ؟

۵ - ''بے اعتدال'' میں ''بے'' سابقہ ہے اس کے لگانے سے نفی کے معنی پیدا ہوتے ہیں - کچھ اور ترکیبیں اس قسم کی بنائیے جن میں ''بے'' لاحقہ ہو -

۶ - ''وارثِ ملک'' مرکبِ اضافی ہے - اس میں ''وارث'' مضاف ہے اور ملک مضاف الیہ - اس سبق سے اور مرکبِ اضافی چنیے اور ان میں مضاف اور مضاف الیہ کی نشان دہی کیجیے -

۷ - ''کھانا ہضم نہ ہوتا تھا'' میں الفاظ کو اصلی معنوں سے ہٹا کر استعمال کیا گیا ہے - اس سبق میں اس قسم کے اور مجموعے تلاش کر کے ادر انھیں اپنے فقروں میں استعمال کیجیے -

---:o:---

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱۸۷۰ء - ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں - ان کے مضامین کے علاوہ خطوط بھی اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں - خطوط نگاری میں ان کا اسلوبِ تحریر وہی ہے جو ان کی عام تصانیف کا ہے - مگر ان خطوط کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے - ان سے ان کے دردِ قومی اور اردو زبان و ادب سے والہانہ عشق کا بھی اندازہ ہوتا ہے - ان کے بعض خطوط تاریخی دستاویزوں کی حیثیت رکھتے ہیں -

مکتوباتِ عبدالحق

بنام میاں بشیر احمد صاحب

قادر منزل

سیف آباد ، حیدر آباد (دکن)

۲۹ جنوری ۱۹۳۷ء

شفیقی و محترمی ! تسلیم

بہت دنوں کے بعد عنایت نامہ آیا - میں نے بھی گزشتہ دو مہینے جنوبی ہند کے دورے میں بسر کیے اور وہاں اوٹا کمنڈ کو میسور اور طیبار کے علاقے میں اردو مدرسے اور انجمن قائم کیں - وہاں اشاعت اردو کا بڑا میدان ہے - روپیہ اور کام کرنے والوں کی ضرورت

ہے۔ لوگ اردو پڑھنے کے قائل ہیں۔ یہ بڑی بات ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں آپ کے دم سے اردو کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔

آج کل حیدر آباد کا باوا آدم نرالا ہوگیا ہے۔ مسٹر جعفری سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جو شمالی ہند کی ہر چیز سے نفرت رکھتے ہیں۔ یہ تعصب یہاں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے انھیں کو نقصان پہنچے گا۔ حیدری صغیر اگر ذرا بھی اشارہ کریں تو کام ہو جائے۔ چیف جسٹس تو محض بے کار شخص ہے اور اس سے ان کا تعلق بھی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بہار میں ہندی اردو کا جھگڑا ایک زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ پچھلی وزارت میں اردو کی تھوڑی بہت پرسش ہوتی تھی۔ اب دوسری وزارت آ گئی ہے۔ یونیورسٹی سینیٹ نے یہ رزولیوشن منظور کیا تھا کہ میٹریکولیشن تک تعلیم ہندوستانی کے ذریعے ہو۔ اب ہندوستانی کا نقطہ بہت مبہم ہے۔ غرض اس قسم کے چند مسائل ہیں جن کا طے کرنا بہت ضروری ہے اور جلد ہونا چاہیے۔ میں پٹنے میں ۲۸ اور ۲۹ اگست کو ایک کمیٹی کا انعقاد کرنے والا ہوں جو اس مسئلے پر غور کر کے اپنے مطالبات کونسل میں پیش کرے۔ صرف چند صاحبوں کو مدعو کرنے کا ارادہ ہے۔ اس میں آپ کا بھی نام ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیے۔ پنجاب سے کسی کے آنے کی توقع نہیں۔ اس لیے آپ سے خاص طور پہ درخواست کر رہا ہوں۔ اس کمیٹی میں پنجاب کا ایک نمائندہ ضرور ہونا چاہیے اور آپ سے بڑھ کر کوئی نمائندگی نہیں کر سکتا۔

نیاز مند

عبدالحق

۲

قادر منزل

حیدر آباد دکن

۶ ستمبر ۱۹۳۷ء

مشفقی و مکرمی

آپ کا خط پٹنے سے ہوتا ہوا مجھے ملا ۔ ہندوستانی کے ملکی زبان ہونے میں آپ کے احباب کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جبکہ ہم نے ہندوستانی کی صاف الفاظ میں یہ تعریف کر دی ہے کہ ہندوستانی سے مراد وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے ۔ اس کی جامع تعریف ہم نے اپنے ایک دوسرے ریزولیوشن میں کر دی ہے جو بہار کمیٹی کی روئیداد کے ساتھ شائع ہو گا ۔ دوسرے آپ کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ پنجاب ہی ایک صوبہ نہیں ۔ بلکہ ہمارے پیشِ نظر سارا ہندوستان ہے اور خصوصاً ان صوبوں میں اردو کی حفاظت بہت ضروری ہے جہاں اردو والوں کی اقلیت ہے ۔ ہمارے مشترکہ بیان میں تو ہندی سے تو بحث ہی نہیں ، صرف رسم الخط کی اجازت ہے اور پنجاب میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ نزاع اگر ہوئی تو ان صوبوں میں ہو گی جہاں ہندی اردو دونوں زبانیں ہیں ۔ یا جہاں دونوں نہیں یا کم و بیش ہیں ۔ چنانچہ مدراسی وزیر اعظم مسٹر گوپال اچاریہ کے بیان کے مطابق میں نے خط و کتابت کی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ہندوؤں کے لیے ہندی اور مسلمانوں کے لیے اردو رکھی ہے اور سیٹھ یعقوب حسن نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اس پر کامل طور سے عمل درآمد ہو گا ۔ ہندی سب کے لیے لازمی نہیں ہو سکتی ۔

میں نے تو کوشش کی ہے کہ یو۔پی، بہار اور سی۔پی، میں یہ لازم قرار دے دیا جائے کہ ثانوی جماعتوں میں ہندی والے اردو اور اردو والے ہندی پڑھیں۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ اردو کو کس قدر فروغ ہوگا اور جیت اردو والوں کی ہو گی۔ پنجاب میں یہ جھگڑا ہی نہیں آپ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

آپ اسے چھوڑیے۔ ذرا اپنے سرحدی صوبے کی خبر لیجیے۔ پٹنے میں مجھے معتبر اصحاب کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ خان عبدالغفار خاں نے یہ کہا کہ میں سرحدی صوبے میں اردو کو خارج کر کے پشتو رائج کروں گا اور بہاریوں کو بھی یہ مشورہ دیا کہ تم اردو چھوڑ دو اور ہندی اختیار کر لو۔ وہاں یعنی سرحدی صوبے میں اب کانگریسیوں کی حکومت ہو گئی ہے۔ دیکھیے اردو ہندی کے معاملے میں کیا ہوتا ہے؟

مجھے اس کا افسوس ہے اور کسی قدر شکایت بھی ہے کہ پنجاب سے کوئی صاحب ان مباحث میں شریک نہیں ہوتے۔ علی گڑھ کی کانفرنس میں کئی صاحبوں کو دعوت دی۔ باوجود وعدوں کے کوئی صاحب نہ آئے۔ صرف آپ نے تکلیف فرمائی۔ حالانکہ علی گڑھ لاہور سے کس قدر قریب ہے؟ بے چارے کیفی باوجود علالت کے لائل پور سے پٹنے پہنچے۔ اگر آپ خود تشریف لاتے یا کسی اور صاحب کو بھیج دیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ اگر آپ کا خط مجھے پٹنے میں مل گیا ہوتا تو میں وہاں سے سیدھا لاہور چلا آتا۔ میں پٹنے سے ناگ پور گیا اور وہاں وزیر اعظم اور وزیر تعلیمات سے ملا اور اردو کے متعلق ان سے گفتگو کی اور اپنے مطالبات پیش کیے۔ آپ اطمینان رکھیے ہم اردو کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔ بلکہ اس کی اشاعت کی مزید کوشش کریں گے لیکن حالات کو بھی دیکھنا چاہیے۔ مصالحت اور

مفاہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے ۔ شور اور سینہ زوری سے کام نہیں نکلتا ۔

بابو راجندر پرشاد اور ان کے رفقاء نے بعد گفتگو کے ہم سے صاف کہہ دیا کہ آپ جو لکھ دیں گے ہم اس پر دستخط کر دیں گے چنانچہ یہ بیان ہمارا ہی لکھا ہوا ہے ۔ اس میں انہوں نے ایک لفظ بھی کم و بیش نہ کیا ۔

رہا بنیادی زبان کا سوال ۔ تو وہ آپ کے یا ہمارے لیے نہیں ہے بلکہ اصل میں ان لوگوں کے لیے ہے جو ہندی ، اردو دونوں سے ناواقف ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ وہ ہم لوگوں سے بات چیت کر سکیں ۔ اگر تامل ۔ تلیگو ۔ ملیالم وغیرہ زبان والے ہندوستانی تھوڑی بہت سیکھ جائیں تو اس میں ہمارا بھی فائدہ ہے ۔

مفصل روداد شائع ہونے پر آپ کو تفصیلی کیفیت معلوم ہو گی ۔

نیاز مند

عبد الحق

بنام سر سکندر حیات خاں

جون ۔ ۱۹۴۲ء ۔

جناب والا !

کچھ دنوں سے اخبار میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ حکومتِ پنجاب اور سکھوں میں باہمی سمجھوتہ ہو رہا ہے ۔ سمجھوتے کی شرطیں بھی بعض اخباروں نے لکھی ہیں ۔ اگرچہ اس کی تصدیق

نہیں ہوئی ۔ لیکن اس خبر سے عام طور پر تشویش پھیل رہی ہے ۔ خصوصاً اردو کے متعلق مختلف مقامات سے مجھے خط وصول ہوئے ہیں یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اردو کے متعلق جس سمجھوتے کا ذکر اخباروں میں کیا گیا ہے اس کی کیا اصلیت ہے ۔

انگریزی حکومت کے قیام سے اب تک پنجاب کی یہ قطعی اور مسلمہ پالیسی رہی ہے کہ اردو ہی اس صوبے کی تعلیم کا ذریعہ ہو گی ۔ خود جناب نے متعدد بار اسمبلی کے اجلاس میں اس پالیسی کا اعلان فرمایا اور صاف طور پر کہہ دیا کہ زبان کے معاملے میں جو پالیسی اب تک رہی ہے موجودہ حکومت بھی اس پر کاربند رہے گی ۔ مجھے آپ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے اور اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ اردو کی موجودہ حیثیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچے گا ۔ لیکن بعض اوقات سیاسی مصلحتیں اصول پر غالب آ جاتی ہیں اور انسان وقتی فائدے کی خاطر مفاہمت پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ یہ وقت بڑے امتحان کا ہوتا ہے ۔ وقتی گتھیوں کو اس طرح سلجھانا کہ اصول ہاتھ سے نہ جانے پائے اصلاً تدبر ہے ۔

جناب کو معلوم ہو گا کہ چند سال پہلے گاندھی جی نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں ہندی کو ہندوستان بھر کی عام زبان (راشٹر بھاشا) بنا کر رہوں گا ۔ لیکن تجربے کے بعد وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اور ہندی سے ہندوستانی پر آ گئے ہیں ۔ حالانکہ اس ہندوستانی کو جب قومی زبان بنانے کے لیے اُن سے کہا گیا تھا تو وہ نہ مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے ۔ اب وہی گاندھی ہیں کہ زبان کے معاملے میں سمجھوتہ کرنے کے لیے بار بار لکھ رہے ہیں ۔

ایسے وقت میں اگر پنجاب میں اردو کو اس منصب سے محروم کر دیا گیا جو اب تک اسے حاصل رہا ہے تو ہمارے قومی اتحاد اور

قومی تہذیب کو سخت صدمہ پہنچے گا۔

پنجاب اردو کا گڑھ ہے اور تقریباً ۸۰ سال سے مسلسل اردو کی قابلِ قدر خدمت کر رہا ہے اور اس میں ہندوستان کے سب صوبوں سے پیش پیش ہے۔ اگر وہاں اردو کی حیثیت میں فرق آیا تو نہ صرف اہلِ پنجاب کو بلکہ ہندوستان کے تمام اردو دان طبقے کو (جو ملک میں بڑی اہمیت رکھتا ہے) دلی صدمہ پہنچے گا اور ہر صوبے میں اس کے خلاف شورش برپا ہو جائے گی۔ یوں تو ہم میں سینکڑوں اختلافات ہیں یہاں تک کہ مذہب بھی اس سے نہیں بچا لیکن اردو کے معاملے میں ہم سب ایک ہیں خواہ کسی خیال اور مشرب کے ہوں۔

اگرچہ ہندو مسلمانوں کے ملاپ سے ملک کے تمدن میں بڑا تغیر ہوا اور دونوں کی تہذیبوں کے میل ملاپ سے رہنے سہنے کھانے پینے، لباس، صناعی، فنِ تعمیر، موسیقی وغیرہ میں طرح طرح کی جدتیں عمل میں آئیں لیکن سب سے اہم اور انقلابی تغیر اس زبان کا وجود میں آنا تھا، جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے عجیب اور مستحکم یادگار اور ہندوستان کی تاریخ کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ یہ زبان اتحاد ہی کی بدولت اور اتحاد ہی کے لیے بنی تھی۔ اب بھی ہم اس کے ذریعے سے رشتۂ اتحاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کا یہی مسلک ہے اور اب تک وہ اسی پر کاربند ہے۔ اگر خدانخواستہ اردو کے گڑھ میں رخنہ پیدا ہو گیا تو یہ شیرازہ اتحاد درہم برہم ہو جائے گا۔

انجمن ترقی اردو پر آپ کا ایسا احسان ہے، جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس لیے بہ نظر خیر اندیشی ان سطروں کے لکھنے

کی جرأت کی ہے۔ امید ہے کہ آپ میری اس طول نویسی کو معاف فرمائیں گے۔

مخلص

عبدالحق

سوالات

۱۔ میاں بشیر احمد کے نام خط میں مولوی عبدالحق نے اردو کی ترقی کے بارے میں کیا لکھا ہے اور ان سے کس لیے امداد مانگی ہے؟

۲۔ سر سکندر حیات کے نام خط میں مولوی صاحب نے پنجاب میں اردو کے بارے میں کیا تحریر کیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کیوں کہا جاتا ہے؟ ان خطوط سے اردو کے بارے میں ان کے رویے پر کیا روشنی پڑتی ہے؟

۴۔ مندرجہ ذیل محاورات کو فقروں میں استعمال کیجیے۔

سورج کو چراغ دکھانا۔ پانی سر سے اونچا ہونا۔ دل خون ہونا۔ سان گمان نہ ہونا۔ جلتی پر تیل چھڑکنا۔

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

عالی مرتبہ۔ تنازعہ۔ قومی احیاء۔ خالق۔ عدم تشدد۔ یکجہتی۔ نادر۔

———:o:———

علامہ اقبال

علامہؒ اقبال کے حالات اور کلام پر تبصرہ حصہؑ نظم میں موجود ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کے ایک جلیل القدر رہنما بھی تھے۔ ان کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قائداعظم اور دوسرے سیاسی رہنماؤں کے نام خطوط کے مطالعے سے ان کی سیاسی بصیرت اور درد قومی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہؒ اقبال کو مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی عالم اسلام اور بالخصوص اسلامیان ہند کی سر بلندی کے لیے تگ و دو میں صرف کر دی۔ قائد اعظم کے نام ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ بر صغیر کے مسلمانوں کے مستقبل سے کتنی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور قائد اعظم کی ذات پر انھیں کس قدر اعتماد تھا۔ وہ زندگی کے آخری ایام تک قیام پاکستان کی جد و جہد میں مصروف رہے اور قاعد اعظم کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے

مکاتیب علامہ اقبال

بنام قائد اعظم

(۱)

لاہور

۲۰۲ مئی ۱۹۳۴ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

امید ہے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ جو انھوں نے آل

انڈیا نیشنل کنوینشن کے اجلاس میں فرمایا ہے ، آپ کے ملاحظے سے گزرا ہوگا ۔ اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق اس خطبہ میں جو مسلک کارفرما ہے ، اس پر آپ نے پورے طور پر غور کیا ہوگا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا کے آئندہ سیاسی ترقیات کے پیشِ نظر دستور جدید ہندی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لیے ایک نادر موقع بہم پہنچاتا ہے ۔ اگرچہ ہم ملک میں تمام ترقی پسند پارٹیوں کے ساتھ موالات کے لیے تیار ہیں تاہم ہمیں اس حقیقت کو ہرگز پسِ پشت نہ ڈالنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کے اخلاق اور سیاسی اقتدار کا دار و مدار تمام تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے لہٰذا میری تجویز ہے کہ آل انڈیا کنوینشن کو ایک پرزور جواب دیا جائے ۔ آپ کو چاہیے کہ دلی میں جلد از جلد آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں ۔ جس میں نئی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم راہنماؤں کو بھی دعوت شمولیت دی جائے ۔ آپ کو چاہیے کہ اس اسلامی مؤتمر کی طرف سے پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی وحدت کا بطور نصب العین اعلان کر دیں یہ اور ضروری ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہندوستان میں حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا مستقبل اگر معاشی مسئلہ سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کسی طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں ۔

اگر آپ ایسی کنوینشن منعقد کر سکیں تو ان مسلم ارکان مجالس پر واضح قوانین کی حیثیت کا پول بھی کھل جائے گا جنھوں نے مسلمانوں کی خواہشوں اور تمناؤں کے خلاف اپنی جداگانہ پارٹیاں

قائم کر لیں ۔ مزید برآں اس کنونشن سے ہندوؤں پر بھی یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی تدبیر بھی ، خواہ وہ کس قدر عیارانہ کیوں نہ ہو ، ہندی مسلمانوں کو اپنی ثقافتی وحدت سے غافل نہیں کر سکتی ۔ میں چند روز تک دہلی آ رہا ہوں اور اس اہم مسئلہ پر آپ سے گفتگو کروں گا ۔ میرا قیام افغانی قونصل خانہ میں ہوگا ۔ اگر آپ کو کچھ فرصت میسر آ سکے تو وہی ہمارا مقام ملاقات ہونا چاہیے از راہ کرم اس خط کے جواب میں چند سطور جلد از جلد تحریر فرمائیے ۔

مخلص

اقبال

۲

۲۱ جون ۱۹۳۷ء

بصیغہ راز

مائی ڈیر مسٹر جناح

نوازش نامہ کل وصول ہوا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ آپ کی بے پناہ مصروفیت سے آگاہی رکھنے کے باوجود آپ کو اکثر لکھتے رہنے کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ اس وقت مسلمانوں کو اس طوفانِ بلا میں ، جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے ، صرف آپ کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے ۔ میں سمجھتا ہوں ہم فی الحقیقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔ فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں عالمگیر ہو جائے ۔ گزشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے صرف شمال مغربی ہند میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں ۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول ؐ کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں ۔ توہین رسول ؐ

کی ان چار وارداتوں میں مجرم فی النار کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن کریم نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ صورت حال کا نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ معاشی بلکہ خالص سیاسی ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندو اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دار و مدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے نا انصافی برتنا پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن کی امداد پر وزارت قائم ہے، خوش رہ سکیں۔ اور دوسروں پر ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب ہے۔ لہٰذا یہ ایک عالم آشکارا حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے پاس اس آئین کو رد کرنے کے خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دستور جدید ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی آبادی کی اکثریت ہے، حکومت میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے۔ اور مسلمانوں کو قطعی نظر انداز نہیں رکھ سکتے۔ برخلاف قیاس کے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر رکھا گیا ہے۔ مجھے اس میں قطعاً ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

مزید براں یہ دستور تو اس معاشی تنگ دستی کا جو شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے، کوئی علاج ہی نہیں۔ فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی

کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لیے بے سود ہے۔ کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت سے انکار ہی کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت یعنی ہندو مہاسبھا نے جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا وجود ہندوستان میں ناقابل قبول ہے۔

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ وفاق میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ ہے۔ شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہند اور بیرون ہند کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم رکھا جا سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت و مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اس وقت اس طریق سے وابستہ ہے۔

لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں منعقد کروانے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ لاہور میں اگست تکلیف دہ ہوتا ہے میری رائے میں آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیے۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور لیگ کے آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے از حد مفید ہو گا۔

اندریں حالات یہ بالکل عیاں ہے کہ ہندوستان کا امن نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بنا پر ملک کی تقسیم مکرر پر موقوف ہے۔ اکثر برطانوی مدبر بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔ ہندو مسلم فسادات جو اس دستور جدید کے جلو میں پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں، امید ہے کہ ان پر یہ حقیقت ناقابل تردید طور پر واضح کر دیں گے۔ مجھے یاد ہے انگلستان سے میری روانگی کے وقت لارڈ لورین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمھاری سکیم میں موجود ہے لیکن اس کے باور ہونے کے لیے پچیس سال کی مدت درکار ہوگی۔ پنجاب کے بعض مسلمان تو پہلے ہی شمال مغربی ہند کی ایک مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پر غور کر رہے ہیں اور یہ خیال پھیلتا جا رہا ہے۔

اس امر میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ ہماری قوم ابھی تک نظم و ضبط سے محروم ہے؟ اور شاید اسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبے میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار مجبوراً اختیار کرنا ہی پڑے گا۔

میرے خیال میں تو دستور جدید سارے ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے۔

مخلص

محمد اقبال

لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام

(۱)

لاہور۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء۔

مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب۔ السلام علیکم!

کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اس وقت سے میرا دل بےقرار تھا اور عریضہ خدمت عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تا کہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متأثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھی ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو۔ اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے۔
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے!

لارڈ بیکن کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے، سو یہ حال میرا ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ بعض کام

اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنا پڑے اور ان ہی میں طبع سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی تا تمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ غـرّۂ شوال پر چند اشعار لکھے تھے۔ "زمیندار" اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوے۔ ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے چند اشعار ایسے لکھے ہیں کہ ٹرکی و اٹلی کی جنگ نے ان کی تصدیق کر دی ہے اگر "زمیندار" اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوا دوں گا۔ خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے۔ مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو زیارتِ روضہ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقادر لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے ہیں۔ کچھ دن ہوے وہ یہاں آئے تھے مگر میں ان سے نہ مل سکا۔ آرڈر قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے۔ مگر اس راہ میں مشکلات بے حد ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں بہر حال میں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتا، آپ دعا کریں۔

خیریت مزاج سے مطلع کیجیے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپ کو صحت کامل مرحمت فرمائے۔

دعا گو

محمد اقبال بیرسٹر۔ لاہور

(۲)

لاہور۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء۔

مخدومی! السلام علیکم!

نوازش نامہ ملا۔ دونوں اشعار لاجواب ہیں۔

"فطرت کی زبان جس کو سمجھو"

سبحان اللہ! یہ طرز اور معنی آفرینی خاص آپ کے لیے ہے کوئی دوسرا یہاں مجالِ دم زدن نہیں رکھتا۔ اور دوسرا شعر

"جو کچھ قسمت بھی ہوتی"

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں، اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آتا۔

کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک تنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر منصب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا اور اگر خدائے تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیوں کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔

کئی صدیوں سے علماء اور صوفیہ میں طاقت کے لیے جنگ رہی۔ جس میں آخرکار صوفیہ غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں، وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہردلعزیز نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ روش گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت

کے احیاء کی کوشش کی ۔ مگر صوفیہ کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا ۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں ۔ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں قوت عمل مفقود ہے ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل رکھتا ہو مل جائے ۔ جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں گا ۔ زیادہ کیا عرض کروں ، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو ۔

آپ کا خادم
محمد اقبال

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام

(۱)

لاہور ۔

۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء ۔

مخدومی ! جناب مولانا

نوازش نامہ ابھی ملا ۔ اس سے پہلے بھی آپ کا خط مع تجویز ملا تھا ۔ مگر میں علالت کے باعث جواب جلد نہ لکھ سکا ۔ پہلے سے اچھا ہوں مگر افسوس کہ ابھی سفر کے لائق نہیں خصوصاً جب کہ سفر بارہ گھنٹے سے زیادہ ہو ۔ رات بھر ریل میں بھی سفر کرنے سے مجھے قبض ہو جاتی ہے ۔ جو سخت تکلیف دیتی ہے اور یہ سلسلہ کئی کئی رات رہتا ہے ۔ بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک سفر کے قابل ہو گیا تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا ۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیۃً آپ

کے ساتھ ہوں ۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ۔ تاہم میری لسانی عصبیت ، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔

آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ۔ میرے خیال میں صرف دو باتیں زیر بحث آئیں گی ۔

اول یہ کہ فنڈ کہاں سے آئے گا ۔ عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے ۔ امراء توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان امراء مقروض ہیں ۔

دوم یہ کہ صدرِ انجمن کا مستقر کہاں ہو ؟ میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں :

۱۔ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ، ان کا میدان پنجاب ہو گا ۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی کیونکہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سر زمیں معلوم ہوتی ہے ۔

۲۔ آپ انجمن اردو کے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں ، اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف سے بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں ۔

۳۔ یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح اور ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ ایک معمولی جلسے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ بیس بیس ہزار کا مجمع بھی غیر معمولی بات نہیں۔ یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی

باقی رہا آپ کے خط کا آخری فقرہ سو میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ انسان جب تک زندہ ہے، افکار و ترددات لازمۂ حیات ہیں۔

”مرتا ہوں جو بے چین گھڑی بھر نہیں ہوتا“

معنوی اعتبار سے تو مدت ہوئی میں نے اسے آپ ہی پر چھوڑ دیا تھا اب ظاہری اعتبار سے بھی چھوڑتا ہوں کیونکہ آپ ایک صاحب عزم آدمی ہیں اور یہ بات مجھے مدت سے معلوم ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید ہے آپ کا مزاج بخیریت و عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص
محمد اقبال

سوالات

۱۔ علامہ اقبال کے نزدیک نہرو کے خطبے کی کس لحاظ سے اہمیت ہے؟

۲۔ اقبال کے خیال میں ایشیا میں اسلام کے اقتدار کا انحصار کن باتوں پر ہے؟

۳ - ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا مستقبل کن وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے ؟

۴ - علامہ اقبال نے قائد اعظم کی ذات سے راہنمائی کی جو توقعات وابستہ کیں ان کی کیا وجوہات تھیں ؟

۵ - ہندوستان کی سیاست میں ہندو مہا سبھا کا کردار کیا رہا ہے ؟

۶ - اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے سے کیسے بچایا جا سکتا تھا ؟

۷ - اقبال کی نظر میں تقسیم ملک کیوں ضروری تھی ؟

۸ - مولوی عبدالحق کے نام خط میں علامہ اقبال نے پنجاب کے مسلمانوں کی صلاحیت کے بارے میں کیا تحریر کیا ہے -

۹ - اکبر الہ آبادی کے نام خط میں علامہ اقبال نے کن اہم باتوں کا ذکر کیا ہے ؟

۱۰ - علماء اور صوفیہ کی فکری جنگ میں علامہ کے نزدیک کسے شکست ہوئی ؟

۱۱ - علامہ اقبال کن وجوہات کی بنا پر لاہور کو ''انجمن ترقی اردو'' کا مستقر بنانا چاہتے تھے ؟

۱۲ - ''دار و مدار'' میں ''و'' حرف عطف ہے - اس قسم کے مرکب کا کیا نام ہوتا ہے - ان خطوں میں سے اس قسم کے اور مرکبات تلاش کیجیے -

———:o:———

چودھری افضل حق

(۱۸۹۱ - ۱۹۴۲ء)

چودھری افضل حق پنجاب پولیس میں ملازم تھے مگر ۱۹۲۰ میں ملازمت ترک کر کے تحریک خلافت کے سرگرم رکن بن گئے اور مدتوں قید و بند کی مصائب برداشت کرتے رہے۔ ان تجربات کو انھوں نے ''زندگی'' میں بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

''خادم خلق کی کہانی'' چودھری صاحب کی کتاب ''زندگی'' کا ایک اقتباس ہے۔ اس میں ایک شخص مرنے کی روداد بیان کرتا ہے۔

ایک خادم خلق کی کہانی

میں نے ابھی ابھی عمر کی پچیس بہاریں دیکھی تھیں۔ مستِ شباب تو تھا ہی۔ والد مرحوم نے دریا کے کنارے ایک خوشنما اعلیٰ درجے کا مکان تیار کرایا تھا۔ یہ جگہ میری دل پسند تھی، برسات کا موسم تھا۔ ایک دن ٹھنڈی ہوائیں چلیں، گھٹائیں جھوم کے اٹھیں، بادل تھوڑی دیر تک دل کھول کر برسا۔ پھر مطلع صاف ہوگیا، میں اس مکان کے بالائی حصے میں مستِ سرور بیٹھا تھا، ساز اور آواز آپس میں مل جاتے تھے۔ یونہی دوپہر ڈھل گئی۔ ابر کا ایک ہلکا سا آوارہ ٹکڑا آفتاب کے چہرے پر چھا گیا۔ افقِ مشرق پر خوش نما قوسِ قزح نمودار ہوئی۔

میں نے شغل طرب چھوڑا اور چھت پر چڑھ کر آسمان کا نکھار دیکھنے لگا دریا چڑھاؤ پر تھا۔ پانی کناروں سے اچھل اچھل پڑتا تھا۔

میں نے اپنی عمر میں ایسی طغیانی اور اتنا پاٹ نہ دیکھا تھا - ابھی پانی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا - کیا دیکھتا ہوں ، ایک ملاح ہلکی کشتی پر بہت سی سواریاں لیے آ رہا ہے - دریا کی موجیں ایک دوسری سے ٹکرائیں اور بھنور بنا - کشتی گرداب میں پھنسی ، ملاح نے بہتیرا سنبھالا مگر کچھ پیش نہ گئی - ادھر میں بھی ہمہ تن متوجہ تھا ، کھڑا کھڑا افراطِ اضطراب سے بے چین ہو گیا اور پکارا سنبھل سنبھل - مگر کشتی نہ سنبھلی :

الٰہی ! میلوں کا پاٹ ، بانسوں کی گہرائی ، ڈوبنے والے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور امداد کے لیے پکارتے تھے - وہ بے کسی کا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا - رحم ! رحم ! خدایا رحم ! کہتا ہوا میں حوصلہ کر کے پانی میں کودا اور شیر کی طرح دریا کے جگر کو چیرتا ہوا کشتی تک جا پہنچا - سواریوں میں بعض لوگ تیراک تھے وہ جان بچا کر ساحلِ سلامتی تک پہنچنا چاہتے تھے - میں زور سے پکارا کہ نامردو ! عورتوں اور بچوں کو منجدھار میں چھوڑے جاتے ہو - کچھ غیرت مند پلٹے - باقیوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا - اس وقت ایک ایک کا سنبھالنا مشکل تھا - میں نے دو بچوں اور ایک عورت کو سنبھالا اور لے چلا - کچھ دور جا کر معلوم ہوا بوجھ قوتِ برداشت سے بہت زیادہ ہے - کنارہ ابھی دور تھا - دل نے ہمت تو نہ ہاری مگر مصلحت نہ مانی ، مجبوراً ایک لڑکے کو خدا کے حوالے کرنا پڑا - وہ ڈوبنے لگا - ایک دفعہ عاجزی اور حیرت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے - فرطِ رحم نے دو اور جانوں کی ذمہ داری سے غافل کر دیا - میں نتیجے سے بے پرواہ ہو کر بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کو بھی اٹھا لوں - پھر خیال آ گیا کہ اس بارِ عزیز کو تو جان بوجھ کر پھینکا ہے - اک جگر پاش آہ نکلی - اس نے مجھے نگاہِ حسرت سے ، میں نے اسے نگاہِ ترحم سے دیکھا - اس نے غوطہ

دھایا اور لاکھوں من پانی اس کے اوپر سے گزر گیا ۔ اتنے میں میں نے اپنے وفادار ملازم کی آواز قریب ہی سنی کہ آقا جان ! میں آ گیا ہوں ۔ میں نے کہا گل نواز اس لڑکے کو جلدی لینا ۔ لڑکا ابھرا ہاتھ پاؤں مارے ، چیخا ، دوسرا غوطہ کھانا چاہتا تھا کہ گل نواز تیر کی طرح پہنچا ، پھول کی طرح لڑکے کو اٹھا لایا اور ہم سہمی ہوئی جانوں کو لے چلے ۔ گل نواز بولا : "آقا جان آپ بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیر کر کنارے کی طرف آئیے ۔ میرا بوجھ کم ہے میں دریا کو چیرتا ہوا آ ملتا ہوں ۔" میں نے کہا جلدی کنارے پہنچو تاکہ جلدی واپس آئیں ۔ شاید کوئی جان بچ سکے ۔ ہم دونوں جلدی جلدی دریا چیرتے پار ہوئے ۔ بچے ڈرے ہوئے دریا سے دور جا کھڑے ہوئے ۔ عورت نے سو دعائیں دیں ۔ میں نے جو دریا کی طرف نظر اٹھائی ۔ دوسروں کو جو پہلے تیرتے تھے ، ڈوبتے ڈوبتے دیکھا معلوم ہوا کہ تیرنے میں پورے مشاق نہ تھے ۔ میں دیکھتے ہی پھر پانی میں کودا اور کہا گل نواز آؤ ان کو بچائیں ۔ اس نے کہا "آقا جان۔" وہ جواں ہمت بوڑھا ایسا شہزور تھا کہ شیر کی طرح سیدھا بڑھتا آیا میرے پیچھے پانی میں پاؤں ڈالا تھا ۔ لیکن مجھ سے پہلے پہنچا اور ایک ڈوبتے کو سہارا دیا ۔ میں بھی زور لگا کر پہنچا ۔ دوسرے کو میں نے بچایا ۔ اب ہم سوئے ساحل چلے ، اگرچہ میں راحت اور آرام کے حصول میں دریا دل تھا ۔ روپے پیسے کو اس کے لیے پانی کی طرح بہاتا تھا لیکن اس وقت مجھے ایسا اطمینانِ قلب نصیب تھا اور ایسی سچی خوشی حاصل تھی کہ دولتِ دنیا دے کر میسر نہ آ سکتی تھی ۔ میں وفورِ مسرت میں کہنے لگا : "گل نواز ! ساحل پر پہنچ لیں ، تجھ کو اتنی دولت دوں گا کہ تیری اولاد بیٹھی کھائے گی ۔" یہ سن کر وہ رویا ۔ اسے دیکھ کر میں آبدیدہ ہو گیا ۔ دونوں کو پریشانی ۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو انعام کی خاطر جان

خطرے میں ڈال دیتے ہیں - بہادر اور شریف کے لیے کوئی انعام کافی بھی کیونکر ہو سکتا ہے - اسے افسوس ہوا کہ میں نے اسے ایسا سمجھا ، مجھے شرم آئی کہ میں نے کیا کہ دیا - اسے کلام کا یارا نہ رہا - مجھے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی - گو بظاہر تیرتے جا رہے تھے لیکن در اصل دریائے حیرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے -

اب کچھ دور چل کر معلوم ہوا کہ سانس پھول رہا ہے - میں نے ہمت کر کے رفتار تیز کر دی - پانچ دس قدم گیا تھا کہ بوجھ پہاڑ معلوم ہوا - خود غرضی نے کہا : جان ہے تو جہان ہے - ایک دوسرے کی جان بھی نہ بچائی اور اپنی بھی ساتھ گنوائی - یہ کہاں کی دانائی ہے ؟ غیرت بولی جس کو سہارا دیا اس کو پار نہ اتارا یہ کیسی بھلائی ہے ؟ تہوّر مصلحت پر غالب آیا ، خود غرضی نے غیرت سے شکست کھائی - نیچے سے آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا آخری زور لگایا - کنارا قریب ہی تھا کہ میرا دم ٹوٹ گیا اور جسے بچا رہا تھا ، ہاتھ سے چھوٹ گیا - اس میں کس قدر سکت باقی تھی - وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا - میں غوطے کھانے لگا - قسمت کے کھیل ہاتھ پاؤں مارتے اس کے پاؤں زمین پر جا لگے - میں کنارے سے اور الگ ہوتا ہو گیا - جو ڈوب رہا تھا - وہ بچ نکلا اور جو بچانے آیا تھا وہ ڈوب چلا - آخری غوطے سے قبل میں نے دیکھا کہ تمام تماشائیوں کی اس مختصر جماعت میں جن کو ابھی بچایا تھا - اضطرابِ عظیم پیدا ہے - بچے بلک بلک کر میری سلامتی کے لیے یا خدا رحم یا خدا رحم ! پکار رہے تھے - گل نواز نے میرا حال دیکھا - چیختا ہوا پانی میں کودا - یہ آخری نظارہ تھا جو میں نے روئے زمیں پر دیکھا - لوگ مضطرب تھے - میں مطمئن کہاں مجھ سا فاسق و فاجر کہاں - یہ شاندار موت ؟ مجھے اس کا وہم بھی نہ گزرا تھا -

سوالات

۱ - گل نواز کیسا آدمی تھا؟ انعام کا نام سن کر وہ کیوں رو دیا تھا؟

۲ - کہانی کا نوجوان جب ڈوبنے لگتا ہے تو کنارے پر کھڑے لوگ اس کی سلامتی کی دعا کیوں مانگتے ہیں؟

۳ - نوجوان ڈوبتے وقت مطمئن کیوں تھا؟

۴ - مندرجہ ذیل کو فقروں میں استعمال کیجیے۔
مستِ سرور ، قوسِ قزح ، گرداب ، ساحلِ سلامتی ، غیرت مند ، فرطِ رحم۔

۵ - فرط رحم مرکب اضافی ہے - اس سبق میں سے مرکب اضافی کی چند اور مثالیں تلاش کر کے لکھیے۔

۶ - مندرجہ ذیل مصادر سے حاصل مصدر بنائیے۔
ابالنا - چھڑکانا - لکھنا - بولنا - چلنا - بچھڑنا - کانپنا -

سیّد امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ - ۱۹۷۰ء)

تاج صاحب کے آباؤ اجداد اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آئے۔ ان کے والد مولوی سید ممتاز علی عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی والدہ محمدی بیگم بھی اردو کی مشہور مصنّفہ گزری ہیں۔

تاج صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے انھیں لکھنے کا شوق تھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد اکسٹھ ہے۔ مگر ان کی دلچسپی کا اصل میدان ڈرامہ ہے۔ تاج صاحب کا شمار اردو کے بڑے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کا شاہکار ڈرامہ "انارکلی" شائع ہوا۔ انھوں نے ریڈیو اور سٹیج کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ "آرام و سکون" ان کا ایک ریڈیو ڈرامہ ہے۔

آرام و سکون

ڈاکٹر: جی نہیں بیگم صاحبہ! تردد کی کوئی بات نہیں، میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے۔ صرف تھکان کی وجہ سے حرارت ہو گئی ہے۔ ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں۔

بیوی: ڈاکٹر صاحب! ان دنوں کیا، ان کا ہمیشہ یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام کے سات بجے سے پہلے کبھی

واپس نہیں آتے۔

ڈاکٹر : جبھی تو میرے خیال میں انہیں دوا سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ کاروبار کی پریشانیاں اور الجھنیں بھلا کر ایک ہی روز آرام و سکون سے گزرا تو طبیعت انشاء اللہ بحال ہو جائے گی۔

بیوی : بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں۔ اتنا کام نہ کیا کرو، نہ کیا کرو۔ نصیبِ دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھوگے۔ مگر خاک اثر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں، کیا کیا جائے۔ ان دنوں کام بے طرح زور پر ہے۔

ڈاکٹر : ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام و سکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

بیوی : یہ بات آپ نے انہیں بھی سمجھائی؟ میں نے کہا سن رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟

میاں : ہوں!

ڈاکٹر : جی ہاں۔ میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کر دی ہے۔ کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں۔

بیوی : تو تاکید کیا میں نہیں کرتی؟ مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو!

ڈاکٹر : جی نہیں ابھی انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ پورے طور سے میری ہدایات پر عمل کریں گے!

بیوی : اور دوا کس کس وقت دینی ہے؟

ڈاکٹر : جی نہیں۔ دوا کی مطلق ضرورت نہیں۔ بس آپ صرف ان

کے آرام اور سکون کا خیال رکھیے ۔ غذا جو کچھ دینی ہے ، میں لکھ چکا ہوں ۔

بیوی : بڑی مہربانی آپ کی ۔

ڈاکٹر : تو پھر اجازت ۔

بیوی : فیس میں آپ کو بھجوا دوں گی ۔

ڈاکٹر : اس کی کوئی بات نہیں ۔ آ جائے گی ۔

بیوی : (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للو ۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو ۔

ڈاکٹر : ایک بات عرض کر دوں بیگم صاحبہ ۔ مریض کے کمرے میں شور و غل نہیں ہونا چاہیے ۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے ۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویت بخشتی ہے ۔

بیوی : مجھے کیا معلوم ڈاکٹر صاحب ۔ آپ اطمینان رکھیں ان کے کمرے میں پرندہ پر نہ مارے گا ۔ (ملازم آتا ہے)

للو : حضور !

ڈاکٹر : اٹھا لو یہ بیگ ۔ تو آداب !

بیوی : آداب (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں ، قریب آ کر) میں نے کہا سو گئے کیا ؟

میاں : ہوں ! یونہی چپکا پڑا ہوا تھا ۔

بیوی : بس بس ۔ بس بس چپکے ہی پڑے رہیے ۔ ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ نہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے ۔ اس سے بھی تھکان ہوتی ہے ۔ تمام وقت پورے آرام اور سکون میں گزاریں ۔ سمجھ گئے نا ؟

میاں : ہوں (کراہتا ہے) ۔

بیوی : کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا ؟

میاں : ہوں ۔

بیوی : کہو تو دبا دوں ؟

میاں : ہوں ۔

بیوی : سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں ؟

میاں : اچھی بات ۔ (کراہتا ہے) ،

بیوی : اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ؟ اچھا بلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں ۔ گھنٹی کہاں گئی ؟ رات میں نے آپ یہاں میز پر رکھی ہے ۔ اللہ جانے یہ کون اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے ؟
(کنڈی کی آواز) کون ہے یہ نا مراد ؟ ارے للو ! دیکھو یہ کون کواڑ توڑے ڈال رہا ہے ؟ للو (دور سے) سقہ ہے بیوی جی ! ۔

بیوی : سقہ ؟ گھر میں بہرے بستے ہیں ۔ جو کمبخت اس زور سے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے ؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے ۔ ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور و غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو یہ کیا وقت ہے ، پانی لانے کا ۔ اچھی خاصی دوپہر ہونے آ گئی ہے ۔ کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی ۔ میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے ۔ کان پر جوں ہی نہیں رینگتی ۔

میاں : ارے بھئی اب بخشو اسے ۔

بیوی : بخشوں کیسے ؟ ذرا طرح دو تو یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں ۔

میاں : ہوں ۔ (کراہتا ہے) ۔

بیوی : کیوں ۔ زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے ؟

میاں : ہوں ۔

بیوی : للو سے کہوں آ کر دبا دے ؟

میاں : اوں ہوں !

بیوی : یہ دیکھو ۔ یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے ۔ آپ بتائیے آپ سے آپ آ گئی یہاں ؟ پاؤں تھے اس کے ؟ یہ سب حرکتیں اس للو کی ہیں ۔ کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہنے دے گا ۔
اللہ جانے یہ نامراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے ؟
او للو ! ارے للو ۔

میاں : ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو ۔ گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دی تھی ۔ ہوں (کراہتا ہے) ۔

بیوی : تم نے ؟ اے ہے وہ کیوں ؟

میاں : ننھا بار بار بجائے جا رہا تھا ۔ میرا دم الجھنے لگا تھا ۔ ہوں (کراہتا ہے) ۔

للو : (آ کر) مجھے بلایا ہے بیوی جی ؟

بیوی : کمبخت ۔ اتنی دیر سے آوازیں میں دے رہی ہوں ، کہاں مر گیا تھا ؟

للو : آپ نے ریٹھے کوٹنے کو کہا ۔ وہ گودام میں ڈھونڈھ رہا

تھا ۔

میاں : ہوں (کراہتا ہے) ۔

بیوی : صبح سویرے کہا تھا ، کمبخت تجھے اب تک ریٹھے مل نہیں چکے ؟

للوا : جی مہلت بھی ملے ۔ ادھر گودام میں جاتا ہوں ، ادھر کوئی بلا لیتا ہے ۔

بیوی : ہاں بڑا کام رہتا ہے نا ! بچارے کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی ۔ بھاگ یہاں سے نکل جا کر ریٹھے ڈھونڈ (للو جاتا ہے)

بیوی : تو یہ گھنٹی یہاں تمھارے سرھانے رکھ جاتی ہوں ۔

میاں : (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا ۔

بیوی : پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا ؟

میاں : (تنگ آ کر) نہیں بابا نہیں ۔

بیوی : ارے ہاں ۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں ۔ کہاں گیا ان کا لکھا ہوا کاغذ ؟ اے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے ۔ ابھی کہیں کوڑے میں چلا جاتا تو ۔ ہوں ۔ مالٹڈ ملک (MALTED MILK) ، نارنگی کا رس ، ساگو دانے کی کھیر ، یخنی کیا تیار کرا دوں اس وقت کے لیے ؟

میاں : جو جی چاہے ۔

بیوی : اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال ؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھ کو ؟

میاں : ساگودانہ بنا دینا تھوڑا سا ۔

بیوی : بس ؟ اس سے کیا بنے گا ۔ یخنی پی لیتے تھوڑی سی ۔ چوزے

کی یخنی بنوائے دیتی ہوں ۔ مقوی چیز ہے ۔

میاں : بنوا دو ۔

بیوی : (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا ۔ دیر لگ جائے گی ۔ یخنی کی تیاری میں ، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا اس للو اللہ مارے کو تو جانتے ہو ۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے ۔

میاں : اوں ۔ ہوں ۔

بیوی : تو پھر یوں کرتی ہوں ۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے) ۔

میاں : ارے بھئی ۔ اب یہ کیا کھٹ پھٹ شروع ہو گئی ۔

بیوی : ننھا ہے ۔ آپ کا ۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا ۔ نہ اس کمبخت کا دل اس سے بھرتا ہے ، نہ وہ کمبخت ٹوٹتی ہے ۔ ارے میں نے کہا ننھے نہیں مانے گا ؟ نامراد ۔ چھوڑ اس اپنی پٹ پٹ کو ۔ جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے ۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پر ہونے ہی میں نہیں آتا ۔ چولھے میں جھونک دوں گی ۔ اس کمبخت کو اتنا خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں ۔ شور و غل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے ۔

میاں : ہوں ۔ (کراہتا ہے) ۔

بیوی : کم نہیں ہوا درد ؟

میاں : اوں ۔ ہوں ۔

بیوی : دبوا لیتے تو گھٹ جاتا ۔

میاں : اوں ۔ ہوں ۔

بیوی : تو میں کیا کہہ رہی تھی ؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی ۔

(پھر ننھے کی پٹ پٹ کی آواز) پھر وہی - نہیں مانے گا نامراد ٹھہر تو جا - (غصے میں جاتی ہے - میاں کراہتا ہے - دور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے) -

چھوڑ اپنی یہ پٹ پٹ - (بچہ رونے لگتا ہے -) چپ نامراد اتنا خیال نہیں - ابا بیمار پڑے ہیں - ڈاکٹر نے کہا ہے - شور و غل نہ ہو - انھیں تکلیف ہوگی - چپ ! خبردار جو آواز نکالی گلا گھونٹ ڈالوں گی - (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کمبخت کا جو کھیل ہے ، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے چل ادھر - نہیں چپ ہو گا - تو ؟ کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے (میاں اس ہنگامے سے زچ ہو کر کراہے جا رہا ہے - بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی کمرے میں جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے) -

میاں : (چونک کر) ہوں ؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی - لاحول ولا قوۃ ارے کیا ہو رہا ہے ؟

ملازم : جھاڑو دے رہا ہوں میاں -

میاں : کمبخت دفع ہو یہاں سے -

ملازم : جھاڑو نہ دی تو خفا ہوں گی بی بی جی -

میاں : بیوی جی کا بچہ - نکل یہاں سے - کتہ دے ان سے (ملازم جاتا ہے) - کواڑ بند کر کے جا - (میاں کراہ کر چپ ہو جاتا ہے ، ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہی) ارے بھئی کہاں گئیں ؟ ارے کوئی ٹیلیفون سننے تو آؤ - لاحول ولا قوۃ - (خود اٹھتا ہے) ہیلو میں اشفاق بول رہا ہوں - بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں - اس وقت کمرے میں نہیں ہیں جی - یہاں کوئی ایسا نہیں جو انھیں بلا لائے - میں علیل

ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے ؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں کہ گلا بھی خراب ہو۔ آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا۔ میں نے عرض کیا نا ، چونکہ میں بیمار ہوں ، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ (زور سے فون بند کرتا ہے) بد تہذیب۔ گستاخ کہیں کی۔ ہوں۔

بیوی : مجھے بلایا تھا ؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں۔

میاں : اتنی آوازیں دیں کوئی سنے بھی۔

بیوی : توبہ توبہ لیٹو لیٹو میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی۔ اے للو کو ریٹھے نکال کر دے رہی تھی۔ بلایا کیوں تھا ؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے)۔

میاں : فون تھا تمھارا۔

بیوی : کس نے کیا تھا ؟

میاں : ہو گا کوئی اب مجھے کیا پتہ۔

بیوی : جب اٹھ ہی کھڑے ہوئے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا۔

میاں : میں نے کہہ دیا تھا پھر کر لیں فون۔

بیوی : مفت کی الجھن میں ڈال دیا۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی۔

میاں : اے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا۔ ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحبزادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

بیوی : اب اسے کیونکر روک دوں میں ؟

میاں : بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو۔ میں بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے

کہا ہے میرے لیے آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ ایک روز ان صاحبزادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی!

بیوی : کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں۔

میاں : مناسب الفاظ میں لکھوانا۔ ہوں (کراہتا ہے)۔
(بے سرے گانے کا شور جاری ہے۔ میاں کراہ رہا ہے۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز)۔

بیوی : ارے کیا ہو گیا ننھے۔

بچہ : (زور سے) گر پڑا خون نکل آیا۔

بیوی : (زور سے) خط لکھ رہی ہوں ابھی آئی چپ ہو جا۔

میاں : (کراہتے ہوئے) یک نہ شد دو شد۔

بیوی : توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں انسان کو دیکھ رہے ہیں۔ خط لکھ رہی ہوں۔ بچے کو چپ کیونکر کرا سکتی ہوں۔ نامراد چپ ہو جا۔ خون نکل آیا تو کیا قیامت آ گئی۔ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں۔
(میاں کراہتا ہے۔ بے سرے گانے اور بچے کے رونے کی آواز جاری ہے)۔

میاں : ختم نہیں ہوا خط؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو۔

بیوی : ابھی ہوا جاتا ہے ختم۔
(اس غل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے)۔

فقیر : بال بچے کی خیر۔ راہِ مولا کچھ مل جائے فقیر کو۔

میاں : (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی۔ ہوں۔

بیوی : تو اب میں تو اسے بلا کر لے نہیں آئی،

میاں : ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ۔

بیوی : او للو ! ارے او للو !

(للو ہاون دستے میں ریٹھے کوٹنے شروع کر دیتا ہے بے سرے گانے میں بچے کے رونے اور فقیر کی صدائیں اور ہاون دستے کی دھمک اور شامل ہو جاتی ہے)۔

میاں : ہائے توبہ ، توبہ ، ہائے۔

بیوی : ارے نامراد ریٹھے پھر کوٹ لینا۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر دے۔

(للو ریٹھے کوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سنتا)۔

میاں : (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) میری ٹوپی اور شیروانی دینا۔

بیوی : ٹوپی اور شیروانی۔

میاں : ہاں میں دفتر جا رہا ہوں۔ ابھی دفتر جا رہا ہوں۔

بیوی : ہے ہے وہ کیوں ؟

میاں : آرام اور سکون کے لیے۔

سوالات

۱۔ اس ڈرامے میں کتنے کردار ہیں ؟
۲۔ ڈاکٹر نے کیا مرض تشخیص کیا ؟
۳۔ پریشانی اور الجھن جیسی بیماری کا کیا علاج ہو سکتا ہے ؟
۴۔ گھر میں آرام اور سکون کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
۵۔ بیوی نے جن باتوں کے لیے شور مچایا ہوا تھا۔ کیا شور کیے بغیر وہ کام ہو سکتے تھے ؟

۶ ۔ میاں نے ٹوپی اور شیروانی کس لیے مانگی ؟

۷ ۔ مختصر طور پر بیوی کے کردار پر روشنی ڈالیے ؟

۸ ۔ مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کو فقروں میں استعمال کیجیے ۔

تردد ۔ نصیبِ دشمناں۔مضر ۔ تکان ۔ ناحق ۔ مقوی ۔ علیل ۔ کراہتا ۔

۹ ۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے فقروں میں استعمال کیجیے ۔

خاک اثر نہ ہونا ۔ ہاتھ دھو بیٹھنا ۔ پرندہ پر نہ مارے گا ۔ کان پر جوں نہ رینگنا ۔ دم الجھنا ۔ سر کھجانے کی ضرورت نہ ہونا ۔ دل نہ بھرنا ۔ زچ ہونا ۔

۱۰ ۔ لکھنا فعل متعدی ہے یعنی اس کے لیے فاعل کے علاوہ ایک مفعول کی ضرورت بھی ہوتی ہے اس سے 'لکھوانا' فعل متعدی المتعدی یعنی ہے اس میں ایک سے زیادہ مفعولوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی قسم کے دس افعال تلاش کیجیے اور ان کی دونوں شکلیں لکھیے ۔

عبدالمجید سالک

(۱۸۹۴ - ۱۹۵۹ء)

عبدالمجید سالک بٹالے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹھانکوٹ میں پائی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ چند سال "تہذیب نسواں"، اور "پھول"، کے نائب مدیر رہے۔ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ 'زمیندار' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی اخبار 'انقلاب' نکالا۔

سالک صاحب شاعر، انشا پرداز، مزاح نگار اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ نثر میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ زبان اور بیان پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کی تصانیف میں 'ذکر اقبال' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے علامہ اقبالؒ کے حالات بڑے دلکش انداز میں تحریر کیے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے اخلاق و عادات 'ذکر اقبال' کا ایک اقتباس ہے۔

علامہ اقبال کے اخلاق و عادات

قناعت کا عالم یہ تھا کہ کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی۔ وکالت کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی کبھار مقدمہ لے لیا۔ شہرت و ناموری حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ علامہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے جن کی آمدنی سے ان کا

خرچ پورا ہو جاتا ۔ مصارف خانگی میں انتہائی کفایت شعاری مدنظر تھی ۔ آمد و خرچ کا حساب باقاعدہ رکھتے تھےاور آخر وقت تک اس شعار پر کار بند رہے ۔ جب آخر عمر میں علالت کی وجہ سے ذرائع مفقود ہو گئے اور نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تو علامہ نے اپنے مصارف کے لیے اس کو کافی سمجھا سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا ۔

”میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے ۔ جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں آپ کو میرے خط سے یقیناً تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہمارے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ۔ ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے ۔“

سادگی پسندی کے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو ۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوے ہیں ، اس نے بورے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا ۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا ۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا ۔ ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی

اور جب تک وہاں مقیم رہے ، غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ غیرت کا نقصان صرف احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور قانع آدمی محتاج نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد دکن نے علامہ اقبال کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا چونکہ یہ دوستانہ ہدیہ نہ تھا بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ اپنا علامہ اقبال کی غیرت مندی کو گوارا نہ تھا اس لیے آپ نے ـــــ چیک واپس کر دیا۔

جائز ناجائز کے متعلق بے حد محتاط تھے۔ وکیلوں کے پاس مؤکل عام طور پر تحائف و ہدایا لاتے ہیں اور یہ محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ علامہ کو ان تحفوں کے قبول میں بھی تامل تھا۔ چنانچہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کر کے سوال کیا ہے کہ آیا ایسا مال مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔

بزرگوں کے ادب میں انتہائی اہتمام کرتے تھے۔ پروفیسر منظور احمد (ہمشیر زادہ علامہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علامہ اقبال سیالکوٹ میں رحیما عطار کی دوکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ دھرا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ جو پاؤں تختے پر تھا اس کا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ ، ادھر سے گزرے اور علامہ اقبال کی نظر ان پر پڑ گئی۔ جھٹ تختے پر سے پاؤں نیچے کیا۔ جوتے کا پاؤں تختے پر ہی چھوڑا اور صرف ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے اپنے استاد محترم کی طرف لپکے۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ اقبال گردن جھکائے ان کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ جا رہے تھے۔ ایک

پاؤں میں جوتا تھا ۔ دوسرے میں نہ تھا ، حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پنہچا کر واپس آئے اور پھر اپنا جوتا پہنا ۔ کیا آج کل کے زمانے میں اس ادب و اخلاق اور طبعی سعادت کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے ؟

غرض علامہ نہایت سادہ مزاج ، درویش صفت ، متوکّل اور عاشقِ رسول مسلمان تھے ۔ علم و فضل و شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی منکسر مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ غرباء کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے اور امراء کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ کرتے تھے ۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندو ، سکھ اور عیسائی بھی ان سے دلی محبت کرتے تھے ۔ کیونکہ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا ، جس میں کسی طرح کی کدورت نہ تھی ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔

سوالات

۱ ۔ مصنف نے علامہ اقبال کی سادگی اور قناعت پسندی کے بارے میں کیا لکھا ہے ؟

۲ ۔ عشقِ رسول کے بارے میں مصنف نے علامہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے ۔ اس کا خلاصہ تحریر کیجیے ۔

۳ ۔ علامہ اقبال نے 'سر راس مسعود' کو جو خط تحریر کیا اس سے ان کے کردار کی کون سی صفت ظاہر ہوتی ہے ۔

۴ ۔ ''ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا'' اس فقرے میں دل کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ اسی قسم کے پانچ فقرے بنائیے جن میں کوئی تشبیہ موجود ہو ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴ - ۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دلی کے رہنے والے تھے - سینٹ سٹیفن کالج دلی سے بی - اے - کیا تعلیم سے فارغ ہو کر حیدرآباد چلے گئے - پہلے محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے - ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدے تک پہنچ گئے -

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر سادہ اور پر لطف ہوتا ہے - وہ بڑے شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں - دلی کی خاص زبان لکھنے میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں - انھیں بے جا بناوٹ سے نفرت تھی - وہ جو کچھ لکھتے تھے ، دلی کی عام بول چال میں لکھتے تھے اور جا بجا مزاح کی چاشنی سے اس میں لطف پیدا کرتے جاتے تھے ان کے اکثر مضامین میں اصلاحِ معاشرہ کا پہلو نمایاں ہے - مگر ان کا انداز کہیں بھی خشک اور بے مزہ نہیں ہونے پاتا - مندرجہ ذیل اقتباس میں انھوں نے ایک مشاعرے کی تیاری کا نقشہ کھینچا اور انگریزی دور سے پہلے کی دلی تہذیب کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا ہے -

دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ

نواب زین العابدین خان کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری اور نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر ان کی صورت دکھائی دیتی - اس لیے ان

سے ملنا نہیں ہوا۔ کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں۔ کوئی کہتا کہ بھئی کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں؟ لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے۔ کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلنار آرائش کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی طرف دہلیز تک روشنی کا عالم یہ ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف تم نے تو کمال کر دیا ہے" کہاں وہ بے چارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے جا رہے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اس پر

قالینوں کا حاشیہ ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار ، جھاڑوں ، فانوسوں ، هانڈیوں ، دیوار گیریوں ، قمقموں ، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا ۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے ۔ سامنے کے صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کار چوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا ۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے ۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتون کی ڈوریوں سے جس کے کونوں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر لیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں ۔ وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں ، وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے ۔ اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے کھنچی ہوئی تھی ۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا ۔ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں ۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے سجا ہوا تھا ۔ جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے ۔ تمام مکان مشک ، عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا ۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطاریں تھیں ۔ حقے کے بیچ

میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی ، وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیے تھے ۔ خاصدان میں لال قندیل کی صافیوں میں پان لپٹے ہوئے تھے ۔ پان گلوریوں کی صاف پر اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہ پھولوں کی آ گئی تھی خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا ۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان اندر کافور کی بتیاں اور ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن ، لگنوں میں عرق کیوڑہ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا ۔ میں تو الف لیلیٰ کا ابوالحسن ہو گیا ۔ جدھر نظر جاتی تھی ، ادھر ہی کی ہو رہتی ۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا ۔ سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے یہ سلاطین زادے ہیں ،کوئی ستر برس کے پیٹے میں استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ۔ بہت رحم دل ، خوش اخلاق اور سادہ مزاج ہیں ۔ مزاج میں دغل وغل نام کو نہیں ہے ۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے ۔ انھوں نے اس مقولے کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے ۔ مشاعرہ میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں چلے جاتے ہیں ، یہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے ۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا ۔ بڑے زور سے ابر آیا ، سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا ۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند جب تک سب نہ جا چکے ، اپنی جگہ سے نہ اٹھے ۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے تھے ۔ اتنے میں موسلادھار مینہ برسنا شروع ہوا ۔ ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے ۔ دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اٹھے مگر ایسا

اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھوں کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا ۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا ۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا ۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں ۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا تو اپنا جوتا مجھے دے دے ۔ اس کا جوتا کیا تھا لیتھڑے تھے وہی ۔ گھسیٹتے ہوئے چلے ۔ اپنا جوتا بغل میں دبا کر لیا ۔ قلعے پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ عمر بھر نہ بھولوں گا ۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آ جایا کیجیو ۔ آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ۔ دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا ۔ انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی ۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے ۔

نواب زین العابدین خان صاحب نے بڑھ کر لبِ فرش ان کو لیا اور پوچھا "ہیں صاحب عالم میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے ۔" مرزا رحیم الدین حیا ان کے بڑے بیٹے ہیں لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے ۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے کہنے لگے : "نواب وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے ۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ، ان کا تو رنگ ہی بدل گیا ہے ۔ میں بے چارہ کس گنتی میں ہوں ۔ وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے ۔ پالا پوسا بڑا کیا ۔ پڑھایا لکھایا ، شاعر بنایا بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ کہتے بھی شرماتے ہیں ۔ ہاں کیوں

نہ ہو تیرھویں صدی ہے ۔ اس کو بنارس بھیج کر میں تو مصیبت میں آ گیا ۔ ''ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ ۔'' بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی ۔ ''یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لے جا کر ایک جگہ بٹھا دیا ۔ ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمان احسان کو جھرمٹ میں لیے آ پہنچا ۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے؟ جو حافظ جیو کو نہ جانتا ہو ، جگت استاد ہیں ۔ پہلے تو سارا قلعہ ان کا شاگرد تھا ۔مگر ذوق کے قلعہ میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا ۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لے چکے تھے ۔ اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مرتے دم تک مقابلہ سے نہ ہٹنا تھا ، نہ ہٹے ۔کوئی نوے برس کی عمر تھی ۔ کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا ۔ اپنے زمانے کے ''بلعم باعور'' تھے ۔ لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے ۔ ان کی استادی کا سکہ ایک زمانے میں تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا ۔ پہلے مرزا تیلی کے استاد ہوئے ۔ رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ تک رسائی ہوئی ۔ وہ ان کو حافظ جیو کہتے تھے ۔ اسی لیے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے ۔ مصرع پر مصرع لگانے پر کمال حاصل تھا اور سند اس تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے ۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرع کہا :

صبح بھی بوسہ تو دیتا ہے مجھے ماہ نہیں

انھیں نے فوراً عرض کی :

نا مناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں

کسی نے سحر گاہ کی ترکیب پر اعتراض کیا انھوں نے جھٹ

صائب کا یہ شعر پڑھا :

آدمی پیر چو شد حرص جوان می گردد[1]
خواب در وقت سحر گاہ گران می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے - بڑے دبلے پتلے آدمی تھے۔ رنگ بہت کالا تھا - شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے -

اے خال رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا کر بٹھا دیا - ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ چم ننگے نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے - نوجوان آدمی مگر عجب حال ہے - کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں ، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں - کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں - کبھی حکیم آغا خاں "عیش" سے اصلاح لینے لگتے ہیں ، کبھی ذوق کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے جاتے ہیں - ذہن بلا کا پایا ہے - لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں - شعر سنا اور یاد ہوا - اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی اور مشاعرے میں اپنے نام سے پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا - نواب صاحب آگے بڑھے اور پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے" کہنے لگے اصلی رنگ ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے" نواب صاحب نے کہا ابھی شروع ہوتا ہے ، آپ بیٹھیے تو سہی - "خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے - میاں عارف نے ایک دوشالا لا کر ڈال دیا - انھوں نے اٹھا کر پھینک دیا - غرض جس طرح ننگے آئے تھے اسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے - اس کے بعد تو لوگوں کے

---

۱ - جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو حرص جوان ہو جاتی ہے صبح کے وقت نیند گہری ہو جاتی ہے -

آنے کا تانتا بندھ گیا جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خان آئے، ان کے ساتھ آزردہ، شیفتہ صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسۂ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں ان کی ذات با برکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں۔ اس لیے خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کرنا گویا اس کے دوام کی سند دیتا ہے۔ کوئی ساٹھ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی آ رہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے کا کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے تھے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے رزیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا لیکن جب تک صاحب بہادر وہاں رہے، انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر یہ بات صاحب سے لگا دی۔ ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی حوصلہ افزائی کی، انھوں نے ہماری اس طرح توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے، میں بھی آگے بڑھا آداب کیا۔ فرمانے لگے: "میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا، تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔ میں نے عرض کی مولوی صاحب بھلا میں کیا، میری

بساط کیا ۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خان صاحب کا ہے ۔ فرمانے لگے : ”بھئی یہ بھی اچھی ہوئی ۔ وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خان کا ہے ، تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے ۔ چلو ، من ترا حاجی بگویم ، تو مرا حاجی بگو ۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے ۔ نیّر علائی سالک اور خریں ان کے ہمراہ تھے ۔ مرزا غالب مومن خان کی طرف بڑھے ۔ مصافحہ کیا اور کہا بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر محزون کا عظیم آباد سے خط آیا تھا ۔ تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے ۔ معلوم نہیں کیوں ایکا ایکی پٹنے چلے گئے ۔ خواجہ درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا ۔ اب یاروں کو روتے ہیں دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے :

نہ تو نامہ ہے نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یاران وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آ گئی ہے ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے ، آخر یہ مشاعرہ کب شروع ہو گا ؟ حکیم صاحب کچھ جواب دینے والے تھے کہ دروازے کے پاس ”السلام علیکم“ کی آواز آئی ۔ صہبائی نے کہا اے لیجیے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آ گئے اور آپ کے دوست ہد ہد صاحب بھی ساتھ ہیں ، دیکھیے آج کس کے چونچ مارتے ہیں ۔ میاں ہد ہد کا نام عبدالرحمٰن ہے ۔ پورب کے رہنے والے ہیں ۔ دلی میں آ کر حکیم آغا خان عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں ۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں ۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہد ہد تخلص اختیار کیا ۔ ان ہی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھی ۔ سر منڈوا کر نکو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہو گئے ۔ ان ہی کے ذریعے سے دربار میں

پہنچے اور "طائر الاراکین ، شہپرالملک ، ہد ہدالشعرا ، منقار جنگ بہادر" خطابات پائے ۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا ۔ بعد میں انھوں نے استادانِ فن پر حملے شروع کر دیے ۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا لیکن کچھ بھی ہو آخر سب کو ان سے نفرت سی ہو گئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا ۔ حکیم صاحب علانیہ تو ان کی مدد نہیں کر سکتے تھے ۔ خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے ۔ اس لیے تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے ۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خان کے ہمیشہ منہ آتے تھے ۔ اسی لیے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے آپ کے دوست کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا بھئی میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا ۔ "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہد ہد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں ۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا ، غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آ گئے ۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ آیا تھا ۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے ۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے ، سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے ۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں ، چلو سلام ہو گیا ۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ۔ قلعے والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک نظر میں پہچان جاتے ہیں ۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے ۔ وہی پتلی اونچی ناک ، لمبا کتابی چہرہ ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں ، بڑا دہانہ ، اونچا چوکا ، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں گھرا

سانولا رنگ ، داڑھی کلون پر ہلکی تھوڑی پر زیادہ ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے ، شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی ۔ امیر تیمور سے لے کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس تھا ، مگر اب کچھ دو رنگی ہے ۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا ، خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں ، کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے ہیں جو وہاں جا کر آتا ہے ، لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے ۔ اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے ، نہ دہلی کا ۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان ہی کو دیکھ لیجیے جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں ، ان کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے ۔ اونچی چولی کا انگرکھا ہے ۔ نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پاجامہ ہے ۔ جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا ہے ، ان کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے ۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی ، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا ، اس کے اوپر مخمل کا پاجامہ دار کی خفتانی ، پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک برکا پاجامہ جو لکھنؤ ہو آئے ہیں انھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے ۔ چہرے کی ساخت سے ان کو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو ۔ مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں ۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانہ کے دائیں طرف بیٹھ گئے ۔ مشاعرے میں شعراء کو سلسلے میں بٹھانا بھی ایک فن ہے ۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ نہ شکایت اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہیے تھا تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اٹھا کے خود

ایسی جگہ جا بیٹھتے تھوڑی دیر بعد کہتے ارے بھائی ذرا ایک بات تو سننا وہ آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا اس سے باتیں کرتے رہتے اتنے میں کوئی ایسا شخص آ جاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے، اس سے کہتے تشریف رکھیے، وہ خالی جگہ ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کو سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑی کھیر ہے ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں پھر لاکھ منایئے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہوئی کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "بیٹھو بھئی بیٹھو" غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعہ سے تھا اور بائیں جانب شہر کے دوسرے استاد اور ان کے شاگرد ایک چیز جو مجھے عیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے، سب کے ہاتھ میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں، یہ بٹیربازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لاکھوں چڑیاں جہاں چاہا چھکا لے گئے اور چڑیاں اڑا دیں انسی سدھی ہوئی ہیں کہ چھکڑے سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی۔ انھوں نے جھنڈی ہلائی اور اڑیں انھوں نے آواز دی اور وہ آ کر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ

مرزا فتح الملک ہوادار میں آ پہنچے ۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے ۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہو گی رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے ۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں ، ستواں ناک ، کشادہ پیشانی ، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی ، جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا ، سبزکابدنی کا پاجامہ ہاتھ میں ریشمی رومال ۔ ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ ۔ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں ۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا ہے پہلے میاں داغ اترے اور اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز بانات کی اچکنیں پہنے سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے ہوے ہوادار کے پیچھے ہو لیے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ، ادھر عصا بردار ان کے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیے ۔ اس سلیقہ سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا ۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا ، پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا اجازت سب نے کہا بسم اللہ بسم اللہ اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے ۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے ۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا تشریف رکھیے ، تشریف رکھیے ، سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ۔ استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ وہاں جا بیٹھے ۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کر کھڑے ہوئے۔ جب یہ انتظام سب ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے ۔ شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات

بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے ساتھ ہی اہلِ مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا اے خوشنوایان چمن دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے استادان فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کوئی طرح نہیں دی گئی، اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے سے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے اسی "طرح" دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے، وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہو گی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کو مٹا دوں گا۔ یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا دونوں چوبداروں جو سامنے کھڑے تھے، دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے انھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعوں کو لے جا کر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی

دونوں چوبداروں نے بآواز بلند کہا حضرت مشاعرہ شروع ہوتا ہے اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہوگیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاص دان بن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواص بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آ کر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

حاضرین ظل سبحانی صاحبقران ثانی خَلَّدَ اللہُ مُلْکَہٗ و سَلْطَنَتَہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایے۔

سوالات

۱۔ شامیانہ کس طرح سجایا گیا تھا؟
۲۔ رحیم الدین حیا کو بیٹے سے کیا شکایت تھی؟
۳۔ مولوی ممنوک العلی کس طرح کے انسان تھے؟
۴۔ اس سبق میں لکھنؤ اور دہلی کے لباس میں کیا فرق بتایا گیا ہے؟
۵۔ ''طرح'' کسے کہتے ہیں؟
۶۔ صاحب عالم نے اس مشاعرے کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں؟
۷۔ ان محاورات کو اپنے فقروں میں استعمال کیجئے:

خم ٹھونک کر آنا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جانا۔ ہاتھوں ہاتھ لینا۔ تانتا بندھ جانا۔ منہ لگنا۔

علی عباس حسینی

(۱۸۹۹ - ۱۹۶۹ء)

علی عباس حسینی پارہ ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان مفتیوں اور عالموں کا خاندان تھا۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے بی۔ اے اور پھر ۱۹۲۱ء میں الہ آباد سے ٹریننگ کالج سے ایل۔ ٹی کیا ۱۹۲۴ء میں ایم۔ اے تاریخ کا امتحان پاس کیا۔ زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزارا۔

علی عباس حسینی نے اپنا پہلا ناول ۱۹۱۹ء میں تصنیف کیا۔ اس کے بعد ان کے متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے جن میں ''رفیق تنہائی'' ''آئی سی ایس'' ''باسی پھول'' اور ''کچھ ہنسی نہیں ہے'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حقیقت نگاری اور تحلیل نفسی ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کہیں کہیں ہلکی ظرافت کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ سلاست و روانی اور توازن ان کی تحریر کی جان ہے۔

گاؤں کی لاج

لکھن پور میں دو زمیندار رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا امراؤ سنگھ دوسرے کا دلدار خاں۔ دونوں بدیشی راج کے خطابات یافتہ تھے۔ امراؤ سنگھ کو انگریزوں نے رائے صاحب بنا کر نوازا تھا اور دلدار خاں کو خان صاحبی دے کر ممتاز کیا تھا۔ کہتے ہیں ایک

میان میں دو تلواریں ، ایک مملکت میں دو سلطان اور ایک کچھار میں دو شیر نہیں رہتے لیکن لکھن پور میں رائے صاحب اور خان صاحب دونوں موجود تھے ۔ دونوں خاندانی رئیس تھے ، دونوں کے مزاج میں گھمنڈ اور غرور تھا اور دونوں کو اس کی کد رہتی تھی کہ میری مونچھ اونچی رہے ۔

لکھن پور ایک چھوٹا سا قصبہ تھا ۔ آٹھ ہزار کے قریب آبادی تھی ۔ دو چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔ کچے کچے مکانات پھوس کے جھونپڑے ، ناہموار کچی سڑک ، تنگ گلیاں ، ننگے بھوکے کسان ؛ بازار کی ہر چیز پر گرد کی چادر پڑی ہوئی ، قصبے بھر میں صرف دو شاندار پختہ عمارتیں تھیں ۔ بلند کرسی ، وسیع صحن ، بڑے بڑے کمرے دالان ، مردانے زنانے حصے الگ الگ ، بلند بلند ، دیواروں کے حلقے میں خانہ باغ ۔ یہ تھیں کوٹھیاں دونوں مالکوں کی ، ایک قصبہ کے مشرق میں واقع تھی ، دوسری مغرب میں ۔

لکھن پور کا بٹوارہ ہو گیا تھا ۔ بازار ، آبادی ، کھیت ، باغ رائے صاحب اور خان صاحب کے نام سرکاری کاغذوں میں الگ الگ لکھے گئے تھے مگر ہر برسات میں کسی نہ کسی مینڈ کے بڑھنے گھٹنے پر دونوں میں فوجداری ضروری ہوتی تھی ۔ ان دونوں کا نہ اپنا سر پھٹتا تھا ، نہ ہڈیاں ٹوٹتی تھیں ۔ گماشتے ،کارندے ، رعایا ، پرسا آخر کس دن کام آتے ۔ انھیں حقِ نمک تو ادا کرنا ہی تھا اس لیے آویزش کے لیے معمولی بہانے بھی کافی تھے ۔ اکثر کسان مشترک ہوتے ایک ہی آدمی رائے صاحب کا کھیت بھی جوتتا اور خان صاحب کا بھی ۔ اگر خان صاحب کے حصے میں بسے ہوئے آسامی پر رائے صاحب نے دعوٰی کیا یا رائے صاحب کی رعیت پر خان صاحب نے بقائے لگان کا مقدمہ دائر کیا تو زمیندار اور کسان میں مقدمہ بازی نہ ہوتی بلکہ

زمیندار زمیندار میں ۔ دونوں کو فوجداری کرنے کے لیے اور دست و گریبان ہونے کے لیے بس حیلہ چاہیے تھا ۔

خان صاحب کو اس کا گھمنڈ تھا کہ لکھن پور ہی نہیں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ان کے بزرگوں کی ملکیت میں تھے ۔ ان کے دادا نے ہندوستان کی سب سے پہلی کوشش آزادی میں زور شور سے حصہ لیا اور انگریزوں نے اس کی پاداش میں سوائے لکھن پور کے سب کچھ ان سے چھین کر رائے صاحب کے بزرگوں کو اس لیے دیا کہ انھوں نے بدیشی حاکموں کا ساتھ دیا ۔ رائے صاحب کو اس کا گھمنڈ کہ ان کا خاندان حکومت کی نظر میں مقبول ، ممدوح ہی نہ تھا بلکہ اس کے اکثر افراد اچھی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہے تھے اور وہ خود خطاب سے سرفراز کیے گئے تھے ۔ ضلع کے حکام اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور ہر نیا کلکٹر ان کے ہاں ایک بار دعوت کھانے ضرور آتا ۔ خان صاحب کو یہ عزت حاصل نہ تھی ۔

انھیں یہ بات بہت کھلتی تھی اس لیے جنگ عظیم میں انھوں نے رائے صاحب سے دوگنا چندہ دیا اور دگنے سپاہی بھرتی کرائے ۔ امراؤ سنگھ کو رائے صاحبی ملی اور خان صاحب کو خان صاحبی مگر باوجود اس نئی سرفرازی کے خان صاحب کا انگریزی سرکار میں وہ مان دان نہ تھا جو رائے صاحب کا تھا ۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ ہر نیا کلکٹر عہدہ سنبھالتے ہی وہ خفیہ نوٹ ضرور پڑھ لیتا تھا جو اس کا پیش رو ضلع کی نمایاں شخصیتوں اور خاندانوں کے متعلق لکھا گیا تھا ۔ ان میں خان صاحب کا خاندان مشتبہ اور رائے صاحب کے گھر والے وفادار لکھے تھے ۔ دوسرے یہ کہ خان صاحب کے خاندان میں ابھی تک انگریزی تعلیم کا چلن نہ تھا ان کے ہاں یہی تھا کہ تھوڑی بہت عربی فارسی پڑھ لی ، ادب تہذیب

سیکھ لی اور شریفوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہو گئے بس اتنا کافی تھا۔ گھر پر کھانے کو موجود ہی تھا، کسی کی نوکری نہیں کرنا تھی۔ رائے صاحب کے خاندان میں بی اے۔ ایم اے کا زور تھا۔ کوئی تحصیلدار تھا، کوئی ڈپٹی کلکٹر۔ کوئی وہیں کچہری میں مختار یا وکیل غرض ایک گرتا ہوا مٹتا ہوا خاندان تھا، دوسرا ابھرتا ہوا گھرانا، مگر مونچھوں کی لڑائی جاری تھی۔ اسی لیے دونوں کو ہر وقت ہی فکر رہتی تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ دوسرے کی ناک کٹ جائے اور ہماری بات اونچی رہے۔

ان کی آپس کی رنجش ادھر اس لیے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ ایک تالاب پر بہت جھگڑا ہو گیا تھا۔ پچھلی برسات میں یہ تالاب خوب بڑھا تھا، اس نے رائے صاحب کی کھیتوں کی تقریباً نصف بیگھہ زمین اپنے لپیٹ میں رکھ لی تھی۔ تالاب لکھا تھا خان صاحب کے حصے میں اور سالہا سال سے وہی اس کی تمام آمدنی وصول کرتے تھے۔ اس کی مچھلیاں پکڑی جاتیں تو انہیں کے لیے، اس میں سنگھاڑے ڈالے جاتے تو انہیں کی اجازت سے اور اس سے آبپاشی کے لیے پانی لیا جاتا تو انہیں کے حکم سے۔ اب جو رائے صاحب کے کھیت تالاب میں بہ کر مل گئے تو وہ بھی آمدنی میں حصہ بٹانے کے خواہش مند ہوئے۔ خان صاحب نے کہا "سبحان اللہ" یہ تو اللہ کی دین ہے، تالاب میرا ہے، وہ جتنا بڑھے جدھر بڑھے میرا ہی رہے گا۔ کسنہ دو اور کسی تالاب میں منہ دھو رکھیں۔ حصہ بخرا کیسا؟ جب وہ زیادہ غرائے تو یہ فوجداری کے لیے آمادہ ہو گئے۔ بارے انہوں نے خون کی ندی نہ بہائی بلکہ مقدمہ دائر کر دیا۔ کاغذات کی چھان بین ہوئی، کھیت رائے صاحب کے بے شبہ نکلے مگر تالاب خان صاحب کا مقبوضہ ثابت ہوا اور اسی قبضہ کی بنا پر بورڈ تک سے رائے صاحب ہارے اور خان صاحب جیتے۔ اس جیت پر جس طرح خان صاحب کے ہاں

چراغاں کیا گیا ، خوشیاں منائی گئیں اسی طرح رائے صاحب کے ہاں رنج کیا گیا اور سوگ منایا گیا ۔ لگانے بجھانے والوں نے اس آگ کو خوب خوب بھڑکایا ۔ رائے صاحب کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہنے لگی کہ کون سا موقع ہاتھ آئے کہ میں خان صاحب کو اتنا ذلیل کروں کہ مونچھ پر تاؤ دینا ہی بھول نہ جائیں بلکہ ساری ہیکڑی خاک میں مل جائے ۔

اتفاق سے اسی زمانے میں خان صاحب کی چھوٹی بیٹی کی برات آئی ۔ دوسرے ضلع کے ایک مشہور رئیس کے لڑکے سے بات ٹھہری تھی ، تعلیم یافتہ بھی تھا اور منصفی کے لیے نامزد بھی ہوچکا تھا ۔ خاں صاحب کےخاندان میں یہ پہلا حاکم آنے والا تھا ۔ اس لیے ادھر جتنی خوشی ، رائے صاحب کے ہاں اتنی ہی جلن کہ ان کے ہاں بھی سرکار میں رسوخ پیدا ہونے کا وسیلہ پیدا ہوا ۔

پرانے دستور کے مطابق خان صاحب نے گھر گھر نیوتا بھیجا تھا ، نہیں پوچھا تو ایک رائے صاحب کو ۔ بہت دنوں سے شادی بیاہ میں آنا جانا بند تھا ۔ اس وقت جب کہ تالاب والے مقدمہ کی وجہ سے زخم ہرے تھے ، اگر پوچھتے بھی تو یہ اس نوید کو زخم پر نمک چھڑکنا سمجھتے ۔ اس لیے وہ تو خوشی میں بھولے رہے اور یہ شریک نہ ہونے کے مصمم قصد کے باوجود نہ پوچھے جانے پر دل میں کڑھتے رہے ۔

برات بڑی شان سے آئی ۔ ہاتھی بھی تھے ، گھوڑے بھی تھے بینڈ بھی تھے ۔ براتیوں میں بڑے بڑے رئیس ، مشہور بیرسٹر ، وکیل مختار ، ایک ڈپٹی کلکٹر ، دو تحصیل دار اور کئی داروغہ بھی تھے ۔

برات کے اتارنے کے لیے قصبے کے باہر بڑی املی کے درخت کے نیچے شامیانہ تانا گیا تھا اور کئی خیمے لگے تھے ۔ وہیں ان

لوگوں نے سرِ شام آ کر آرام کیا : نہائے ، دھوئے کپڑے بدلے اور برات کے لیے تیار ہوئے ۔ بڑی املی سے لے کر خان صاحب کی کوٹھی تک کی کچی سڑک خاص طور سے ہموار کی گئی تھی اور پانچ پانچ گز پر دو رویہ گیس کے ہنڈے گاڑے گئے تھے ۔ رات کو دن بنایا گیا تھا ۔ کوٹھی میں جھنڈیاں ، قندیلیں ، گیس ، بہار پھول ، بیلیں سارے سامان آرائش و زیبائش لگا کر اسے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا ۔ بینڈ بجاتی ، انار چھوڑتی جب شان و شوکت سے برات کوٹھی میں آئی تو سارے قصبے نے خیر مقدم میں حسبِ حیثیت حصہ لیا ۔ اس مجمعے میں رائے صاحب کے مختارِ عام ہمت رائے بھی تھے ۔ کچھ تو گاؤں کی ریت کو نباہنے آئے تھے ، کچھ یہ خیال تھا کہ برات کھانا دان جہیز سب کچھ بغور دیکھیں گے اور ان میں قابلِ اعتراض پہلو ڈھونڈ کر اپنے مالک کو سنائیں گے اور انھیں حریف پر ہنسنے کا موقع دیں گے ۔ یہاں جب دولھا مسند پر بیٹھ چکا تو دلھن والوں کی طرف سے خلعت پہنچایا گیا اور قاضی اندر جا کر دلھن کی رضامندی لے آئے ۔ اب انھوں نے دولھا سے پوچھا کہ اتنے مہر پر فلاں بی بی سے نکاح منظور ہے ۔ دولھا نے مہر کی رقم سنتے ہی صاف انکار کر دیا ۔

پہلے تو لوگ اسے رسمی انکار سمجھے مگر جب بار بار پوچھنے پر دولھا ، نہیں نہیں ، کہتا گیا تو باپ کو رجوع کیا گیا ۔ انھوں نے پوچھا کتنا مقرر کرنا چاہتے ہو ؟ بتایا گیا کہ خان صاحب کے خاندان میں صدیوں سے پچپن ہزار کا دستور چلا آتا ہے اور اسی پر اصرار ہے ۔ انھوں نے کہا میں ایسے ناہنجار دستور کا قائل نہیں ۔ غرض اب بات بڑھی ۔ با اثر لوگوں نے دونوں طرف سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کی ضد تھی کہ ہم پانچ سو سے ایک پیسہ زائد نہ دیں گے ۔ ادھر سے یہ کہ پچپن کے پونے پچپن ہزار نہ ہوں گے ۔ اس

سے خاندانی وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ عورتوں کو طرح طرح کے وہم ہوتے ہیں۔ انھیں باتوں میں تیز تیز فقروں نے اور آپس کی نوک جھونک نے آگ لگائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولھا کے باپ بول اٹھے۔ ہمارا سامان ہمیں واپس کیجیے ہم برات پلٹا لے جائیں گے۔

اب تو پورا قصبہ برہم ہوگیا لکھن پور کی ناک کٹ گئی۔ برات چڑھ کر آئی، لڑکی مانجھے بیٹھ گئی، وہ بغیر بیاہ کے باہر کیسے نکلے گی۔ دوسرے گاؤں والے طرح طرح کے نام دھریں گے۔ بس یہ سارے گاؤں سے لاٹھیاں نکل آئیں۔ آج براتیوں کی لاشیں ہی قصبہ سے اٹھ کر جائیں گی۔ اب تو ڈپٹی صاحب بھی گھبرائے۔ تحصیلدار صاحبان بھی اور داروغہ بھی۔ مگر خان صاحب نے خلافِ معمول بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ انھوں نے قصبہ والوں کو روکا سمجھایا کہ یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں، انھیں گاؤں سے صحیح واپس جانے دو۔ اسی میں ہماری ناک اونچی رہے گی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ایک ایک چیز گنوا کر سارے مجمع کے سامنے واپس کی۔ پھر ایک ایک سے خوشامد کی کہ نکاح نہیں ہوا نہ سہی، لڑکی میں کوئی عیب نہیں اللہ اس کو دوسرا بَر دے گا۔ مگر کھانا تیار ہے اسے برباد نہ کیجیے۔ کھانا کھا لیجیے مگر براتیوں نے ایک نہ سنی، سب بھوکے ہی جائے قیام پر پلٹ گئے۔ لاریوں میں، موٹروں میں سامان رکھے جانے لگے۔

ہمت رائے ہنستے کھل کھلاتے رائے صاحب کے یہاں پہنچے۔ وہ ابھی بستر پر آرام کے لیے جانے والے ہی تھے، ہمت رائے نے کھیسیں نکال کر کہا: "مبارک ہو سرکار لیجیے بھگوان نے خان صاحب کو آج اتنا ذلیل کر دیا کہ اب وہ زندگی بھر سر نہیں اٹھا سکتے۔ برات دروازے پر چڑھ کر واپس گئی۔

رائے صاحب نے ایک ایک بات پوچھی - چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی کہ دفعتہً ان کی سات برس کی بیٹی موہنی دوڑی آئی "بابو جی بابو جی گھر میں آئیے اماں بلاتی ہیں -" بیٹی پر نظر پڑتے ہی رائے صاحب کی ہنسی غائب ہو گئی - وہ سناٹے میں آ گئے موہنی سے کہا اچھا تو چل میں آتا ہوں - مگر اندر نہ گئے - اٹھ کر ٹہلنے اور کچھ سوچنے لگے - ہمت رائے باتوں کی جھڑی لگائے رہے - اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ گئے کہ اب تو کوئی عزت والا خان صاحب کی اس لڑکی کو پوچھے گا بھی نہیں -"

رائے صاحب ایک بار گرج پڑے - کیا بکتے ہو - جی جیسی میری موہنی جیسی تمہاری لڑکی ویسی ہی خان صاحب کی بیٹی گاؤں بھر کی ناک کٹ جائے گی اور تم ہو کہ بغلیں بجا رہے ہو - ہمت رائے نے جی جی کہا اور سٹ پٹا کر خاموش ہو گئے - رائے صاحب نے آدمی کو آواز دی - اچکن منگوا کر پہنی ، سر پر ٹوپی رکھی اور ہمت رائے سے بولے دیکھو میرے سارے آدمیوں کو بلا لاؤ کہ لاٹھیاں لے کر ساتھ چلیں -

تھوڑی دیر میں ایک آدمی لالٹین لیے آگے آگے اس کے پیچھے رائے صاحب اور ان کے پیچھے تقریباً بیس آدمی لاٹھیاں لیے ہوئے شان سے یہ دوسرا جلوس برات کی قیام گاہ پر پہنچا - گاؤں والے پہلے ہی موجود تھے - رائے صاحب کو دیکھتے ہی سب ان کے ساتھ ہو لیے -

رائے صاحب نے آہستہ سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ برات کو گھیر لو اور خود سمدھی کی طرف متوجہ ہوئے - سمدھی صاحب کو غصہ اس لیے اور بھی زیادہ تھا کہ ان کے سارے براتی بھوکے تھے - خان صاحب کے ہاں سے انکار کر کے تو چلے آئے تھے ،

مگر اب آنتیں قل ھو واللہ پڑھ رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ قصبے کے سارے بازار کی دکانیں بند تھیں، کھلی بھی ہوتیں تو شاید یہ دکاندار کھانا مہیا کرنے کی جگہ جوتے ڈنڈے سے ان کی ضیافت کرتے۔

رائے صاحب نے ان کو سلام کرکے پوچھا "آپ ہی لڑکے کے والد ہیں" وہ جھنجلا کر بولے "جی ہاں، میں ہی ہوں۔ آپ کا کیا نام ہے؟" رائے صاحب نے بہت ملائمت سے کہا "جی مجھ کو امراؤ سنگھ کہتے ہیں۔"

وہ ان کی اور خاں صاحب کی عداوتوں کے حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ خان صاحب اب ان کے بھی دشمن تھے۔ اس لیے بہت خوش ہو کر بولے "رائے صاحب واللہ خوب ملے جی آپ ہی کو تو آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ابھی ابھی ڈپٹی نصراللہ خاں صاحب تحصیل دار موہن سنگھ اور بخت بہادر کوتوال یہی کہتے رہے تھے کہ شاید رائے صاحب کو ہمارے آنے کی خبر نہ ہوئی ورنہ ہمیں اس طرح کی تکلیف نہ ہوتی۔"

رائے صاحب نے کہا "جی یہ ان کی اور آپ کی عنایت ہے مگر آپ لوگوں کو تکلیف کیا ہے؟ یہ معلوم نہ ہوا۔ کیا خان صاحب نے آؤ بھگت میں کوئی کمی کی ہے۔ شامیانہ خیمے سب تو موجود ہیں۔ کھانا بھی میں نے سنا کہ انھوں نے بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔ شہر کے حلوائیوں کے علاوہ بنارس سے کشمیری پکانے والے ہندوؤں کے لیے اور لکھنؤ سے باورچی مسلمانوں کے لیے بلوائے ہیں"۔ وہ بولے "جی وہ آئے ہوں گے سب، مگر ہم تو یوں ہی بھوکے جا رہے ہیں۔"

رائے صاحب نے کہا "یہ کیسے ممکن ہے؟ - وہ خان صاحب

کے چچا زاد بھائی منوں خاں کی طرف پلٹ پڑے "کیا آپ نے اپنے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا؟"

منوں میاں نے کہا "خان صاحب نے خود ان لوگوں سے فرداً فرداً کہا کہ برات شوق سے واپس لے جائیے مگر کھانا کھا لیجیے ان لوگوں نے مانا ہی نہیں۔"

سمدھی صاحب بولے "اجی ہم خان صاحب کے ہاں کا ایک دانہ بھی منہ میں ڈالنا حرام سمجھتے ہیں۔"

رانے صاحب نے تیور بدل کر کہا "تو جناب ان کے علاوہ اس وقت قصبہ میں کوئی دوسرا آپ کو ایک دانہ بھی نہیں کھلا سکتا۔"

سمدھی صاحب نے گھبرا کر کہا "تو یہ کہیے کہ آپ بھی انہیں لوگوں میں شامل ہوگئے۔"

رانے صاحب بولے "جناب من وہ خان صاحب کی لڑکی ہو یا میری یا ننھو بھنگی کی۔ وہ گاؤں بھر کی بیٹی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ صرف خان صاحب کی ذلت کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے آپ سارے گاؤں کی ناک کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سمدھی صاحب جھلا کر بولے "تو رانے صاحب جس کی بھی ناک کٹے، ہم تو جا رہے ہیں۔" رانے صاحب نے مجمع کی طرف اشارہ کر کے کہا "تو آپ خود ہی سمجھ لیں کہ آپ یہاں سے کیسی صورتیں لے کر جائیں گے۔

سمدھی صاحب بھڑک اٹھے "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

رانے صاحب نے کہا "کچھ نہیں۔ بس یہ کہ ہم سب چھوٹے آدمی ہیں۔ ہماری عقلیں بھی چھوٹی ہیں اور ہمارا پیمانہ بھی چھوٹا ہے،

اس لیے اگر ہم اپنی ذلت برداشت نہ کر سکیں تو ہم پر زیادہ تعجّب کی گنجائش نہیں ۔"

سمدھی صاحب چیخ اٹھے "تو جناب ہمیں دھمکا رہے ہیں ۔" ان کی آواز جو بلند ہوئی تو براتی سمٹ آئے ۔ ڈپٹی نصراللہ صاحب نے بڑھ کر پوچھا "کیا معاملہ ہے رائے صاحب ؟"

رائے صاحب نے کہا "کچھ نہیں ڈپٹی صاحب آپ لوگ سمدھی صاحب کو سمجھائیے ۔ آپ لوگ قصبہ والوں کے تیور دیکھ رہے ہیں ۔ پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ براتیوں میں آپ سرکاری ملازم بھی شامل ہیں ۔ اگر یہ اپنی بات پر اڑے رہے تو آپ لوگ بھی ان کے ساتھ پہلے اسپتالوں میں جائیں گے اور پھر دوسروں کی کچہریوں میں ۔"

سرکاری افسران جلدی سے سمدھی صاحب کو الگ لے گئے ، انہیں بہت کچھ سمجھایا بجھایا ۔ اپنی شرکت کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی ۔ بالآخر ڈپٹی نصر اللہ نے فیصلہ سنایا ۔ بوات خان صاحب کے ہاں واپس جائے گی اور نکاح پچپن ہزار ہی پر ہوگا اور پھر بینڈ بجاتی برات واپس ہوئی ۔ رائے صاحب بڑے پھاٹک تک ساتھ آئے مگر وہاں سے اپنے آدمیوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف مڑ گئے ۔

خان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ رائے صاحب نے گاؤں کی لاج رکھ لی مگر پھاٹک سے پلٹ گئے تو قاضی صاحب کو روک کر بولے ، ٹھہر جائیے نکاح ابھی نہیں ہوگا" اور جلدی کوٹھی سے نکل گئے ۔ لوگ گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے یا اللہ اب کون سا نیا فتنہ کھڑا ہوا ۔ براتی ڈرے کہ کہیں گھر میں بند کر کے مرمت کرنے کا تو ارادہ نہیں ؟ گھر والے پریشان کہ خان

صاحب کو کیا بات ناگوار ہوئی کہ اندھیری رات میں یوں تن تنہا چل دیے۔ دو ایک ان میں سے پکارتے ہوئے پیچھے دوڑے مگر خان صاحب بالکل خاموش لپکے ہوئے سیدھے رائے صاحب کے مکان کی طرف بڑھے چلے گئے۔ وہ گردن جھکائے کچھ سوچتے ہوئے لالٹین کی روشنی میں چلے جا رہے تھے کہ خان صاحب جا کر لپٹ گئے۔ وہ رائے صاحب کی گردن میں باہیں ڈال کر مشکل سے یہ کہہ سکے۔

"بھائی امراؤ سنگھ! میرا قصور معاف کرو چل کر، اپنی بیٹی بیاہ دو۔"

تھوڑی دیر بعد براتیوں اور گھر والوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آگے آگے لالٹین لیے ہوئے آدمی ہے اور اس کے پیچھے رائے صاحب اور خان صاحب ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چلے آ رہے ہیں۔

دالان میں پہنچ کر خان صاحب نے رائے صاحب کی طرف ملتجیانہ نگاہ سے دیکھا، رائے صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا:

"قاضی صاحب نکاح پڑھیے اور دونوں کے گالوں پر موتی ڈھلک آئے۔

سوالات

۱۔ خطاب سے کیا مراد ہے؟ یہ کلمے کی کون سی قسم ہے؟

۲۔ خان صاحب اور رائے صاحب کے خاندان میں کیا فرق تھا؟

۳۔ مہر کے جھگڑے کی بنا پر بارات کا واپس ہونا کیسی بات ہے؟

۴۔ مہر اور جہیز کی زیادتی نے ہمارے ہاں خرابیاں پیدا کی ہیں یا اچھائیاں؟

۵۔ رائے صاحب اور خان صاحب میں جھگڑا کس بنا پر ہوا؟ اور

صلح کا سبب کیا تھا -

۶ - "دونوں کے گالوں پر موتی ڈھلک آئے"
اس جملے میں موتی سے مراد آنسو ہے اور اس قسم کے استعمال کو استعارہ کہتے ہیں - اس افسانے سے یا کسی اور سبق سے اسی قسم کی پانچ مثالیں اور لکھیے -

۷ - " تار چھوڑتی ، بینڈ بجاتی" کس قسم کی ترکیبیں ہیں ؟ اس قسم کی دس ترکیبیں لکھیے -

۸ - فعل ماضی کی کون کون سی قسم اس افسانے میں استعمال ہوئی ؟ ہر ایک قسم کے افعال ایک جگہ جمع کیجیے -

۹ - 'رنجش' کس قسم کا کلمہ ہے ؟ اس قسم کے دس کلمات تحریر کیجیے -

۱۰ - 'وفا دار' میں دار لاحقہ ہے - اس طرح کے دس الفاظ قلمبند کیجیے -

---:o:---

علامہ سیّد سلیمان ندوی

(۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء)

سید سلیمان ندوی، ضلع پٹنہ (صوبہ بہار - بھارت) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے - اصل نام ابونجیب انیس الحسن تھا - لیکن بچپن ہی میں سلیمان کہلائے جانے لگے اور اس نام نے ان کے اصل نام کی جگہ لے لی - سید صاحب کے والد مولوی سید ابوالحسن ایک صاحب علم بزرگ تھے - ان کا خاندان علم و تقوی میں مشہور تھا - سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور بڑے بھائی سے حاصل کی اور تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کی - اس کے بعد یہیں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور رسالہ 'الندوۃ' کے مدیر رہے - سید صاحب عربی - فارسی اور انگریزی کے علاوہ ترکی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے -

سید صاحب ''الندوہ'' کے علاوہ مشہور رسالے ''معارف'' کے مدیر بھی رہے اور سینکڑوں علمی اور تحقیقی مضامین لکھے ، جن میں سے بعض کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں - انھوں نے ''سیرۃ النبی'' کو مکمل کرنے کے علاوہ بہت سی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں ان میں ''رحمت عالم'' - ''لغات جدید'' - ''عمر خیام'' ''سیرافغانستان'' - ''نقوش سلیمانی'' اور ''خطبات ، مدارس'' کو خاص شہرت حاصل ہے - ''ہمارے پیغمبر کا آخری حج'' ''رحمت عالم'' سے ماخوذ ہے -

پیارے پیغمبر کا آخری حج

(حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ)

اللہ تعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ کو جس مقصد کی خاطر زمین کے

پردہ پر بھیجا تھا، جب وہ انجام پا چکا تو اطلاع آئی کہ تمہارا کام پورا ہو چکا، اب تم خدا کے پاس واپسی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سورۂ نصر اِذَا جَاءَ نَصْرُاللّٰہِ وَ الْفَتْحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے) اس واقعہ کی خبر ہے۔

ذیقعدہ ۱۰ھ میں ہر طرف منادی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس سال حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے جائیں گے، یہ خبر دفعۃً پورے عرب میں پھیل گئی، اور سارا عرب ساتھ چلنے کو امنڈ آیا، ذیقعدہ کی ۲۶ کو آپ نے غسل فرمایا اور چادر اور تہبند باندھی، اور ظہر کی نماز کے بعد مدینہ سے باہر نکلے، مدینہ سے چھ میل پر ذوالحلیفہ کے مقام پر رات گزاری اور دوسرے دن دوبارہ غسل فرما کر دو رکعت نماز ادا کی اور آخر احرام باندھ کر قصواء نامی اونٹنی پر سوار ہوئے اور بلند آواز سے یہ الفاظ ارشاد فرمائے، جو آج تک ہر حاجی کا ترانہ ہے:

"اے خدا! ہم تیرے لیے حاضر ہیں۔

اے خدا! ہم تیرے لیے حاضر ہیں۔

تیرا کوئی شریک نہیں، ہم تیرے سامنے حاضر ہیں۔ تعریف اور نعمت سب تیری اور بادشاہی تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔"

حضرت زبیرؓ جو اس حدیث کے بیان کرنے والے کہلاتے ہیں، کہتے ہیں کہ "ہم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے، دائیں بائیں، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم "لبیک" فرماتے تھے اور اس کے ساتھ کم و بیش ایک لاکھ آدمیوں کی زبان سے یہی نعرہ بلند ہوتا تھا،

اور دفعۃً پہاڑوں کی چوٹیاں اس کی جوابی آواز سے گونج اٹھتی تھیں ، اس طرح منزل بہ منزل آپؐ آگے بڑھتے چلے ، یہاں تک کہ اتوار کے روز ذوالحجہ کی ۵ تاریخ کو مکہ میں داخل ہوئے ۔

کعبہ نظر آیا تو فرمایا "اے خدا ، اس گھر کو عزت اور شرف دے۔" کعبہ کا طواف کیا ، مقامِ ابراہیم میں کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی ، اور صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر فرمایا :

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کی بادشاہی اور اس کی حمد ہے ، وہی مارتا اور جِلاتا ہے ، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ، کوئی خدا نہیں ، مگر وہی اکیلا خدا ، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ۔ اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے سارے جتھوں کو شکست دی ۔"

عمرہ سے فارغ ہو کر آپ نے دوسرے صحابیوں کو احرام کھول دینے کی ہدایت فرمائی ، اسی وقت علیؓ مرتضیٰ یمنی حاجیوں کے ساتھ مکے پہنچے ۔

جمعرات کے روز آٹھویں ذی الحجہ کو آپ نے سارے مسلمانوں کے ساتھ مِنیٰ میں قیام فرمایا ، دوسرے دن نویں ذوالحجہ کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے ، عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات آ کر ٹھہرے ، دوپہر ڈھل گئی تو قصواء پر سوار ہو کر میدان میں آئے اور اس اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے حج کا خطبہ دیا ۔

آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا اور جاہلیت کے سارے بیہودہ مراسم مٹا دیے گئے ۔ آپ نے فرمایا :
"ہاں جاہلیت کے سارے دستور اور رسم و رواج میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں" ۔

عرب کی زمین ہمیشہ انتقام کے خون سے رنگین رہتی تھی - آج عرب کی نہ ختم ہونے والی آپس کی لڑائیوں کے سلسلے کو توڑا جاتا ہے - اور اس کے لیے نبوت کا منادی سب سے پہلے اپنے خاندان کا نمونہ پیش کرتا ہے - "جاہلیت کے سارے خون کے بدلے ختم کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون ، ربیعہ بن حارث کے بیٹے کے انتقامی خون کے بدلے کا حق چھوڑتا ہوں - یعنی دشمن کو معاف کرتا ہوں ۔" تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال بچھا تھا - جس سے عرب کے غریب مزدور اور کاشتکار یہودی مہاجنوں اور عرب سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پھنسے تھے اور ہمیشہ کے لیے وہ ان کے غلام ہو جاتے تھے۔ آج اس جال کا تار تار الگ کیا جاتا ہے - اور اس کے لیے بھی سب سے پہلے اپنے خاندان کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے ارشاد ہے :

"جاہلیت کے تمام سود مٹا دیے گئے اور سب سے پہلا سود جس کو مٹاتا ہوں ، وہ میرے اپنے خاندان کا یعنی عباسؓ بن عبدالمطلب کا ہے -"

آج تک عورتیں ایک طرح سے شوہروں کی منقولہ جائداد تھیں جو جوؤں میں ہاری اور جیتی جا سکتی تھیں ، آج پہلا دن ہے کہ یہ مظلوم گروہ انصاف کی داد پاتا ہے -

عورتوں کے بعد انسانوں کا سب سے مظلوم طبقہ غلاموں کا تھا آج اس کے انصاف پانے کا دن آیا فرمایا :

"تمھارے غلام ! تمھارے غلام ! ان کے حق میں انصاف کرو جو خود کھاؤ ، وہ ان کو کھلاؤ - اور جو خود پہنو ، ان کو پہناؤ" - عرب میں امن و امان نہ تھا - اس لیے جان اور مال کی کوئی قیمت نہ تھی - آج امن و سلامتی کا بادشاہ ساری دنیا کو صلح کا پیغام دیتا ہے - "آپس میں تمھارے جان و مال ایک دوسرے کے لیے قیامت

تک اتنے ہی عزت کے قابل ہے جتنے آج کا دن'' ۔ اس ایک مہینہ میں اور اس پاک شہر میں امن و امان کی اس منادی میں سب سے پہلی چیز اس دینی برادری کا وجود ہے ۔ جس سے قبیلوں اور خاندانوں کے رشتوں سے بڑھ کر عرب کے سارے قبیلوں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں میں اسلامی برادری کا سارے قبیلوں بلکہ دنیا کے سارے رشتوں سے بڑھ کر عرب سے رشتہ جوڑ دیا ۔ ارشاد ہوا :

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں ۔"

دنیا کی بے اطمینانی کی سب سے بڑی چیز جس نے ہزاروں سال تک قوموں کو قوموں سے لڑایا ہے ، وہ قومی فخر و غرور ہے ۔ آج اس فخر و غرور کا سر کچلا جاتا ہے ۔ اعلان ہوتا ہے :

'' کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی بڑائی نہیں ۔ تم سب ایک آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا ۔"

اس کے بعد چند اصولی قانونوں کا اعلان فرمایا گیا ۔

۱ ۔ خدا نے ہر حق دار کو (وراثت کی حد سے) اس کا حق دے دیا ۔ اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ۔

۲ ۔ لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو ۔ زنا کار کے لیے پتھر ہے ۔ اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے ۔

۳ ۔ ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دینا جائز نہیں ۔

۴ ۔ قرض دار کو قرض ادا کیا جائے ۔ عاریۃً لیا ہوا مال واپس کیا جائے ۔ ہنگامی عطیے واپس کیے جائیں ۔ جو ضامن بنے ، وہ تاوان کا ذمہ دار ہو ۔

آج امت کے ہاتھوں میں اس کی ہدایت کے لیے وہ دائمی چراغ مرحمت ہوتا ہے، جس کی روشنی میں جب تک کوئی چلتا رہے گا، ہر گمراہی سے بچتا رہے گا "میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو پھر کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ خدا کی کتاب ہے"۔

یہ فرما کر آپ نے مجمعے کی طرف خطاب کیا۔ تم سے خدا کے ہاں میری بابت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے۔

ایک لاکھ زبانوں نے ایک ساتھ گواہی دی۔

ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ سن کر آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔ "اے خدا تو گواہ رہ۔"

عین اس وقت جب آپ نبوت کا یہ آخری فرض ادا کر رہے تھے۔ خدا کی بارگاہ سے یہ بشارت آئی

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کے دین کو چن لیا"۔

خطبے سے فارغ ہوئے تو حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ جب حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے خدا کی پرستش کی دعوت دی تھی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے چند ساتھیوں کے سوا کوئی گردن خدا کے آگے خم نہ تھی اور آج ۲۲ برس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ایک لاکھ گردنیں خدا کے حضور میں جھکی تھیں اور اللہ اکبر کا نعرہ ذرے ذرے سے بلند تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر ناقے پر سوار ہو کر مسلمانوں کے ساتھ موقف تشریف لائے۔ اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلے کی طرف منہ کیے ہوئے دعا و زاری میں مصروف رہے۔ جب آفتاب ڈوبنے لگا

تو چلنے کی تیاری کی ۔ دفعۃً ایک لاکھ آدمیوں کے سمندر میں تلاطم برپا ہوگیا ۔ آپ آگے بڑھتے جاتے تھے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے زبان سے فرماتے جاتے تھے :

"لوگو ! امن و سکون کےساتھ ! لوگو امن و سکون کےساتھ !" ۔

مغرب کا وقت تنگ ہو رہا تھا کہ سارا قافلہ مزدلفہ کے مقام پہنچا ۔ یہاں پہلے مغرب پھر فوراً ہی عشاء کی نماز ادا ہوئی ۔ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھ کر قافلہ آگے بڑھا ۔ جان نثار دائیں بائیں تھے ۔ اہلِ ضرورت اپنی اپنی ضرورت کے مسئلے پوچھ رہے تھے اور آپ ان کے جواب دیتے جا رہے تھے ۔ جمرہ پہنچ کر کنکریاں پھینکی اور لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا :

''مذہب میں خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے نہ بڑھنا ۔ تم سے پہلی قومیں اس سے برباد ہوئیں" ۔

اس درمیان میں یہ فقرہ بھی فرمایا جس سے وداع و رخصت کا اشارہ ملتا تھا ۔ ''حج کے مسئلے سن لو ۔ میں نہیں جانتا کہ پھر حج کر سکوں گا ۔"

یہاں سے نکل کر آپ منٰی میں تشریف لائے ۔ دائیں بائیں ، آگے پیچھے مسلمانوں کا ہجوم تھا ۔ مہاجرین قبلہ کے داہنے ؛ انصار بائیں اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ناقے پر سوار تھے ۔ آپؐ نے آنکھیں اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو نبوت کے تیس سال کے کارنامے نگاہوں کے سامنے تھے ۔ زمین سے آسمان تک قبول اور اعتراف کا نور پھیلا تھا ۔ اب ایک نئی شریعت ، ایک نئے نظام ، ایک نئے عہد کا آغاز تھا ۔ اسی عالم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی زبانِ فیض ترجمان سے یہ فقرے ادا ہوئے :

"ہاں اللہ نے آسمان اور زمین کو جب پیدا کیا تھا ۔ آج زمانہ پھر پھرا کر اسی فطرت پر آ گیا ۔ تمھاری جانیں اور تمھاری ملکیتیں آپس میں ایک دوسرے کے لیے ویسی ہی عزت والی ہیں ۔ ہاں دیکھنا ! میرے بعد گمراہ نہ ہونا کہ خود ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو ۔ تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے کاموں کی بابت پوچھے گا ۔ اگر تم پر ایک کالا نکٹا غلام بھی سردار بنا دیا جائے اور خدا کی کتاب کے مطابق تم کو لے چلے تو اس کا کہنا ماننا ۔ اپنے پروردگار کی پرستش کرنا ، پانچوں وقتوں میں نمازیں پڑھنا ، رمضان کے مہینے کے روزے رکھنا ، تم اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے ۔

بس اب شیطان اس سے ناامید ہو گیا ہے کہ تمھارے اس شہر میں اس کی پرستش پھر کبھی نہ ہوگی ۔ ہاں چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کے کہنے میں آ جاؤ گے اور وہ اسی سے خوش ہوگا ۔ یہ کہہ کر آپ نے مجمعے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا : "کیا میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا ؟"

ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ہاں بے شک ، فرمایا خدا وندا گواہ رہنا ۔ یہ کہہ کر ارشاد فرمایا "جو یہاں موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو یہاں نہیں" ۔ یہ گویا تبلیغ کا فریضہ تھا جو ہر مسلمان کی زندگی کا جزو ہے ۔

ان سب کے بعد آپ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہا ۔

حج کے دوسرے کاموں سے فرصت کر کے ۱۴ ذوالحجہ کو فجر کی نماز خانہ کعبہ میں پڑھ کر سارا قافلہ اپنے اپنے مقام کو روانہ ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے مہاجرین و انصار کے جھرمٹ میں مدینے کی راہ لی ۔

سوالات

١ - حج سے واپسی کے بعد منیٰ کے مقام پر آنحضرتؐ نے کیا ارشاد فرمایا ؟ مختصر طور پر لکھیں ؟

٢ - سورۂ نصر میں کس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے ؟

٣ - جب حضور نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو کیا حالت تھی؟ اس کا مضمون میں بیان ہونے والی حالت سے موازنہ کیجیے ؟

٤ - مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے

مزدلفہ ۔ ضامن ۔ وداع ۔ شرف ۔ جتھوں ۔ ناقہ

٥ - مندرجہ ذیل کو جملوں میں استعمال کیجیے :

انجام پا چکا ۔ منادی ہوئی ۔ اُمنڈ آیا ۔ آدمیوں کا جنگل ۔ نمودار ہوا

———:٥:———

مولانا صلاح الدین احمد

(۱۹۰۱ - ۱۹۶۴ء)

مولانا صلاح الدین احمد لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابھی کم عمر تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور مولانا کے بڑے بھائی مولانا ضیاء الدین احمد نے آپ کی تربیت اور پرورش کی۔ مولانا نے اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی میں قومی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کرنے کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد مولانا نے بی۔ اے کیا۔ انھوں نے دورانِ تعلیم ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ''نخلستان''، اور پھر ۱۹۳۵ء میں اپنا مشہور ماہ نامہ، ''ادبی دنیا''، نکالا جو ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ مولانا صلاح الدین کو اردو سے سچی محبت تھی۔ انھوں نے اردو کی بقا اور ترقی کےلیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ مولانا اردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کی نثر سادہ، سلیس اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بڑا حسن رکھتی ہے۔ جذبے کی سچائی اور خلوص ان کی نثر کی جان ہیں۔ ''ہماری اردو'' مولانا کے اس خطبے کا حصہ ہے جو انھوں نے شامِ ہمدرد کے ایک جلسے میں حکیم محمد سعید دہلوی کی صدارت میں پڑھا۔

ہماری اردو

جب کسی قوم کے بھلے دن آتے ہیں تو خود بخود ایسے راستوں

پر چلنے لگتی ہے ۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی زبان میں "سبلنا" (ہمارے اپنے راستے) کہہ کر یاد فرمایا بلکہ ان پر چلنے والوں کی ہدایت و قیادت کی ذمہ داری بھی خود ہی قبول فرمائی ۔

اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں رشد و ہدایتِ ربانی کا ایک ایسا ہی لمحہؑ نایاب ہمیں اس صدی کے آغاز میں ارزانی ہوا ۔ جب استعمارِ فرنگ نے ہماری سلطنت چھیننے کے بعد ہماری تہذیب بھی چھیننی چاہی اور ہم نے محسن الملک و الملت کے جھنڈے تلے جمع ہو کو بلدۂ فرخ نہاد ڈھاکہ میں سرانیو میکڈانل لیفٹیننٹ گورنر یو پی کو یہ دندان شکن جواب دیا کہ اردو پر اگر کوئی آنچ آئی تو ہم اس کے تحفظ کے لیے اپنے سروں پر کفن باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ خطرہ ٹل نہیں جاتا جو اردو اور اسلام کے دشمنوں کی ملی بھگت سے اس کے سر پر منڈلا رہا ہے ۔ حضرات ! اللہ تعالیٰ نے ہمارے ارادہ اور عزائم کو سرفراز فرمایا اور خطرہ واقعی ایک عرصے کے لیے ٹل گیا ۔ لیکن وہ بے حد قیمتی اور مبارک نتیجہ جو اس کے ورود سے برآمد ہوا یہ تھا کہ ملتِ اسلامیہؑ ہندیہ جو مفلوک اور منتشر تھی اور جو سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ غیروں کی ذہنی غلامی بھی قبول کرتی جاتی تھی ، یک بیک چونک اٹھی اور اسے یہ احساسِ نایاب ارزانی ہوا کہ اسلام کے علاوہ مسلمانانِ ہند کا باہمی اتحاد جس قدرِ مشترک پر قائم ہے ، وہ ہماری قومی زبان اردو ہے جو نہ صرف ہمارے ارتباطِ باہم کے سبب سے مؤثر اور زندہ ذریعہ ہے بلکہ جو ہندوستان میں ہمارے ہزار سالہ تمدن کی امین اور ہماری مذہبی ، ثقافتی اور علمی روایات کی سرمایہ دار ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اردو کو ایران یا عرب یا وسطِ ایشیا سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے ، لیکن مشرق زبانوں میں یہ فخر اسی زبان کو حاصل ہوا کہ اس نے اپنے عدیم المثال

جوہر انتخاب کی بدولت وہ تمام خوبیاں اور دل آویزیاں اپنے اندر جذب کر لیں جو اس خطۂ عظیم میں بسنے والی قوموں کی زبانوں میں پائی جاتی تھیں۔ جس کے ایک طرف بحیرۂ قلزم اور دوسرے ساحل کو خلیج بنگال کی موجیں چومتی تھیں اور جس کی وسعتیں ایک طرف البرز کی چوٹیوں کو اور دوسری جانب دکن کی وادیوں کو اپنے دامنِ کشادہ میں لیے ہوئے تھیں اور حضرات یہ ایک لسانی نکتہ ہے کہ زبان اردو نے اپنی پیدائش کے روز ہی سے اپنی وسیع الظرفی اپنی گرم دلی اور اپنی مہمان نوازی کی بدولت السنۂ عالم کی محفل میں ایک مقامِ امتیاز حاصل کر لیا ہے اور ازبسکہ یہ تینوں صفات یعنی وسیع الظرفی، گرم دلی اور مہمان نوازی ہم مسلمانوں سے ایک نسبت خصوصی رکھتی ہیں، اس لیے اردو ہمیں کو زیادہ عزیز ہوئی اور ہماری ہی آغوش میں پروان چڑھی۔ اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ برادران وطن کے ایک جوہر شناس طبقے نے بھی اپنی قوم کی عام مخالفت کے باوجود اسے اپنے سینے سے لگایا۔ مگر اپنی جگہ یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ ہندوستان میں اردو سیاسی مصالح اور تعصبات کی نذر ہو گئی اور کئی دن کی بات ہے کہ اس کے مزار پر کوئی چراغ جلانے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ عدالت ہائے دیوانی و فوج داری اور دفاتر ہائے سرکاری و غیر سرکاری کا دروازہ اردو پر بند ہو چکا ہے۔ ریل، تار اور ڈاکخانے اب اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں — معاش کے تقاضوں اور روزگار کی مجبوریوں نے خود مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اردو سے جدا کر کے ہندی کی طرف دھکیل دیا ہے اور وہ زبان جس کا خمیر فارسی کی فصاحت، عربی کی بلاغت اور ہندی کی سلاست سے اٹھا تھا، اب اپنے دیس میں اجنبی ہو کر رہ گئی۔

میں ابھی ابھی اس عہد مبارک کا ذکر کر رہا تھا جب اردو ہماری قومی زندگی اور ہماری ملی تہذیب کا نشان بن کر نمودار ہوئی

اور ہم نے اسلام کے بعد اردو کو اپنی عزیز ترین تمناؤں کا مرکز بنایا۔ لیکن اب جب اقبالِ فرنگ کا آفتاب سرزمینِ ہند میں غروب ہوا اور پاکستان ایک حقیقت ثابتہ بن کر افقِ ہستی سے ابھرا تو بادی النظر میں ان تمناؤں کی تکمیل کی وہ ساعتِ سعید آ گئی جس کا ڈیڑھ سو برس سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ پاکستان کا ایوانِ عظیم الشان ہم جن محکم ستونوں پر قائم کرنا چاہتے تھے، وہ تعداد میں چار تھے۔ اسلام، اتحاد، آزادی اور اردو اور جب ہمارے قائداعظم نے ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پکارا تھا تو ایوانِ مملکت کے انھی چار ستونوں کی نشاندہی فرمائی تھی۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۶ء تک یعنی پورے چالیس برس ہم نے اس ویرانے کی خاک چھاننے میں بسر کیے، جس کا ہر بگولہ ہمارے لیے گردش تقدیر کا ایک نیا پیغام لے کر آتا اور ہر سراب سلسبیل زندگانی کی ایک نئی جھلک دکھاتا تھا۔ بالآخر رحمتِ حق جوش میں آئی اور جس نے ہمیں ایک بے مثال قائد عطا فرمایا۔ یہی قائد ہمیں ظلمتِ شب میں لے کر نکلا اور جب وقت سحر قریب آیا۔ منزلِ کامرانی کے کنگرے نظر آنے لگے تو اس نے اپنی انگلی اس طرف اٹھائی اور ہم سے فرمایا کہ وہ دیکھو ہم اپنی منزل پر آن پہنچے ہیں۔ ہمیں اس کی برکتیں اور آسائشیں مبارک ہوں۔ لیکن یاد رکھو جہانگیری کے دور کے بعد جہاں بانی کا مشکل تر دور آتا ہے۔ میں تمھارے درمیان زیادہ عرصے تک نہیں رہوں گا لیکن جن چار ستونوں پر اس مملکتِ خدا داد کا ایوانِ رفیع الشان قائم ہوا ہے۔ ان کے قیام ہی سے تمھاری زندگی کو قیام و دوام حاصل رہے گا۔ تم اس ملک میں اسلام کی اقدارِ عالیہ نافذ کر کے حیاتِ جاوداں پاؤ گے۔ تم عوام کی آزادیٔ فکر و اظہار ہی سے ملک کی عزت و آبرو برقرار رکھ سکو گے۔ تمھارے لیے اتحاد ہی زندگی کی ضمانت ثابت ہوگا اور خداوندِ تعالیٰ نے تمھیں جو

بے مثال زبان عطا کی ہے اور جو تمھاری روایات ، تمھاری تہذیب اور علمی خزانوں کی امین ہے ۔ وہی تمھاری قومی زبان ہوگی اور تمھارا شجرِ اتحاد اس کی قیادت افروز زمین میں برگ و بار لائے گا اور تمھاری علمی ترقی اور ادبی فروغ اور تہذیبی سطوت کی شاہراہیں اس کے بلند و بالا دروازے سے عرصۂ عالم کی طرف رواں دواں ہوں گی اور تمھیں دنیا کی زندہ کامیاب اور با عزت قوموں کی صف میں شامل کریں گی۔

جناب صدر ! آپ نے ہزار ہا مریضوں کے بخار اتارے ہوں گے کیا آپ کے پاس ایسا نسخہ ہے جس کی مدد سے قوم کو زندگی کا بخار چڑھایا جا سکے ؟ ایک ایسا بخار جس کی حرارت حیات افروز ہو اور جو مریض کی ہڈیوں تک سرایت کر جائے۔ میرا ایمان ہے کہ جب تک قوم زندگی اور حریت کے بخار میں مبتلا نہیں ہوتی ، اس سے کوئی بڑا کام انجام نہیں پائے گا ۔ ہمارا خون سرد ہو چکا ہے۔ ہماری غیرت سو چکی ہے اور بڑوں کو ہوسِ زر اور حبِ جاہ اور چھوٹوں کو طلبِ عیش و نشاط نے مفلوج کر رکھا ہے۔ ایسے میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ مقاصد ہمارے پیشِ نظر رہیں جن کے حصول کے لیے ہم نے یہ مملکت حاصل کی تھی اور اپنے خدا اور اپنے قائد سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اسے ہم ایک ایسا ملک بنائیں گے جو نہ صرف ملتِ اسلامیہ بلکہ کل اقوامِ مشرق کے لیے ایک مثالی ملک ہوگا اور اس میں کیا کلام ہے ۔ اگر ہم ان اصولوں پر تھوڑا سا عمل بھی کرتے جو پہلے دن ہمارے سامنے رکھے گئے تھے تو آج ہم کم از کم مضحکۂ روزگار نہ بنتے۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ ہماری قومی زبان بولنے والوں کے اعتبار سے دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر ہے اور اپنی آسانی کے لحاظ سے مشرق میں پہلا درجہ رکھتی ہے اور اہل مغرب جب یہ سنتے ہیں تو وہ اس سے آشنا ہونے کے لیے کشاں کشاں ہمارے ملک میں آتے ہیں لیکن چند ہی روز میں وہ پریشان ہو کر یہ کہتے

ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ یہاں تو اردو نہیں بلکہ غلط قسم کی انگریزی بولی جاتی ہے - پھر ہم ان لوگوں میں رہ کر اپنی انگریزی بھی کیوں بگاڑیں - چینی وزیر اعظم یہاں آئے تو یار لوگوں نے چاہا کہ وہ ان سے انگریزی بلوائیں لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ہماری قومی غیرت کے منہ پر تھپڑ رسید کیا کہ چین گونگا نہیں ہے - بلا شبہ چین گونگا نہیں مگر ہم گونگے بھی ہیں اور اندھے بھی - کیونکہ ہم انگریزی کے دھندلکے ہی میں ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں اور زندگی کے آفتاب کی کوئی کرن ہماری بے بصر آنکھوں تک نہیں پہنچتی -

سوالات

۱ - مسلمانانِ ہند کا باہمی اتحاد کس قدرِ مشترک پر قائم ہے ؟

۲ - اردو زبان ارتباط باہم کے علاوہ اور کن چیزوں کی علم بردار ہے ؟

۳ - اردو زبان کی خوبیاں بتائیے - اردو زبان نے دنیا کی زبانوں میں ایک ممتاز مقام کیسے حاصل کیا ؟

۴ - مسلمانوں کی وہ تینوں صفات بتائیے جو ان سے نسبتِ خصوصی رکھتی ہیں -

۵ - ہم مسلمانوں نے اسلام کے بعد اپنی تمناؤں کا مرکز کسے بنایا ؟

۶ - قائد اعظم نے ایوانِ مملکت کے کن چار ستونوں کی نشاندہی فرمائی تھی ؟

۷ - ہم نے اپنے خدا اور قائد سے کیا وعدہ کیا تھا ؟

۸ - واحد کے جمع اور جمع کے واحد بتائیے -
خطرہ - تعصبات - روایات - قوم - طبقہ - حقیقت -

۹ - مندرجہ ذیل کے متضاد الفاظ لکھیے -
کشادہ - ذمہ داری - آغاز - تحفظ -

۱۰ - مندرجہ ذیل محاورات کو فقروں میں استعمال کیجیے -
سر پر کفن باندھنا - چین سے نہ بیٹھنا - پروان چڑھنا - کانوں پر ہاتھ رکھنا - خاک چھاننا -

———:o:———

محمدؐ اکرم

محمد اکرم گوجرانوالہ میں ۱۸۸۷ء پیدا ہوے۔ شرقی علوم کی تعلیم اپنے والد مولانا غلام غوث غلامی سے حاصل کی۔ لاہور سے انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے فوج کے انجینئرنگ کے شعبہ سے متعلق ہو گئے۔ بنوں میں تقرری کے دوران میں قبائیلیوں نے انہیں اغوا کر لیا۔ آخر کار بڑے مصائب برداشت کرنے کے بعد آزاد علاقے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ''قید یاغستان'' میں انہوں نے اسی سرگزشت کو بیان کیا ہے۔ یہ سرگزشت دلچسپ ترین آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کو اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

قید یاغستان سے فرار

قسمت نے جس مقام پر مجھے لا کھڑا کیا وہاں سے ایک عجب نظارہ میرے سامنے تھا۔ یہ مقام دائیں بائیں والی پہاڑیوں کے درمیان سب سے نیچی جگہ پر تھا۔ اس لیے سلسلۂ کوہ کو عبور کرنے کے لیے سب سے موزوں جگہ یہی ہوسکتی تھی۔ آگے کی طرف جہاں تک نظر کام کرسکتی تھی، سلسلۂ کوہ اتنا گہرا چلا گیا تھا کہ عمق کا اندازہ کرنا محال تھا۔ نیچے کی بلند اور مرتفع گھاٹیاں ایسی چھوٹی نظر آتی تھیں کہ گویا ایک وسیع میدان ہے۔ نشیب و فراز سب مسطح نظر آتا تھا۔ بائیں جانب یعنی شمال کو نظر کرنے سے کسی

میدانی زمین کے نہایت خفیف آثار نظر آتے تھے ۔ جو یقیناً وادیٔ قرم تھی ۔ سامنے کا منظر ایک نقشے کی طرح پیشِ نظر تھا اور میلوں تک راستے کے آثار نظر نہ آتے تھے ۔ اس بیم و رجا کے حسرت بھرے منظر پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت تھی ۔ گذشتہ رات کی تمام محنت رائگاں جانے کی حسرت بھری داستان کا رنجیدہ سبق پیشِ نظر تھا ۔ اس لیے سمتوں کو اچھی طرح جانچتا میدانی زمین کے نشان پر ٹکٹکی جما کر دیر تک دیکھتا رہا اندازے سے خیال کیا کہ لگاتار رفتار کے ساتھ نصف شب سے پہلے وہاں پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ۔ پھر اپنے راستے کی سمت کو خیال میں لانا شروع کیا ۔ یہاں راستہ نہایت فراخ ہوجاتا تھا ۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص ضرورت سے انسان کو مجبور کرکے یہ بنوایا ہے ۔ دور دراز تک اس کے نشانات کا پتہ چلتا اور گہرے نشیب پر ایک گھاٹی کے پاس اس کی ذرا سی سفیدی نظر آتی تھی ۔ جس کے بعد یہ بالکل غائب ہوجاتا تھا ۔ یہ سفیدی یہاں سے تقریباً مشرق کی طرف تھی ۔ اس لیے میں بے خطر اس پر ہولیا میرے دائیں جانب وہ لا متناہی سلسلۂ کوہ آسمان سے باتیں کرتا چلا گیا تھا جس میں رات بھر میرے نصیب بصورت گرداب چکر لگاتے رہے تھے ۔ اور چڑھائی پر چڑھ کر نشیب میں اترنا مجھے نہایت آسان معلوم ہوا ۔ اور میں لڑھکتا چلا گیا ۔

زیادہ ڈھلان کی وجہ سے راستہ خاصے پیچ و تاب کھاتا تھا ۔ اس لیے میں کئی جگہ خطِ مستقیم میں ہوکر اترتا ۔ ایک جگہ ایک گدھے کا پالان لکڑیوں سمیت گرا پڑا تھا ۔ اس کے گر کر رہ جانے کی وجہ میں دل میں بہت دیر تک غور کرتا گیا ۔ زخمی حلق کو پیاس کی ذراسی سختی نے بری طرح تنگ کرنا شروع کیا ۔ راستے کے بائیں جانب ایک نالا نمودار ہورہا تھا ۔ جو اب کافی بڑا ہوگا ۔

امید کی آنکھ اس چشمے کی تلاش میں نالے کی وسعت کے چپے چپے کا جائزہ لیتی جارہی تھی راستے میں کہیں کہیں چڑھائی بھی آجاتی، جسے طے کرنا بہت دشوار ہوتا۔ یہاں جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ راستہ بار بار ان میں گم ہوجاتا۔ چوٹی سے چار میل نیچے اتر کر ایک اور گاؤں ملا جو پہلے گاؤں کی نسبت بڑا تھا چھپروں کے ڈھانچے کوڑے تھے اور مسقف مسجد بے کم و کاست کھڑی تھی۔ اس کو فرش کھود کر نیچا کیا ہوا تھا۔ اور دو حصوں میں منقسم تھی۔ عین وسط میں ایک انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس کے گرد سلیقے سے پتھر لگے ہوئے تھے۔ میں سارے گاؤں میں پھرا تاکہ کوئی برتن یا کوئی پانی ساتھ لے جانے کا ذریعہ دستیاب ہو۔ لیکن بالکل ناکام رہا۔ بار بار دل میں یقین پیدا ہوتا کہ میں برتن بنا لینے یا پالینے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ یہی ایک امید اور ارادہ ایسا تھا۔ جس میں آخر تک میں ناکام رہا۔ گاؤں کے پاس نالے میں بڑے بڑے چشمے جاری تھے۔ پانی ذرا گرم تھا۔ اللہ کا شکر کرکے پیا اور وضو کیا دن کی سخت گرمی کا وقت ابھی درپیش تھا۔ اس لیے میری بڑی کوشش تھی کہ کسی طرح پانی ساتھ رکھنے کا بندوبست ہوجائے۔ برتن سے ناامید ہوکر مسجد میں بیٹھ کر پاجامے کو مشکیزے کی صورت میں بنایا۔ دریدہ جگہوں پر گرہیں دیں۔ اور پانی سے بھر کر کندھوں پر رکھ لیا۔ یہ ایک نہایت بے ہودہ کوشش تھی پاجامہ جھٹ خالی ہوگیا۔ البتہ یہ فائدہ ہوا کہ پانی پاجامے سے ٹپک کر بدن پر گرتا تھا۔ جس سے کچھ وقت گرمی سے بچا رہا۔

پھر میں نے آہستہ آہستہ پاجامہ چوسنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ کا راستہ طے کرکے نالے میں پھر بہت سے بڑے بڑے چشمے ملے اور میں نے اپنی بادشاہت سمجھ کر ان سے چند منٹ لطف اٹھایا۔ ان کا پانی رواں تھا۔ پتھروں پر خوب مزے سے لیٹا رہا۔ پاجامہ

اور قمیض اور تر کر کے اس جگہ کو بھی الوداع کہا ۔ کچھ دیر بعد پیاس نے پھر گلا خشک کردیا اور نظریں پھر نالے کی طرف دوڑنے لگیں دیر کے بعد ایک پہاڑ کے دامن میں مٹیالے رنگ کی نم دار چکنی مٹی پھر نمودار ہوئی میں نے اس کو تھپک کر قمیض کا کپڑا اس پر رکھا اور چوسنا شروع کیا ۔ اس کے سوا کہ حلق میں مٹی جم گئی اور کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ بدن کو دھوپ سے بچانے اور تر کرنے کے لیے مٹی لے کر اپنے سینے اور پشت پر تھوپ لی اور چل دیا ۔ تھوڑی دیر میں مٹی سوکھ کر وبالِ جان ہوگئی اور چکنی ہونے کے باعث ایسی چپکی کہ کسی طرح اترتی ہی نہیں تھی ۔ مسام بند ہوگئے اور جی گھبرانے لگا ۔ تھوڑی دور جاکر راستہ مسطح زمین پر ہولیا ۔ اب کچھ کچھ فاصلے پر پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں ۔ ہر پہاڑی کے پیچھے قرم کا خیالی دریا لہریں لے رہا تھا ۔ میرا اضطراب ایک دفعہ پھر غایت درجے تک پہنچ گیا ۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ کر اب ڈھلنے لگا ۔ ماہ جون کی دھوپ میں سنگلاخ پہاڑوں کی تپش اس پر دن کا گرم ترین وقت اور طرفہ برآن جسم پر مٹی کا پلستر ان جملہ اسباب نے میرے شیرازۂ ہمت کو درہم برہم کردیا ۔ شدتِ تپش سے بخاراتِ زمیں اٹھ اٹھ کر بھوتوں کی صورت بن کر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے ۔ حسرت کو بڑھانے کے لیے تیتر "سبحان تیری قدرت" کے نعرے لگا رہے تھے ۔ بڑے بڑے پتھر مختلف شکلوں میں دھوکے دینے لگے ۔ ابھی تک میں نے غریب پاؤں کی خبر نہیں لی کہ ان بے چاروں پر کیا گذر رہی ہے ۔ اصل میں سارے بدن کا بوجھ تو یہ اٹھانے لیے جارہے ہیں ۔ مارے پیاس کے جب زمیں پر موت کے انتظار میں لیٹ گیا تو انہیں کی ہمت تھی کہ پانی تک پہنچا دیا ۔ رات بھر اتنی بلند گھاٹیوں اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیوں کو عبور کرنا انہیں کے طفیل تھا ۔

ان بے زبانوں سے کون پوچھے کہ کیسے گزری - اپنے حال کا اظہار خون کے اشکوں سے کررہے تھے - چپلی کے تسمے نے انگوٹھے کی گھائی کو کاٹا تو دوسری گھائی کی باری آئی - اس سے خون بہنے لگا تو تیسری کو زخمی کیا - اس کا گوشت پھٹ گیا - تو چوتھی کو گھائل کیا - پھر پہلی کی باری آئی - ایڑی کا تسمہ گوشت کاٹ کر ہڈی کے اندر گھسا جارہا تھا - زخموں سے خون ٹپک رہا تھا - پٹھے کی چپلی کہاں تک ساتھ دیتی - اس کے تسمے گھس کر باریک ہوگئے گویا پاؤں کاٹنے کے لیے ہتھیار تیز ہورہے تھے - ازار بند نکال کر چپلی کو پاؤں سے باندھا - لیکن وہ بھی کب تک برداشت کرتا پھر پائنچوں کی موہریاں پھاڑ کر استعمال کیں - وہ بھی تلف ہوگئیں اور پاجامے کی باری آئی - میری آبلہ پائی پر بیلوں کے کانٹے مرہم کا کام دے رہے تھے - ع

آبلے ہیں پاوں میں اور آبلوں میں خار ہیں

لیکن مجھ پر محویت کا ایسا عالم طاری تھا کہ یہ تمام تکالیف بے اثر تھیں - اور میری رفتار پر کوئی اثر نہ ڈال رہی تھیں - اس وقت پیاس نے بے تاب کر دیا ایک دفعہ پھر کل والی حالت کے قریب قریب پہنچ گیا - ہر طرف سے "سبحان تیری قدرت" کے نعرے گونج رہے تھے - نگاہ نالے کی تہ کے پتھروں میں دوڑی چلی جارہی تھی لیکن اب میرا راستہ نالہ سے علٰحدہ ہونے لگا - تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے راستے کو نالے پر ترجیح دی اور نالے کو الوداع کہہ کر راستے کو اختیار کیا - دھوپ اور گرمی کی شدت سے بخارات زمین سے اٹھ رہے تھے، جس سے دور کے پتھر حرکت کرتے نظر آئے - آخرکار میرے دائیں جانب پہاڑی کے پتھر نم دار معلوم ہوئے اور ساتھ ہی میری امیدوں کو تازہ کرنے والے نرسل کی ایک لمبی اور سرسبز قطار نظر آئی - میں بہت جلد ایک شفاف چشمے

کے سر پر کھڑا تھا۔

یہ ایک نالی کی صورت میں پہاڑی کے عین دامن میں بہ رہا تھا اور تھوڑی دور جا کر غائب ہو جاتا تھا۔ اس میں پانی بہت کم تھا اور ذائقے میں بھی شور تھا۔ دل میں قدرۃً خیال پیدا ہوا کہ اللہ تو نے میری نہ دیکھنے والی پیاس کے لیے یہ شور پانی مجھے پلایا کیونکہ میرے حلق کے زخموں کو اس سے تسکین ہوئی اور زبان بھی جلدی خشک نہ ہوئی۔ اپنے بدن اور سر سے مٹی کی جلا کو دور کیا۔ وقت کوئی ایک بجنے کے قریب کا ہو گا، سورج عین سر پر تھا۔ ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف نرسل کی بلند پیداوار تھی۔ سورج کی کرنوں کو یہ روک نہ سکتی تھی۔ میں گچھا ہو کر ذرا سے سایے میں تھوڑی دیر کے لیے پڑا رہا۔ کپڑے اتار کر پانی میں پھینک دیے۔ دھوپ کی سختی کا وقت شاید میں یہیں گزارتا۔ لیکن بالکل سایہ نہ ملا۔ جیب سے ایک بار پھر کل والی گریاں نکالی۔ لیکن عقل حیوانی نے ان کے کھانے کی اجازت نہ دی۔ آدھی کے قریب گر گئیں۔ میں نے ان کو بے سود سمجھ کر پروا نہ کی۔ وضو کرکے نماز ظہر ادا کی اور چل دیا۔ نالا مجھ سے بہت دور ہو گیا میں میدانی راستے پر چلنے لگا۔ سورج میری پشت پر چمکتا تھا۔ پٹھے کا مذکورہ چھاتا میرے سر پر تھا۔ پاجامہ لنگوٹے کی طرح کس رکھا تھا۔ ننگی پنڈلیوں پر دھوپ بہت تیز معلوم ہوئی۔ پاؤں کے زخموں سے مجبور ہو کر چپلی کو بار بار اتارتا اور پھر پہن لیتا کیونکہ زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر پہاڑی نظر آتی تھی اور یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کے پیچھے قرم دریا ہو۔ وہاں پہنچ کر ویسی ہی ایک پہاڑی نمودار ہو جاتی گویا منزل اور دور جا پڑتی۔ اس سلسلے سے ایسا محسوس ہوتا کہ منزل آگے

آگے دوڑ رہی ہے - کوئی تین میل کے سفر کے بعد راستہ ایک بہت بڑے نالے پر پہنچا اور راستہ اب بھی یہاں سے فراخ ہوتا چلا گیا - نالے کے بلند ساحلوں کو سلامی کرکے یہ راستہ ایک گیپ وے (GAPWAY) کی طرف سے عبور کرتا ہے - نالے کے دوسری طرف ایک گاؤں سنسان کھڑا تھا - یہ پہلے گاؤں کی طرح برباد شدہ چھپر نہیں تھے بلکہ پتھروں اور گارے سے بنی ہوئی دیواروں کی فصیل اسے چاروں طرف گھیرے ہوئے تھی - فصیل میں نالے کی جانب ایک دروازہ تھا - گاؤں کے نیچے نالے کی عمودی گہرائی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور گاؤں عین اوپر کھڑا تھا - اس گاؤں کے مقابل نالے کے دوسرے کنارے پر ایک گھاٹی تھی - جو نالے کی طرف ایک چشمے کو دامن میں لیے جھکی کھڑی تھی - چشمہ بہت بڑا تھا اور اس میں صاف و شفاف پانی لہرا رہا تھا - اور گھاٹی کے نیچے اور سائے میں ہونے کی وجہ سے پانی خوب ٹھنڈا تھا - اس سیماب سے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اچھلتی پڑتی تھیں - اس مستقل گاؤں کی شکل دیکھ کر میں ٹھٹکا اور چھپ کر دیکھتا رہا - حتٰی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آباد نہیں - پھر میں نے بلند آواز سے پکارا کہ ، کوئی ہے تو نکل آئے ، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا - دھوپ سے میرا بدن تپ رہا تھا - آہستہ آہستہ میں نے اسے ٹھنڈا کیا اور چشمے میں داخل ہو گیا - میرے تمام بدن پر راہ کے کانٹوں کا خون اور پتھروں پر گرنے کے زخم تھے - چھوٹی مچھلیوں نے مجھے مالِ غنیمت سمجھا اور زخموں پر آکر منہ لگائے - ان کی حرکات مجھے نہایت پیاری معلوم ہوئیں - اور میں ان سے کھیلتا رہا - میں نے ایک دو مچھلیوں کو پکڑا اور دیکھ کر چھوڑ دیا - یہ چشمہ اسی سائے کی جگہ پر تھا کہ یہاں آرام کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن پاؤ گھنٹے کے بعد میں نکلا - جی میں آیا کہ گاؤں میں جا کر کوئی کھانے

کی شے یا پانی کا برتن تلاش کروں ۔ لیکن پٹھانوں کی غربت سے مجھے قطعی امید نہ تھی کہ ایک دانہ بھی گرا پڑا ہو ۔ علاوہ بریں دھوپ میں گھبرا رہا تھا ۔ اور ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مصلحت نہ تھا۔ یہاں راستہ چھوٹی چھوٹی شاخوں پر منقسم ہو گیا۔ اسی لیے مجھے راستہ اختیار کرنے میں بہت دشواری پیش آئی ۔ میں نے اپنے حواس کو درست کر کے غور کرنا شروع کیا میرا خیال تھا کہ غالباً یہ نالا وہی ہوگا جس پر میں علی الصبح ۔ پہنچا تھا ۔ اور باقی ماندہ راستوں سے میں نے ایک زیادہ مستعمل راستہ اختیار کر لیا جو مشرق کی جانب جاتا تھا ۔ کچھ دور جا کر ایک عمارت نظر آئی جس پر پہلے دور سے طرح طرح کے گمان گزرتے تھے نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ زیارت ہے ۔ اس پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھا اشتہاء کی وجہ سے جسم میں بہت کمزوری محسوس ہونے لگی اور یقین ہو گیا کہ اگر تھوڑی دیر اور بھوکا رہنا پڑا تو طاقتیں جواب دے جائیں گی ۔ ہر چند غور کیا لیکن کوئی خوردنی چیز خیال میں نہ آئی ۔ مجبوراً مویشیوں کا گوبر جو کہیں کہیں راستے میں خشک پڑا تھا ، میں نے اکٹھا کرنا شروع کیا اور اپنے تھیلے دار چھاتے میں ڈالتا گیا ۔ گوبر کو دیکھ کر اور خاص کر کھانے کا خیال کر کے بھوک بہت چمک اٹھی اور انتظار دشوار ہو گیا ۔ میں سمجھتا تھا کہ شرعاً اس کا کھانا مجھ پر حلال ہو گیا ہے کیونکہ میں قریب مرگ ہو رہا ہوں ۔ میں نے پانی کی تلاش کی اور چار بجے کے قریب راستے سے دور مجھے چشمے کے نشان بصورت نرسل نظر آئے۔ جا کر دیکھا کہ ایستادہ پانی کا اچھا وسیع چشمہ ہے جس کے گرد اور درمیان میں بلند نرسل کے پودے کھڑے ہیں جس کے باعث پانی کا رنگ سبز نظر آتا ہے ۔ اس پانی میں مینڈک اچھل کود رہے ہیں ۔ میں نے جا کر کپڑوں کو اتار دیا اور پاؤں پانی میں ڈال کر بیٹھ گیا۔ آہ !

اس دشت غربت میں اس وقت کیا سماں ہے ۔ چاروں طرف دھوپ کے شعلے نکل رہے ہیں ۔ تھکان سے چور ہو رہا ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شدت سے بخار ہو رہا ہے ۔ بھوک سے بے حال اور جنگل بیابان کی نہ ختم ہونے والی منزل درپیش ۔ یکہ و تنہا چشمے کے کنارے بیٹھا ہوں ۔

آہستہ آہستہ میں چشمے میں داخل ہوا ۔ مینڈک کو میں نے پکڑا اور بھوک کی شدت سے چاہا کہ کچا چبا جاؤں لیکن یہ ایک نا ممکن العمل خواہش تھی ۔ چھوڑ دیا ۔ پھر پکڑا پھر چھوڑ دیا ۔

آخر میں کنارے کے ایک پتھر پر بیٹھ گیا ۔ تھیلے سے زاد راہ یعنی گوبر نکالا ۔ تھوڑا سا لے کر پانی میں بھگویا اور نکال کر پتھر پر رکھ دیا ۔ خوب نرم ہو گیا تو میں نے ہاتھ سے توڑا ۔ اس کے اندر گیہوں کے دانے نظر آئے ۔ ایک ٹکڑا لے کر منہ کی طرف لایا لیکن طبعیت نے اجازت نہ دی ۔ میں اٹھ کر ایک بلند پتھر پر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے چلایا کہ میں بھوک سے مجبور ہو کر مردار کھانے لگا ہوں ۔ اگر کوئی میری آواز سنتا ہو تو اس حرام خوری سے مجھے بچا لے لیکن یہ ایک مجنونانہ حرکت تھی جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا ۔ واپس آکر پھر کھانے کی کوشش کی لیکن ناکام ۔ پھر باہر نکل کر چلایا اس طرح تین دفعہ کہا ۔ چوتھی دفعہ میں نے خدا سے یہی التجا کی کہ اے میرے مالک ! میں نے انسانی قوت کو تین بار پکارا ہے ، لیکن مجھے کوئی مدد نہیں ملی ۔ اب میں تیرے سامنے چلاتا ہوں کہ اے خدا ! میرا آخری دم حلال روزی پر ختم کر اور اس حرام خوری سے نجات دلا ۔ سچے دل کی اس التجا سے ایک خاص اثر میرے دل پر ہوا اور مجھے تسکین سی معلوم ہونے لگی ۔ میں نے پانی سے معدے کو پر کر لیا ۔ گوبر

کو تھیلے میں ڈال لیا ۔ اور اللہ پر توکل کر کے چل دیا ۔

راستہ نالے کے متوازی کے قریب نصف میل کے فاصلے پر جارہا تھا ۔ دن ڈھلنے لگا ۔ سورج کی تیز شعاعیں میری بدقسمتی کی طرح ماند پڑنے لگیں ۔ سارا دن ہوا بند رہی تھی ۔ اس وقت قدرے اسے بھی میرے نصیبوں کی طرح حرکت ہوئی تقریباً پانچ میل چلنے کے بعد وہی نالہ پھر میرے راستے کو قطع کرنے لگا ۔ لیکن اس کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ دو پہاڑیوں نے اسے گھیر رکھا تھا ۔

قدِ آدم مزائی راستے کے دونوں جانب کھڑی تھیں ۔ سورج کی گرمی کم ہوجانے کی وجہ سے پھر دل کو کچھ ڈھارس ہو گئی اور میں خیال کرنے لگا کہ انشاء اللہ برابر ایک رات چلنے کا دم رکھتا ہوں ۔ میرے دائیں پاؤں کی چپلی پاش پاش ہوگئی تھی ۔
حسنِ اتفاق سے چپلی کا ایک پرانا پاؤں راستے میں پڑا پایا ۔ ناکارہ سمجھ کر کوئی پھینک گیا ہوگا ۔ لیکن وہ میری چپلوں سے بدرجہا اچھا تھا ۔ اپنی چپلی کو میں نے تھیلے میں ڈالا اور اس کو پہن لیا ۔ تھوڑی دور آگے چل کر مجھے ایک رسی کا ٹکڑا ملا ۔ وہ بھی اٹھاکر تھیلے میں داخل کر لیا ۔

دھوپ نے اپنی چادر فرشِ زمیں سے بالکل لپیٹ لی ہے ۔ اور پہاڑیوں کے سروں پر اکٹھی کرکے رکھ دی ہے ۔ ایک چکر لگانے سے اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا دریا شور و غل کرتا ہوا میرے آگے لہریں مار رہا ہے ۔ اس کی دوسری جانب ایک گاؤں آباد ہے اور آدمی چل پھر رہے ہیں ۔ یہ مجھے پہلے بھی معلوم تھا کہ قرم دریا کی دوسری جانب سرکار انگلشیہ کا علاقہ ہے ۔ لیکن خوشی اور مسرت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے تار کے ستونوں کو پکی سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا ۔ مجھے ضرور شادی مرگ ہو جانا چاہیے تھا ۔

لیکن اصل میں میری قوتِ حس مرچکی تھی - رنج و خوشی کا گہرا اثر مجھ پر نہیں ہوسکتا تھا - زندگی اور موت میں بہت فرق معلوم نہیں ہوتا تھا - خاص کر جبکہ مجھے ابھی دریا کو عبور کرنا ہے -

لبِ دریا کھڑے ہو کر میں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تھوڑی دیر توقف کیا - شاعرانہ تخیل نے جن جن مصیبتوں کے تصور کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کاغذی دنیا کو آباد کیا ہے - وہ تمام کیفیتیں قدرت کے خاموش ہاتھ نے ایسے تھوڑے سے عرصے میں یکے بعد دیگرے گزار دیں - آزادی کے مستانہ خواب کا چشم زدن میں اسیری کی بیداری سے متبدل ہوجانا ، رائفلوں اور خنجروں کے درمیان بے بسی کا طویل سفر ، زنجیر و سلاسل کی پاؤں میں روح فرسا جھنکار ، کاٹھ کی تکلیف دہ گھڑیاں ، پتھروں کے بچھونے پر بازو کا تکیہ انسانی جسم کو گرم لوہے سے داغ دینے کا دل دوز منظر ، غریب الوطنی میں غلامانہ زندگی اور غلاموں کی طرح قیمت اور فدیہ کا تقرر ، عزیزوں کی جدائی ، قتل کی دھمکیاں اور آخر میں بے رحمی سے قتل کیے جانے کا فیصلہ ، زنجیروں کا توڑنا ، جنگل بیابان اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرنا ، منزلِ مقصود کا لا پتا ہونا ، راستے کی گم گشتگی ، شدت کی دھوپ ، پیاس سے جان بلب ہونا ، بھوک سے گوبر کھانے پر اتر آنا ، یہ سب کٹھن منزلیں مجھ پر گزر چکیں - راستے میں دریا حائل ہونے کی کسر باقی تھی - وہ اب قرم نے پوری کردی جس کو عبور کرنے کے لیے کشتی ہے نہ ملاح - میں نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر پار پہنچنے کی تجاویز پر غور کیا - آخر میرے دل میں خیال گزرا کہ جس اللہ نے اتنی ناقابل برداشت مصیبتوں سے مجھے رہائی دی ہے - اب بھی

وہی مالک ہے ۔ اگر زندگی باقی ہے تو اس کی عنایت سے پار ہو جاؤں گا ۔ اگر اس نے منزلِ مقصود کے اتنا قریب پہنچا کر بلا لیا تو سرِ تسلیم خم ہے ۔

سارا دن دھوپ کی تپش میں جلنے کے بعد اس برفاب کی خنکی اور لطافت بھی ایک عجب کشش اور جذب اپنے اندر رکھتی تھی اور اتنے لطیف اور ٹھنڈے پانی میں غرق ہو کر جان دینا بھی ایک عیش معلوم ہوتا تھا ۔ چنانچہ میں اللہ کا سہارا لے کر کود پڑا ۔

ابھی پانی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ تہ میں پتھر اس زور سے آئے کہ پاؤں ٹوٹنے لگے ۔ پانی کی روانی اس قدر تیز تھی کہ گھٹنوں سے پانی کی گہرائی میں کھڑا رہنا محال تھا ۔ موت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ۔ ساحل پر ایک آخری حسرت بھری نظر ڈالی ۔ میری آخری نشانی ٹوٹی پھوٹی چپلیاں اور گوبر کا زادِ راہ میرے بعد لبِ دریا پر میرے غرق ہونے کی جگہ کا پتہ دے رہی ہوں گی ۔

اسی سوچ میں تھا کہ ایک ایسی لہر آئی جس نے دھڑام سے نیچے گرا دیا حباب کی طرح پانی بہا لے چلا ۔ میں کچھ کچھ تیرنا جانتا تھا ۔ ہاتھ پاؤں مار کر سنبھلنے کی کوشش کی لیکن پانی کی تیز روی کے سامنے کوئی پیش نہ گئی اور غوطے کھانے لگا ۔ دریا کے وسط میں ایک بریتہ تھا ۔ خوش قسمتی سے بہاؤ مجھے اس کی طرف لے گیا ۔

بریتے پر پہنچ کر میں نے اپنی پریشان حالی کو پھر مجموعہ کیا ۔ اس کے دوسری طرف دریا کی شاخ پایاب تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔ اس سے میں بآسانی گذر گیا ۔ پار گذر کر میں نے اللہ کی ایک اور قدرت دیکھی ۔ میں اخیر منزل پر پہنچ گیا ۔ جب دریا

سے گزر چکا تو پاؤں کے زخم سب تازہ ہو گئے ۔ ان میں ایسا شدید درد محسوس ہوتا تھا کہ میں زمین پر پاؤں رکھ نہیں سکتا تھا ۔ عین لبِ دریا فصلیں ایستادہ تھیں جن میں پانی کھڑا تھا ۔ پاؤں کے تلے یہ زمیں ریشم کی طرح معلوم ہوتی اور بالشت بھر پاؤں نیچے دھنس جاتے ۔ انھی فصلوں کو خراب کرتا میں نرم گھاس والی زمین پر پہنچ گیا ۔ بصد مشکل اس قطعۂ سبز کو بھی قطع کرکے پکی سڑک پر پہنچا ۔ میرے پاؤں اس زمین کی سختی کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے ۔ کچھ فاصلے پر چند پٹھان گندم سے بھوسہ اڑا کر صاف کر رہے تھے ۔ ہمت کرکے میں ان تک پہنچا ۔ میری شکل عجیب نظارۂ حسرت و وحشت تھی ۔ گلے میں ایک پھٹی قمیض ٹانگیں ننگی ، پاجامے کا باقی ماندہ حصہ دیوانوں کی طرح ستر ڈھانپنے کے لیے باندھے ہوئے سر کے بال ، کچھ حالات کے تقاضے اور کچھ قدرۃً سخت ہونے کی وجہ سے تیروں کی طرح کھڑے تھے ۔ حجامت بڑھی ہوئی ، آنکھیں شدتِ بخار سے سرخ ۔ عقل مفقود اور پانی کپڑوں سے ٹپک رہا تھا ۔ میں نے پاس پہنچ کر پشتو میں سلام کیا اور نہایت عاجزی سے کہا ۔ "خدا کے لیے دو لقمے روٹی کے مجھے منگوا دو ۔" مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے "دیوانہ آگیا ۔" میں نے عرض کیا "میں دیوانہ نہیں ہوں ۔ فلک زدہ قسمت برگشتہ تمھارے جیسا انسان ہوں ۔ مجھے تھوڑا سا کھانے کے لیے دو تاکہ مجھ میں قوت آئے اور اپنا حال سنا سکوں" اس پر دو ایک نے قہقہہ لگایا اور میری درخواست کو ہنسی میں اڑا دیا ۔ آخر میں بھس کے ڈھیر پر لیٹ گیا ۔ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا ۔ وہ چلایا کہ او دیوانے اندھا ہو جائے گا یہاں نہ لیٹ ۔ میں نے جواب دیا بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے ۔ آنکھوں کو کیا کروں اس شخص کو کچھ

خیال آیا ۔ میرے پاس آکر بھوسے سے مجھے اٹھایا ۔ غمخوار کی طرح میری جانب دیکھا ۔ خاص دلچسپی سے میری حرکات کو ملاحظہ کرنے لگا ۔

اس وقت سورج غروب ہوکر میری مصیبت کے آخری دن کو ختم کرنے والا تھا ۔ نماز عصر قضا ہوتی دیکھ کر میں اس طرف بڑھا جہاں پٹھانوں کے فالتو کپڑے رکھے ہوئے تھے ۔ ان میں سے میں نے ایک چادر اٹھالی ۔ میری اس حرکت کو انھوں نے دیوانگی پر محمول کرکے مجھ سے چھیننا چاہی ۔ میں نے کہا مجھے نماز ادا کر لینے دو پھر واپس کردوں گا ۔ اس پر اس غمخوار نے ان سے کہا کہ صبر کرکے دیکھو تو سہی یہ کیا کرتا ہے ۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں پاجامے کا کچھ حصہ اور ازار بند چپلیوں کی نذر ہوچکا تھا ، باقی ماندہ لنگوٹ کی طرح باندھ رکھا تھا ۔ میں نے چادر تہ بند کی طرح لپیٹی اور وہ لنگوٹ اتارا ۔ اس اثنا میں میرا بدن اکڑ گیا اور میں چلنے میں لڑکھڑانے لگا ۔ اس فرشتۂ رحمت نے مجھے تھام لیا ۔ اور میں اس کے سہارے بہتے پانی کی طرف بڑھا ۔ جہاں میں نے وضو کیا اور نماز ادا کی ۔ نماز کو درستگی کے ساتھ ادا ہوتے دیکھ کر میرے غمخوار کو خیال گزرا ہوگا کہ میں یا تو مجذوب ولی ہوں یا کوئی حقیقی مصیبت زدہ چنانچہ اس نے تعجب اور شفقت کے لہجے میں پوچھا تم کون ہو ۔ اور یہ خیال کرکے کہ میں اب علاقۂ انگلشیہ میں محفوظ ہوں ۔ اپنی رام کہانی سنانے کے لیے دلِ بیتاب ہوگیا ۔ لیکن فوراً اس بے تابی پر قابو پا لیا اور سوچا کہ :

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اس لیے میں نے صرف اس قدر کہہ کر ٹال دیا کہ میری مصیبت کا قصہ دراز ہے۔ آپ سن کر کیا کریں گے۔" البتہ اگر آپ میرے ساتھ کوئی سلوک روا رکھیں گے۔ تو وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ مجھے اشتہاء نے بے تاب کر رکھا ہے۔ اگر کوئی روٹی کا بچا بچایا ٹکڑا عنایت کرسکیں تو بڑا ممنون ہوں گا۔ نیز کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس گاؤں کا "ملا" ہوں۔ اور غالباً اس نیک بخت نے یہ سمجھ کر کہ یہ حال کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے۔ مزید استفسار نہ کرتے ہوئے مجھے میری حالت پر چھوڑ دیا۔

اس وقت میں نے اس سڑک پر ہمت بھر نگاہ ڈالی اور اپنی قوتوں کا جائزہ لیا کہ کیا میں اس وقت چل کر کسی نزدیک کے سرکاری قلعے تک پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن اس تھوڑے عرصے میں میرا بدن ایسا اکڑ گیا تھا کہ ہلنے جلنے سے بالکل رہ گیا۔ حیران ہوں کہ یہ حالت منزل پر پہنچ کر کیوں ہوگئی۔ ایک گھنٹہ پہلے یا بعد کیوں نہ ہوئی۔ اس "ملا" نے ایک اور آدمی کو بلایا اور میرے دونوں بازو پکڑ کر مجھے گاؤں میں لے چلے۔ یہ گاؤں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے اور شاید اس لحاظ سے اسے اچت کہتے ہیں جس کے معنی پشتو میں اونچا کے ہیں۔ پہاڑی کی سلامی پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کے مکانات علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے پر دھرے نظر آئے۔ چند گلیوں کے منہ کسی مصیبت کے مارے کو پناہ میں لینے کے لیے کھلے دکھائی دیے۔ مکانات پٹھانوں کی دیگر آبادیوں سے مقابلۃً اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ یہ دونوں آدمی آہستہ آہستہ کچھ چلاتے کچھ اٹھاتے ہوئے مجھے گاؤں میں لے پہنچے۔ راستے میں ملا صاحب نے اپنے گھر سے کسی کو بلا کر کچھ

ہدایت کی اور مجھے گاؤں کی سب سے اونچی جگہ لے گئے ۔"

یہاں کا نظارہ نہایت دلکش تھا ۔ یہ مجھے عالمِ وجد میں لے گیا ۔ گاؤں کی خوشنما طرز کے علاوہ دور کے قدرتی نظارے نہایت دلفریب تھے ۔ سب سے اونچی جگہ مسجد تھی ۔ جس کے ساتھ ایک تین فٹ اونچا چبوترہ تھا ۔ اس چبوترے پر ریت بچھی ہوئی تھی ۔ گاؤں کے نیچے دریائے قرم لہریں لیتا بہ رہا تھا ۔ ارد گرد سبز سبز کناروں اور چھوٹی چھوٹی فصلوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مخملی فرش پر سیماب لوٹ رہا ہے ۔ دریا کے دوسرے کنارے پر خوفناک درہ صاف صاف نظر آرہا تھا ۔ جس کے کھلے ہوئے منہ سے میں ابھی ابھی دریا میں گر گیا تھا ۔ مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آپس میں ملتی ہوئی ایک حیرت انگیز سلسلۂ کوہ بناتی تھیں ۔

سوالات

۱ ۔ یاغستان سے فرار کے دوران میں مصنف کو کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا ؟

۲ ۔ مصنف جب پٹھانوں کے ایک گاؤں میں پہنچا تو اس کا کیا حلیہ تھا ؟

۳ ۔ پٹھانوں نے مصنف کو دیوانہ کیوں خیال کیا ؟

۴ ۔ مصنف کے غم خوار نے اسے مجذوب یا ولی کیوں سمجھا ؟

۵ ۔ اعراب لگائیے ۔

مسقف ۔ مرتفع ۔ مجذوب ۔ چیلیاں ۔ غرق ۔ ستر ۔ ازار بند ۔ جذب ۔

۶ ۔ مندرجہ ذیل کے معنی تحریر کیجیے ۔

مسطح ۔ بیم و رجا ۔ لامتناہی ۔ گرداب ۔ دستیاب ۔ طرفہ برآں ۔

۷ ۔ "شدتِ تپش" مرکب اضافی ہے ۔ اس سبق میں سے چند ایسے ہی مرکب تلاش کیجیے ۔

ڈپٹی نذیر احمد

(۱۸۳۶ - ۱۹۱۲ء)

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر علم کا شوق انھیں دلی لے آیا۔ نذیر احمد کے والد ایک نادار انسان تھے اس لیے طالب علمی کا زمانہ انھوں نے بڑی تنگ دستی میں بسر کیا۔ دلی کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کا آغاز کنجاہ ضلع گجرات میں بطور مدرس کام کیا۔ اس کے بعد متعدد عہدوں پر کام کیا اور آخر میں حیدر آباد (دکن) میں ملازم رہے اور وہیں ریٹائر ہوئے۔

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔ وہ سر سید تحریک کے پرزور حامی تھے۔ انھوں نے اپنے ناول ایک خاص مقصد کے تحت لکھے ہیں اور یہ مقصد ہے مسلمانوں کی اصلاح — نذیر احمد کے ناولوں میں واقعہ نگاری کے علاوہ کردار نگاری اور مکالمے کے بھی بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ وہ دلی کی زبان لکھتے ہیں اور محاورات کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں عربی کے غیر مانوس الفاظ بھی ملتے ہیں۔

ایک ڈپٹی کلکٹر - انگریزوں کی مدارات کا شاکی

اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا

انگریزوں سے میری معرفت ہے ۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو ۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر بہ مجبوری ۔ رفع ضرورت کے لیے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عاملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں ، چغلی کھانے کا موقع ملے ۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنھوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں ، مگر انگریزوں کے عام، برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہوگیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کیے ہیں ، ان کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق ہے ۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا ۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی ، میری بے عزتی ، جاڑا ہو ، پانی برستا ہو ، کڑاکے کی دھوپ ہو ، لوئیں چلتی ہوں ، ہندوستانی ڈپٹی نہیں ، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو ، اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو ۔ کلکٹر ، جنٹ ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں ۔ اگر یورپین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں ؟) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی آنت ، کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے تو نوکری نذر کر آئے ۔ اسی دن رپورٹ ہوئی

دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا ۔ گویا کہ ڈپٹی کلکٹر کو ضروری ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پونی نہیں تو دُلکی ، پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے ۔ بس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی کانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرا دی ہیں، تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے یا آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا ۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوارا ۔ آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا ۔ چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے ۔ خدمت گار اور اردل کے چپڑاسیوں نے تو احاطے سے باہر میں تاڑ لیا تھا ۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھتے ہی قصداً ادھر اُدھر کو ٹل گئے ۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں ۔ چلنے کی ، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے کی ، اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں ، مگر کوئی آدمی نہیں نظر آتا ۔ آخر نا چار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ، ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے، کرسی نہیں مونڈھا نہیں ، فرش نہیں ، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں ؟ لوٹ چلیں ! پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں ۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہی تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا ۔

اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا ۔ جی خوش ہوا کہ اسی سے صاحب کا اور اردل کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا ۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے کے اندر گھس گیا

ادھر کو رخ بھی نہ کیا ۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے ۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپڑاسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا ۔ کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے ۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا ۔ "کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے ؟" بس اس کو ڈپٹی کلکٹر کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر ۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں ۔ صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے ۔ خدا جانے کب موقع آ پڑے ؟ چار و ناچار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے ، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ۔ ملاقات تو شاید ہی ہو لیکن آپ بیٹھیے ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں ۔ یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا اور زبان سے نکلا کہاں بیٹھوں ؟ اپنے سر پر ۔ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی ، تکیہ اور ایک بازو ندارد ، گویا بید کی تپائی لا کر رکھ دی ۔ اس کے بعد سے جب کوئی کرسی ، چپڑاسی یا خدمت گار باہر آتا ، یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے ۔ (الٰہی کیا غسل میت ہے ؟) اب کپڑے بدل رہے ہیں ۔ اب میم صاحبہ کے کمرے میں ہیں ۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں ۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں ۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی ۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں ۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں ۔ آنا تو پڑے ہی گا ۔ دوسرے دن کا کیا بھروسہ اتنی محنت کیوں ضائع کی جائے ؟ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو ۔ بڑی دیر کے بعد چپڑاسی یہ حکم لے کر آیا کہ سر رشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے ۔ اب رہی سہی امید اور بھی

گئی گزری ہوئی ۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپڑاسی سے یہ کہتے ہوے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں ، صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا ۔ تب خدا جانے چپڑاسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا : "میں دربار میں آپ کی اطلاع کر چکا ہوں ۔ کچھ بولے نہیں ، اب پھر کہے دیتا ہوں خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا ۔ غرض بلائے گئے ۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لیے ٹہل رہے ہیں ۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہو سکتی ۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں ۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں ، معلوم نہیں شاید جان بوجھ کر کھڑا کر رکھا ہو ، بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی ۔ چپڑاسیوں نے شاید نہ بھی کہا ہو ، مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں ۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا ، درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا ، بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا ۔کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی ؟ خیر آخر آپ ہی سر اٹھایا اور ڈپٹی صاحب حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرتے تو اس کا گزار ہونا چاہیے : صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی ۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری طرف کرسی پر کا اشارہ کیا ۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا ، لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوے تھا ۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا ، مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہو قسم لو ۔ تم خدا کے بندے ہو یقین جاننا بعض ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گلدم کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمبخت چپڑاسی

نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا : "خداوند سر رشتہ دار حاضر ہیں، صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپڑاسی سے فرما رہے ہیں "آچا آنے بولو" یعنی اچھا سر رشتہ دار سے کہتہ چلے آئیں ۔

سبحان اللہ سات برس اسسٹنٹ رہے ۔ نو برس کے قریب جنٹ اور سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لیے ضرور ولایت لگے تھے ۔ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا ۔ چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کمال حاصل کیا ۔ "آچا آنے بولو ۔" اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں اور سر رشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ۔ "ول صاحب گرمی بوٹ ۔" میں گردن جھکا کر : "ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں ۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے ۔" صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں کہتہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا ۔ ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس نہ آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے (جسے ناظر اپنی بد ذاتی سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے ۔ وہ تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے، اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے ۔ کتنی دیر سے برآمدے پر پڑا بھن رہا ہے ۔ لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں ۔ میں سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی ؟ کتنے آدمی مرے ؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں ؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بڑے حیلے ہیں ۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے ۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں یا

کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی۔ اب سر رشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کر کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے، کہ دونوں چپ۔ سر رشتہ دار کاغذ پھیلا چکا لگا صاحب کا منہ دیکھنے تو مجھ سے فرماتے ہیں: "آپ کچ کچ۔" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا: "نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا۔ پھر حاضر ہوں گا۔" میری اس آخیر بات میں اور باتیں ہی ایسی کون سی بہت سی ہوئی تھیں کہ اس کو آخیر کہوں بلکہ دوسری بات میں "جی ملنے کو چاہتا تھا۔" بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا ملنے کو جی چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے لیے مزہ اور با مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک با مزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب دو ہی منٹ میں ہو چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف ماتھا پھٹولی، وہ بھی اپنے چھدا اتارنے کے لیے۔ صاحب مجھ سے چاہے ایک بات بھی نہیں کرتے مگر سررشتہ دار اور چپڑاسیوں کو میرا الٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی اور عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپڑاسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے۔ گھنٹوں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہ پڑی۔ اب یہ حشرات الارض

کہاں سے نکل پڑے ۔ آہا ۔ میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں ۔ یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں ۔ ہرچند کہتا ہوں ۔ "مکان پر ، تنخواہ پر دیکھا جائے گا ۔ عید تو قریب ہے اس میں سمجھ لینا ۔ " بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ آخر میں نے ترش رو ہو کر کہا کہ "اس وقت میرے پاس نہیں ہوتا ۔ تو دینے کا نام دیتے کبھی کا دے چکا ہوتا ۔ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو ۔" ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے ۔ اتنے میں جمعدار نے پینسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال کر میرے ہاتھ دیا کہ "ناظر کو رقعہ لکھ دیں ۔" جب میں قلم اٹھاتا تھا ، ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے تھے ۔ "پہلے فرما دیجیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں ؟"

اس کشمکش پر بڑھتے بڑھتے میں تو بگھی کے اندر سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا لپک کر پائیدان پر پاؤں رکھ غڑپ بگھی کے اندر سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا ۔ میں نے کوچوان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ ، پڑیا بنا ، اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپڑاسی نے پڑیا اٹھائی بھی ، ایک روپیہ دیکھ یقیناً بہت بگڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا ۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر ۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے کیا ۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپڑاسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی ۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے ۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کھانے پر لعنت ہے ۔ پھر دل کو سمجھایا

کہ عزت ایک امرِ اضافی ہے ، مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیے ۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں یہ سب ننگے ہیں ، وہاں لنگوٹی کی شرم ! اسی حیص بیص میں گھر پہنچا ۔ چند آدمی منتظرِ ملاقات بیٹھے ہوئے تھے ۔ مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاجِ اطلاع بیٹھے ہوں ۔ آئے تو میں موجود نہ تھا ۔ مزے سے گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے ۔ گھر میں سے پان آگئے ، آدمیوں نے حقے بھر دیے ۔ جوں ہی مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے : اللہ اکبر ڈپٹی صاحب آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوا ہوں " دوسرے صاحب "آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا ۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں ۔ میں نے کہا بس آج کسی کی دال نہیں گلتی ۔" تیسرے صاحب ۔ "مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی ۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اس انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی ۔" لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ "بھلا ہے خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں ۔"

سوالات

۱ ۔ ڈپٹی کلکٹر کون سی مجبوری کے تحت انگریزوں سے ملنا ضروری سمجھتے تھے ؟
۲ ۔ ڈپٹی صاحب نے کلکٹر صاحب کی عدالت میں کس طرح رسائی حاصل کی ؟
۳ ۔ کلکٹر صاحب سے ان کی کیا بات ہوئی ؟
۴ ۔ نوکروں نے ڈپٹی صاحب کے گرد گھیرا کیوں ڈالا ؟

۵ - یہ کہانی پڑھ کر اس وقت کے مسلمان اور انگریز افسروں کے تعلقات کا جو خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے ، اس کو مختصر طور پر بیان کیجیے -

۶ - مندرجہ ذیل کو جملوں میں استعمال کیجیے -

شیطان کی آنت - گدھے کو باپ بنانا - آدھے سر آنے کی فکر رکھنا - آؤبھگت کرنا - بھاڑ جھونکنا - سلام کرنے حاضر ہونا - غول کا غول - لنگوٹی کی شرم - گانٹھ کا پورا - سر کا چھدا آتارنا - ماتھا پھٹول - دل کھٹا ہونا -

۷ - مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے اور انھیں اس طرح فقروں میں استعمال کیجیے کہ مطلب واضح ہو جائے -

رفع ضرورت - بہ‌تقاضائے انصاف - ہرکارہ چکھوتیاں - بالائے طاق رکھنا - حشرات الارض - چار و ناچار - کریم النفس -

۸ - واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے -

اقران - امثال - غرض - تدبیر - حاکم -

۹ - اعراب لگائیے -

حیص بیص - سائیس - تعینات - چھدا - پھٹول - بگھی - چکھوتیاں -

———:o:———

غلام عباس

(۱۹۰۹ - ۱۹۳۷ء)

غلام عباس امرتسر (بھارت) میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے . تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی - ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا - ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک غیر ملکی افسانوں کے ترجمے میں گزارا - ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۷ء تک ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے نائب مدیر رہے - آل انڈیا ریڈیو کے اردو اور ہندی رسالے ''آواز'' اور ''سارنگ'' کے مدیر بھی رہے - تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان میں سرکاری عہدے پر مامور رہے - ''جزیرۂ سخنوران'' اور افسانوں کا مجموعہ ''آنندی'' بہت پسند کیے جاتے ہیں -

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُرفضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے . ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں - دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے - مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر

کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو ۔

گرمی کا زمانہ ، سہ پہر کا وقت سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے ۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گذری تھی سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا ، بخارات اٹھ رہے تھے ۔

شریف حسین کلرک درجۂ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آکر کھڑا ہو گیا ، جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے ۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا ۔ اور آج کا دن بھی اِنھیں مبارک دنوں میں سے ایک تھا ۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوڑیاں لے کر کھا لی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا ۔ رات کو شہر کے کسی سستے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی ، بس بے فکری تھی ۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنا پڑتی ، اس لیے آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے ۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنا شروع

ہوئیں ۔ ان میں ٹائپسٹ ، ریکارڈ کیپر ، ڈسپیچر ، اکاؤنٹنٹ ، ہیڈ کلرک ، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور ہر حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی ۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے ۔ سائکل سوار آدھی آستینوں کی قمیض ، خاکی زینؔ کی نیکر اور چپل پہنے ، سر پر سولا ہیٹ رکھے ، کلائی پر گھوڑی باندھے ، رنگدار چشمے لگائے ، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے ، منہ میں بیڑی ، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے ۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے ، کہ انہیں دیکھنے کا موقع ہی نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا ۔

بعض منچلے ٹانگے ، سائکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں ، کوٹ کاندھے پر ، گریبان کھلا ہوا ، جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی ، سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے ۔ اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس ، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے ، خراماں خراماں چلے آ رہے تھے ۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ اس کی وجہ وہ طمانینت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے ، بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا

تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کرکے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے -

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے - ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی اسکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑگیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے، بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آگیا تھا اور کُند استروں سے متواتر داڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی مہین جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کرلی تھی -

پیدل چلنے والوں میں بُہتیرے لوگ بخوشی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ، ان کا فاصلہ کَے کَے ہزار قدم ہے - ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا -

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر گیا ، اس میں سوار ہو گیا ، تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا - شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گردا گرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا - دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قیاس کے لوگ یہاں ملتے تھے - اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے ، مول تول کرتے

دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں ، سنیاسیوں ، تعویذ گنڈے بیچنے والے ، سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک، دو دو منٹ رکتا ، سیر دیکھتا ، اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں ۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں ۔ ان میں سے بعض تو ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت اعلیٰ کا نمونہ ہوں گی ۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑے پڑے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہوگئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بیکار ہوگئی تھی چینی کے ظروف اور گلدان ، ٹیبل لیمپ ، جلی ہوئی بیٹریاں ، چوکھٹے، گراموفون کے کل پرزے ، جرّاحی کے آلات ، ستار ، بھس بھرے ہرن ، پیتل کے لم ڈھینگ ، بدھ کا نیم قد کا مجسمہ ۔

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے ۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا ۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی ۔

تین روپے ، کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے ۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا ۔

کیوں حضرت چل دیے ؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا ؟

وہ رک گیا اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم آئی کہ اسے اس

چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی ۔ اس نے سوچا کہ دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں ۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے ۔

”ہم تو ایک روپیہ دیں گے ۔“ یہ کہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی ۔“

”اجی سنیے کچھ زیادہ نہیں دیں گے ، سوا روپیہ بھی نہیں . . اچھا لے جائیے ۔“

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے ۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا ۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو سودے کو منسوخ کر دے ۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا ۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا ۔

جب رات کو وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا ، خدا کے کارخانے عجیب ہیں وہ بڑا غفور و رحیم ہے ۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں ۔ وہ کلرک درجۂ دوم سے ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے . . . . یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی کی سہی ۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر

اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا ، اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعی لا حاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا۔ مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آیند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگاتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ، دفتر جاتے ، دفتر سے آتے ، کوٹھیوں سے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ۔ یہاں تک کہ جب مہینا ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جو سنگ تراش نے اسے لپیٹ کر دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار

ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلّط تھے ۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا ۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر جیب سے چابی نکالی ، قفل کھولنے لگا ۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر بورڈ لگایا جا سکے ۔ اگر جگہ ہوتی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے ....

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں ۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں ، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا ۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے ۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بےکواڑ کی الماری میں رکھ دیا ۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی ۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تھکان کسی قدر کم ہو جاتی ، دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں ۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا ، آرزوئیں امر کے

سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے، وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلدی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی، مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبے کو گرا نہ دے، اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ

دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیب سے نصیب ہوتی ہے۔کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا، جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل میں رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل برس چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہوچکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانتداری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجۂ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی پر جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا، اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں اس نے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا۔ صابن سے دھویا، پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر لگا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت ہی کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتری، کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے ان کا بہت سا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق

رہتا - - پھر بھی وہ خوش تھا - ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا - کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے کہ وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے . . . . ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے . . . . ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے . . . .

مگر جب تین مہینے گزرے تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا -

اس کے بعد جو دن گزرے ، وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے - تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی - اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا - مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی پیدا ہونے لگی - ہر وقت بیکار بیزار سا رہتا نہ کبھی ہنستا نہ کسی سے بولتا چالتا . مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی - افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے -

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی ، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی . باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا - وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کرتا - چونکہ میز ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا -

سال پر سال گزرتے گئے . اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں - کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر - کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے - کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ

کے بکس میں ۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا، جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے ۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا ۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے ۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا ۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی ۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے ۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گُدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا ۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی ۔ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا ۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ان کے لیے نوکریوں کی تلاش ۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں ۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی ۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا ۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا ۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ

بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی ۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا ۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں ۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی ۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا ۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا ، گرم گرم لحاف سے نکلا تھا ۔ پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہوگیا ۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے ، اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا ۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے کتبہ مل گیا ۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی ۔ کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا ۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی ۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

سوالات

۱ - اس افسانے میں کلرک کی زندگی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲ - شریف حسین نے سنگ مرمر کا ٹکڑا کیوں خریدا؟

۳ - سنگ مرمر کا ٹکڑا خرید کر اس نے کیا سوچنا شروع کیا؟

۴ - جامع مسجد کے ارد گرد کا جو بیان اس افسانے میں ملتا ہے، اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۵ - سنگ مرمر کے ٹکڑے کے استعمال کے بارے میں شریف حسین نے جو خیالی پلاؤ پکائے تھے، کیا وہ اس انجام کے مطابق تھے جو افسانے سے ظاہر ہوتا ہے؟

۶ - شریف حسین کس قسم کا شخص تھا؟ اس کے کردار اور عادات و اطوار کے بارے میں ایک پیرا لکھیے۔

۷ - تابع مہمل سے کیا مراد ہے؟ اگر اس افسانے میں اس قسم کے الفاظ ہوں تو انھیں تلاش کیجیے۔

۸ - جملۂ شرطیہ کسے کہتے ہیں؟ اس کے کتنے حصے ہوتے ہیں؟ اس افسانے سے یا کسی اور جگہ سے پانچ جملے اس قسم کے تلاش کیجیے۔

———:o:———

مولانا عبدالحلیم شرر

(۱۸۶۰ - ۱۹۲۶ء)

مولانا عبدالحلیم شرر نے علمائے فرنگی محل سے تعلیم حاصل کی - ۱۸۸۰ء میں 'اردو اخبار' کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے - ۱۸۸۷ء میں 'رسالہ دلگداز' نکالا - ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد دکن میں ملازمت اختیار کی اور ۱۹۰۰ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ آ گئے -

مولانا عبدالحلیم نے ناول نگاری میں بہت شہرت پائی - ان کی تصانیف کی تعداد ۸۶ سے زیادہ ہے - ناول کے علاوہ مولانا نے مضامین اور انشائیے بھی لکھے ہیں - نثر میں شاعرانہ خیالات کا ادا کرنا ، قدرتی مناظر اور دلی جذبات کی ترجمانی ان کی امتیازی خصوصیات ہیں -

پھول

پھول کیا چیز ہے اور کس قدر خوشنما چیز ہے - کون محفلِ عشرت ہے جس میں اس کا گزر نہیں - کون بزمِ طرب ہے جہاں اس خوش نما چیز سے لطف نہیں اٹھایا جاتا - زیادہ تعریف کرتے بھی خوف معلوم ہوتا ہے - کیونکہ بلبل اگر پرانے خیالات کا جانور نکلا تو ہمیں اپنی رقابت کا الزام دے کے موسمِ خزاں کی شکایت کرتے کرتے ہماری بھی شکایت کرنے لگے گا - مگر کیا کیا جائے جب قدرت کوئی اپنی بیش بہا صنعت نظر کے سامنے کر دیتی ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تعریف کرنے لگئیے - پھول کے سوا اور کون چیز ہے ، جس پر قدرت نے اپنی کاری گری کا پورا زور

صرف کر دیا۔ ہونے کو تو ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر خدا جانے خوش نمائی کس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ جس کی آنکھ پڑ جاتی ہے اسے بھلی ہی معلوم ہوتی ہے۔ صحنِ چمن، جس میں حسینانِ جہاں اپنی ناز آفرینیوں اور مشاطۂ قدرت کی چابک دستیوں کا مقابلہ کرنے کو آ بیٹھے ہیں، اس کی رونق موسمِ بہار کے انھیں حسن فروشوں سے ہے جنھیں لوگ پھول کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ دلفریب عروسانہ بزمِ قدرت یعنی پیارے پیارے خوشنما پھول اپنے بے مثل حسنِ خدا داد میں کچھ ایسی کشش رکھتے ہیں کہ دلدادگانِ یار، جن کا دل جمالِ یار کے سوا زمانے کے کل حسینوں سے ہٹ جاتا ہے، وہ بھی کبھی وحشتِ دل ابھرتی ہے تو کوئے جاناں کے عوض صحنِ چمن میں نکل آتے ہیں اور ان آنکھوں کو بھلے معلوم ہونے والے پھولوں کو دیکھ کے اور بے تاب ہو کے بار بار اس مصرع کو زبان سے دہراتے ہیں۔

ای گل بہ تو خرسندم تو بوی کسی داری[1]

باغ کی زینت صرف نظر فریب اور رنگ برنگ پھولوں سے ہے۔ سہانے اور جاں فزا وقت صباح میں سطحِ ارض کے ہر حصے سے ایک قسم کی بشاشت اور مسرت نمایاں ہوتی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ ان قدرتی حسینوں کے مسکرانے اور شگفتہ ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت یہ اپنے حسنِ عالم فریب پر ناز کرنے والے پھول بے تحاشا کھل پڑتے ہیں اور جوش خود پرستی کی ہنسی ان سے ضبط نہیں ہو سکتی۔ ان کی اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے اور اسی وجہ سے ان کے جذبات خدا جانے کس کس کو کہاں کہاں سے کھینچتے ہیں اور صحنِ چمن میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

۱۔ اے پھول میں تجھ سے بہت خوش ہوں کیونکہ تجھ میں کسی کی خوشبو ہے۔

نسیم جو نہیں معلوم کن جنگلوں کی ہوا کھاتی پھرتی تھی، ان کی سیر دیکھنے کے لیے آتی ہے اور نونہالانِ چمن کے ادھر اُدھر آہستہ آہستہ خوش خرامیاں کرنے لگتی ہے۔ نازک دماغ طیور اڑ اڑ آتے ہیں اور درختوں کی نازک ٹہنیوں پر بیٹھ کے جوشِ سرور میں چہچہانے لگتے ہیں۔ اور سحر کی دھیمی دھیمی شعاعیں افقِ مشرق سے آتی ہیں اور تر و تازہ سبز پوش خوش قدانِ گلشن کے دامنوں سے چھن چھن کے رنگین پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑتی ہیں اور ایک نئی بہار پیدا کر دیتی ہیں۔ آسمان کے جھلملاتے ہوئے تارے اس دنیا کی بہار کو واپسیں نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی کرنیں جواہر نما قطرہ ہائے شبنم میں دلچسپ جھلکیاں دکھا دکھا کے زمین کو بھی آسمان کا نمونہ بنائے دیتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گویا تارے بھی خوش رُویانِ چمن کی بزمِ سرور کے مہمان ہیں۔ وہ حسن پرست جنھیں نظر بازی اور قدرتی صناعیوں کی قدر دانی کا لپکا ہے اور اسی بات میں تو ان کا دل نہیں لگتا۔ اس وقت ٹہلتے ہوئے ادھر نکل آتے ہیں۔ اور نوجوانانِ چمن کے آس پاس ایک لطف کے ساتھ ٹہلتے پھرتے ہیں۔ غرض ہر طرح کے زندہ دل مہمان جمع ہوتے ہیں اور ان کی خاطرداری کے لیے پھولوں نے اپنی خوشبوئیں چاروں طرف کی فضا میں پھیلا دی ہیں اور باغبانِ فطرت نے اپنی اس نکھری محفل کی رونق کے لیے بہارِ باغ پر تر و تازگی کی ایک اور نظر فریب جلد پھیر دی ہے مگر اس محفل کی ساری رونق کس چیز سے ہے؟ یہ کس کے جذبات ہیں جو ان زندہ دل مہمانوں کو دور دور سے یہاں کھینچ لائے ہیں۔ اس سب کی اصل و مرجعِ شاہدانِ چمن پیارے پھولوں کا جلوہ ہے۔

خندۂ گل کو ہمیشہ شعراء تبسمِ جاناں تصور کیا کرتے ہیں۔

شعراء درکنار ہر قسم کے نازک دماغوں نے پھولوں کو باغ قدرت میں سے منتخب کیا اور یہ انتخاب ایسا سچا ہے کہ آج تک کوئی نکتہ چینی نہیں کرسکا۔ ہر موقع محل پر آپ کو یہی نظر آئے گا کہ شاہدانِ باغ جو کسی موقع پر خود معشوق ہوتے ہیں اور کبھی نوجوانانِ چمن کے نازک چمکتے ہوئے اعضاء یعنی ٹہنیوں کے زیور بن کے نمودار ہوتے ہیں ان کو ہر مذاق اور ہر سوسائٹی نے دلچسپی یا رونق کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ نازک ادا اور نازک دماغ جو اپنی دل ربائیوں اور دلبریوں کی وجہ سے حسن کی دنیا میں خود بھی منتخب کیے گئے ہیں، انھوں نے اپنے سچے اور اچھوتے مذاق میں پیارے خوش نما پھولوں کو دنیا بھر میں سے بطور عمدہ سامانِ حسن کے چن لیا ہے۔

غور کرنے کی جگہ ہے کہ یہ پھول کس کس طرح سے اور کس کس خوبی سے ان کے کام آتے ہیں۔ کانوں میں پھولوں کی بجلیاں ہوتی ہیں۔ نازک کلائیوں میں پھولوں کے کنگن ہوتے ہیں۔ موجودہ مہذب ممالک کی جو روشن اور پری جمال لیڈیاں سر سے پاؤں تک پھولوں سے آراستہ ہوکر جب نکھری صحبتوں میں اپنی ادائیں دکھاتی ہیں، اس وقت خیال میں آتا ہے کہ پھول قدرت کا کتنا بڑا عطیہ ہیں۔ وہ نازک دماغ جنھیں اپنے سچے ذوق پر ناز ہے، ہمیشہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے اپنے دل و دماغ کو تر و تازہ کیا کرتے ہیں۔

اے کسی نہ کسی طرح ہماری دلچسپی کا سامان پیدا کردینے والی قدرت! تو نے پھولوں کو پیدا کرنے میں اتنی بڑی فیاضی دکھائی ہے کہ باغِ دنیا کی سیر کرنے والے کبھی تیرا شکریہ ادا کرنے سے سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ فرانس و انگلینڈ کے مہوشوں

کی ٹوپیاں اسی بے نظیر اور سادے زیور (پھولوں) سے سجی جاتی ہیں ، جو خاص تیرے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے ، وہ سادہ مزاج کوہستانی دلربائیں ، جن کو زمانے نے اپنے پر تکلف سونے ، چاندی اور جواہرات کے زیور سے محروم رکھا ہے ، ان کے لیے تو نے اپنا قدرتی حسن دان کھول دیا ہے ، جس سے نکال نکال کے وہ خوشنما اور خوبصورت پھول اپنے سروں پر آراستہ کرتی ہیں - یہی وہ زیور ہے جو دنیا کے غریب سے غریب اور سادے سے سادے پری رخ کے کام آتا ہے اور ہزار پر تکلف زیوروں سے زیادہ بہار دکھاتا ہے -

وہ سارے حسن جو کوہستان اور صحرائی گانووں میں نظر آتے ہیں ، جن کی طرف سے نیچر دنیا کو بے پروا کر دیتا ہے اور خاص اپنی مشاطگی کے لیے منتخب کرتا ہے ، ان کے سارے حسن کی رونق صرف انھیں خوش نما پھولوں کے ذریعے سے نمایاں ہوتی ہے ، جن سے آفتاب صبح کی شعاعیں کھیلتی ہیں اور جن کے ساتھ نسیمِ سحر کے جھونکے شوخیاں کرتے ہیں -

اے پھول ! تو اس سے بھی زیادہ ہمارے کام آتا ہے - تو ہماری زندگی کا ہی نہیں ، ہمارے مرنے کا بھی رفیق ہے - وہ کیا حسرت ناک مقام ہوتا ہے جب دنیا انسان کو چھوڑ دیتی ہے - اپنی ساری راحتیں تمام دولتیں ، ہر قسم کی دنیاوی دلچسپیاں ہم سے چھین لیتی ہے - ایک ٹوٹی ہوئی یا کم حیثیت قبر ہمارا بستر راحت یا مصیبت ہوتی ہے - پوری پوری سناٹے کی مہیب اور خوفناک راتیں اسی گوشۂ تنہائی میں ہم پر گزر جاتی ہیں - صبح ہونے کو ہوتی ہے اس وقت نہ کوئی مونس ہوتا ہے ، نہ ہمدرد - نسیمِ سحر کے جھونکے بھی یہ قہر ڈھاتے ہوئے آتے ہیں کہ رات بھر کی جھلملاتی ہوئی شمع کو موت کے تھپیڑے دے کر گل کردیتے ہیں اور تیری خوشبو کو ادھر ادھر

اڑا لے جانا چاہتے ہیں ۔ اس وقت ہمیں کسی ہمدرد کی صورت نظر نہیں آتی ۔ یہاں آفتاب سحر کی ہلکی ہلکی روشنی میں تو نظر آتا ہے اور دل کو ایک تسلی سی ہوجاتی ہے ۔ نازک نازک اور پیارے پیارے پھولوں کی چادر ان یاس نصیبوں کی قبروں پر بچھا دی جاتی ہے ، جنھوں نے دنیاوی ناکامیوں سے مایوس ہو کر نہایت حسرت اور آزردگی سے جان دی ہے ۔ دنیا کے تمام سامانِ عشرت اور کل دلچسپی کی چیزیں پہلی منزل پر مسافرانِ عدم کا ساتھ چھوڑ دیا کرتی ہیں ، عزیز و اقارب ، دوست و احباب سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ، مگر اے وفادار عروسانِ چمن ! تمھارا ساتھ ہرگز نہیں چھوٹتا ۔

سوالات

۱۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے پھول کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے ؟

۲۔ پھول کی خوشنمائی کن باتوں میں ملحوظ ہے ؟

۳۔ پھولوں بھرے باغ میں جاکر جذبات اور احساسات کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔

۴۔ محفلِ گلشن کی رونق کس چیز سے ہے ؟

۵۔ پھول پیدا کرنے پر شرر خدا کا شکر کیوں ادا کرتے ہیں ؟

۶ ۔ پھول کا انسانی زندگی سے رشتہ کیسے استوار رہتا ہے ۔

۷ ۔ مندرجہ ذیل کلمات اور تراکیب کو اپنے فقرات میں استعمال کیجیے :
محفلِ عشرت ۔ بزمِ طرب ۔ ناز آفرینی ۔ مشاطہ ۔ وحشتِ دل ۔ نونہالان چمن ۔ خندۂ گل ۔ حور وش ۔

۸ ۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے ۔
طیور ۔ قطرہ ۔ اذہان عطیہ ۔ قبر ۔ عروسان ۔

۹ ۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے مطلب واضح ہوجائیں ۔
کوٹ کوٹ کر بھرنا ۔ الزام دینا ۔ دل لگانا ۔ نکتہ چینی ۔

—— : o : ——

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب موضع انگہ ضلع سرگودھا ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ شیخوپورہ اور بعد ازاں بہاولپور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کرکے محکمۂ آب کاری میں سب انسپکٹر ہوئے، لیکن یہ کام ان کی طبیعت کے مطابق نہ تھا چنانچہ ملازمت ترک کرکے ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ "تہذیب نسواں"، "پھول" ادب لطیف وغیرہ کے مدیر رہے، اور پھر اپنا رسالہ "فنون" کے نام سے جاری کیا۔ ان دنوں مجلس ترقیِ ادب کے ڈائرکٹر ہیں۔

قاسمی صاحب ایک مشہور شاعر کامیاب اخبار نویس اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ طبقاتی ناہمواری اور سامراجی تشدد کے خلاف جذبہ ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔

سفارش

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے۔ مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا "بھئی فیکے کہاں ہے؟ تانگا لاؤ نا"

"تانگا تو بابو جی آج نہیں جوڑا ہے" فیکے نے جواب دیا۔ میں نے دیکھا فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا آج اتنا معصوم لگ رہا تھا جیسے پہلی جماعت میں داخلہ لینے آیا ہو۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے فیکے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "بابو جی ایک کام ہے"۔

"ہاں کہو" میں نے کہا۔

"کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟" فیکا بولا، "اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے"۔

"اوہو مجھے دکھ ہوا۔ کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟"

"جی نہیں" فیکے کے چہرے پر بھولپن کا ایک اور چھینٹا پڑ گیا۔

"لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو سانڈے کا تیل بیچنے والا ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسولؐ کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جانے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کتہ دیا کہ حکیم خدا رسولؐ کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے اماں نے بھی یہی صلاح دی اس نے "لقمان حکیم حکمت کا بادشاہ" پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ لگی

ہو تو اپنے باپ کا نہیں ۔ بابو جی آپ تھک تو نہیں گئے ؟ سگرٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں ؟ "

اس وقت فیکا ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گُڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے ۔ میں نے کہا "تم بھی حد کرتے ہو فیکے اب آگے بھی کہو نا ۔ "

فیکے کی آنکھوں میں معصومیت کی نمی جاگی وہ بولا "بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزاری پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا شیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا ۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ ابال کر باندھو ، باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا ۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی ۔ بابو جی اسے ایک ہسپتال میں لے گئے ۔ پھر دوسرے میں لے گئے ۔ دونوں میں جگہ نہ ملی ۔ دوپہر کو راجگڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میوہسپتال میں چوکیدار ہے اس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں ۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہہ دیجیے کہ صدیقے مریض کو ذرا دیکھ لے "

میں نے کہا "وہاں ایک ڈاکٹر ہے ۔ ڈاکٹر عبدالجبار ان سے میرا سلام کہو کام ہو جائے گا ۔ نہ ہوا تو کل میں تمھارے ساتھ چلوں گا ۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے نام یاد کر لو

ڈاکٹر عبدالجبار"

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی تانگا مل گیا جب تانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتہ پوچھ رہا ہو گا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہہ دوں مگر اب تانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکا یک جبار صاحب کا سکوٹر میرے تانگے کے قریب سے گزر گیا۔ "جبار صاحب" میں چلایا مگر جبار میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں میں نے سوچا کل کہہ دوں گا پہلا کام ہی یہی کروں گا۔ رات کو میں واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا کہ اس وقت کون بلائے اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہو گی صبح ہی کو ہوگی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے، ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے

"یعنی تمھارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟" میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

"جی ہاں وہ بولا مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔"

"اور اس کی آنکھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو چلی گئی بابو جی"۔ فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا "جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتالوں میں کیوں گھسیٹتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہو گا روپیہ بھی ضائع ہو گا۔"

فیکا بولا "بابو جی کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولھا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے کیا پتہ کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔"

میں اس بات سے چونکا آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں پھر وہ عاجزی سے بولا "بابو جی ذرا سا میرے ساتھ چلیے۔"

میرے جسم سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی، پھر نہانا تھا، شیو کرنا تھا، چائے پینا تھی۔ میں نے کہا "میں تمھیں اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو۔ بڑے اچھے آدمی ہیں فٹا فٹ کام کر دیں گے تمھارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا۔"

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہو میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا کہ 'جبار صاحب اس کا کام کر دیجیے بے چارہ بڑا ہی غریب آدمی ہے۔ دعائیں دے

گا" اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اس نے بتایا کہ جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا کہتے ہیں کہ باری سے آؤ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔"

فیکے نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے اتنے میں فیکا بھی آ نکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لیے جھوٹ بولنا پڑا "کیوں فیکے جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟"

وہ بولا مگر بابو جی وہ تو مجھ سے ملے نہیں"

میں نے فوراً کہا میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔"

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں معصومیت کی نمی جاگ اٹھی۔ جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ

کیوں کتہ رہی ہے کہ دیکھو بڈھے کو تکلیف نہ ہو "

اس میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا "آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب انھوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی آج اماں کو ساتھ لے کر گیا دو روپے کل ہو گئے کچھ ہو سکے تو کیجیے۔"

میں نے کہا میں ابھی جاکر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں "

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب نہ مل سکے اور مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا بابو جی "سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔"

جھوٹ نے میری ندامت کو کان پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا واپس آ گیا نا تمھارا بابا ؟۔

فیکا بولا "واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہو گیا۔ جمعے کو پٹی کھل رہی ہے دعا کیجیے" میں نے کہا "اللہ رحم کرے گا۔"

پھر وہ جمعے کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا "بابو جی غضب ہو گیا۔ پٹی کھلی تو پتہ چلا ایک آنکھ تو گئی ہی تھی ، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم ملے تو دوسرا اپریشن ہوگا اور دوسری آنکھ کا بھی ہوگا "۔

میں نے اسے تسلی دی اور ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا مگر بد قسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوے تو انہیں گھر جا کر پکڑوں گا۔"

دوسرے دن میں تو جا نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا وہ پھر غائب تھے۔ ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے میں نے بھی کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا "کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں ؟"

"جی ہاں "نوکر بولا "بس میرے منہ سے نکل گیا"

"بڑے احمق آدمی ہو" میں نے اسے ڈانٹا اور کہا "جاؤ کہ دو کپڑے بدل رہے ہیں، آتے ہیں۔"

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ

بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا "بابو جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اس کی آواز بھرا گئی اور جھک کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے بمشکل میں نے کہا "فیکے بات یہ ہے کہ فیکے کہ۔۔۔۔ بات یہ ہے۔"

آنسوؤں سے بھیگا ہوا بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا اور بولا "بابو جی! کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں، میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ بابو جی! قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔"

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا کوئی بات نہیں فیکے کوئی بات نہیں۔"

سوالات

۱۔ اس افسانے میں سفارش کرنے والے کردار کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

۲۔ فیکے کوچوان کو سفارش کی ضرورت کیوں پیش آئی؟
کیا اس کے والد کا علاج سفارش کے ذریعے سے ہوا یا بغیر سفارش کے؟

۳۔ سفارش اچھی بات ہے یا بری؟

۴۔ فیکے کے والد کی آنکھوں کے علاج کے لیے کوچوانوں نے کیا کیا تجویزیں پیش کیں؟ کیا ہمیں علاج کے لیے ڈاکٹر کے

علاوہ دوسروں کا مشورہ قبول کرنا چاہیے ؟

۵ - اس افسانے میں بعض ایسے کلمات استعمال ہوئے ہیں جو پنجابی سے لیے گئے ہیں - ان کلمات کی نشان دہی کیجیے -

٦ - میں اور مجھے میں کیا فرق ہے ؟

۷ - فعل ناقص کیا ہوتا ہے ؟ اس افسانے سے چند مثالیں تلاش کیجیے -

۸ - ''فیکا کوچوان آیا - میں نے بھی کھڑکی میں سے دیکھ لیا بالکل ہلدی ہورہا تھا''

مندرجہ بالا جملے میں 'ہلدی' کا کلمہ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے ؟ اس قسم کے استعمال کو کیا کہتے ہیں - اسی قسم کی چند ایک مثالیں لکھیے -

۹ - اس افسانے میں سے تین جملے لے کر ان میں فاعل ، فعل ، مفعول ، وغیرہ الگ الگ کیجیے -

———:o:———

راشد الخیری

(۱۸۷۰ - ۱۹۳۶ء)

علامہ راشد الخیری دلی میں پیدا ہوے اور وہیں تعلیم پائی ۔ وہ عورتوں کے حقوق کے زبردست حامی تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خواتین کی اصلاح تعلیم اور بہبود کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ۔ وہ عمر بھر خواتین کے حقوق کے لیے جد و جہد کرتے رہے ۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنا مشہور ماہنامہ ''عصمت'' جاری کیا ۔ جو ایک مدت تک خواتین کا محبوب ترین رسالہ تھا ۔

انھوں نے تاریخ اسلام اور عورت کی مظلومیت کو کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ۔ انھوں نے ہندوستان کی مسلم خواتین کی داستانیں جس درد مندی اور دل سوزی سے بیان کی ہیں ، اس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی ۔ ان کی ان تحریروں میں بے پناہ درد اور اور اثر ہے ، اس لیے راشد الخیری کو ''مصور غم'' کہا جاتا ہے ۔ وہ دلی کی عام بول چال کی زبان لکھتے ہیں ۔ خواتین کی زبان اور محاورات پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے ۔

محروم وراثت

محمد احسن تحصیل دار کے دونوں بچے ، محسن اور رضیہ ، تھے تو حقیقی بہن بھائی ، مگر نہ معلوم احسن کس طبیعت کا باپ تھا کہ

اس کی وہی نظر محسن پر پڑتی تو محبت میں ڈوبی ہوئی اور رضیہؔ پر پڑتی تو زہر میں بجھی ، سمجھدار پڑھا لکھا مگر ظالم کی عقل پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ نہ دیکھ کر خوش ہوتا نہ سوچ کر نادم ۔ محسن کی تعلیم پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا ۔ رضیہؔ غریب کو استانی بھی میسر نہ تھی ۔ کچھ اس لیے نہیں کہ وہ تعلیمِ نسواں کا مخالف تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی کمائی میں اس کو حقدار نہ سمجھتا تھا ۔ محسن کے پاس جوتی کے آٹھ آٹھ دس دس جوڑے اور رضیہؔ کے پاس صرف ایک اور وہ بھی مہینوں کی ٹوٹی پھوٹی تو نہیں مگر ٹوٹی سے بد تر ۔ محسن کے پاس ایک نہیں درجن بھر سوٹ اور رضیہؔ کے پاس ان گنے دو دوپٹے ۔ اور لطف یہ کہ جو کچھ بھی رضیہؔ کو میسر تھا وہ اس کا حق ، یا باپ کی محبت نہیں صرف صفیہؔ کا اِصرار تھا ۔ ورنہ واقعات تو یہی کہتے ہیں کہ رضیہؔ کھلے سر اور ننگے پاؤں بھی پھرتی تو احسن کو ملال نہ ہوتا ۔ باپ کی اس بے پروائی اور بے وفائی پر بھی وقت رضیہؔ کے ساتھ تھا ۔ صفیہؔ جہاں شوہر کی اس کمی پر افسوس کر رہی تھی ، وہاں اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ اس نقصان کی تلافی کی اور جہاں بھی ممکن ہوا ، اس کی تعلیم و تربیت میں انتہائی کوشش کرتی رہی ۔ رضیہؔ کی فراست اس کا شوق ، اس کی سعادت مندی ، صبر اور خاموشی ماں کے دل میں گڑی جاتی تھی ۔ وہ اس کے یا اس کے باپ کے سامنے نہیں ، تنہائی میں اکثر روتی ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عید کے موقعے پر اس لیے کہ کچھ عزیز آنے والے تھے ، شاموں شام احسن نے بیوی اور بچے کے لیے سب سامان منگوایا ۔ احسن ، محسن ، رضیہؔ ، صفیہؔ چاروں بیٹھے تھے ۔ احسن ایک ایک چیز اٹھاتا اور دکھاتا جاتا تھا اور متوقع تھا کہ اس کی بیوی ، اس کے بچے اس انتخاب کی داد دیں ۔ احسن جس وقت ایک

چیز دکھانے کے بعد صفِیّہ ، رضِیّہ اور محسن کی صورت دیکھ کر داد طلب کرتا اس وقت صفِیّہ کبھی اس ڈھیر کو ،کبھی شوہر کو اس امید پر دیکھتی اور تکتی کہ شاید اس ڈھیر سے یا شوہر کے منہ سے رضِیّہ کے لیے کوئی چیز یا رضِیّہ کا نام نکلے مگر پوری نو چیزیں چار صفِیّہ اور پانچ محسن کی ۔ ختم ہوگئیں ۔ لیکن رضِیّہ کے نام کی چیز نہ ڈھیری سے نکلی اور نہ اِس کا نام باپ کے منہ سے نکلا ۔ محسن نے باپ کی محبت اور کوشش کی داد دی ۔ دل کھول کر دی اور پیٹ بھر کر دی ۔ مگر صفِیّہ کے سامنے اس وقت ایک اور ہی سماں تھا ۔ وہ اوپری دل سے تعریف کرتی ہوئی اٹھی ۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ غنی ! مسلمان بچیاں جو ماں کی چوکھٹ پر چند روز مہمان ہیں ، بھائیوں کے مقابلے میں اتنا حق بھی نہیں رکھتیں کہ پانچ کے مقابلے میں ایک چیز آ جاتی ۔ میں جانتی ہوں کہ رضِیّہ کے پاس سب کچھ ہے اور میں نے حیثیت سے زیادہ اور ضرورت سے بڑھ کر اس کا سامان کر لیا ہے ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب ہی کی کمائی کا ہے ، اس کے واسطے اگر ایک چیز بھی اس وقت آ جاتی تو اس کا دل کتنا بڑھ جاتا ۔ باپ اس کی خوشی دو چار روپے میں مول نہ لے سکا ۔ محسن خدا اس کی عمر دراز کرے ، آگے اور پیچھے آج اور کل مالک اور مختار ہے ، لیتا ہے اور لے گا ۔ مگر رضِیّہ کہاں اور یہ گھر کہاں ۔

صفِیّہ شوہر کے پاس سے ایک خفیف بخار دل میں لے کر اٹھی تھی ۔ مگر کمرے تک پہنچتے پہنچتے بلبلا گئی اور اس خیال کے آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ جانتی تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے ہیں اور چاہتی تھی کہ اس حالت کو ظاہر نہ ہونے دے ۔ مگر اس جذبۂ محبت نے جو مامتا کی آغوش میں پلا تھا بے قابو کر دیا اور بچی کی صورت دیکھنے کو منہ پھیرا ۔ ایک

ساکت مجسمہ تھا جو رضیہ کی صورت میں گم سم باپ کے سامنے بیٹھا زمین کو دیکھ رہا تھا۔ ماں نے بچی کی خاموش صورت دیکھ کر اس کے دل کی کتاب پڑھی اور ٹھنڈا سانس بھر کر آگے بڑھی۔ احسن بیوی کا رنگ دیکھ کر حیرت میں ادھر آیا اور کہنے لگا:

''بس وہی ایک پیٹنا کہ رضیہ کا کچھ نہ آیا۔ اس کے پاس سب کچھ موجود ہے۔''

بیوی: ''موجود تو محسن کے پاس بھی ہے۔''

میاں: ''محسن کی اور اس کی کیا برابری،''

بیوی: ''کیوں؟''

میاں: ''وہ گھر کا مالک ہے، یہ پرایا دھن۔''

بیوی: ــــــــ۔

میاں: ''اس کے علاوہ کنواری بچی کو جو مل گیا وہ غنیمت ہے۔''

بیوی: ــــــــ۔

(۲)

محسن بی۔ اے میں کامیاب ہوا تو رضیہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی اور ایک یہی کیا ماں کی توجہ اور کوشش نے نسوانیت کے تمام جوہر اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کی شادی ساتھ ساتھ ٹھہری۔ مگر اس احتمال سے کہ موروثی جائداد رضیہ کی وساطت سے پرائے قبضے میں نہ جائے احسن نے اس کے نکاح سے قبل قریب قریب تمام جائداد وقف علی الاولاد کی آڑ میں محسن کے حوالے کی اور رضیہ کو محروم کر دیا۔ صفیہ نے بہتیرا غل مچایا مگر یہ تو بڑا کام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں

بیویوں کی مخالفت کا شوہروں کے مقابلے میں جو نتیجہ ہو سکتا ہے، مسلمان اس راز سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ صفیہؔ کو بڑا صدمہ یہ تھا کہ اس کی اپنی جائداد بھی جو میکے سے ملی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں فنا ہو رہی تھی۔

مسلمان قلم کی طاقت اور زبان کے زور سے جھٹلا لیں مگر ہے کوئی مسلمان جو ایمان سے کہہ سکے کہ بچوں والی بیوی، بہو اور داماد والی یا ہونے والی، شوہر کی اتنی مخالفت کے بعد کہ ایسی دستاویز پر دستخط نہ کرے، اس کے گھر میں خوش رہ سکتی ہے؟ احسن کے پنجرے میں صفیہؔ ہرچند پھڑ پھڑائی مگر معاشرت اسلامی کا موجودہ لاسہ اتنا تیز اور اتنا گہرا تھا کہ جتنی تڑپی اتنی ہی چپکی۔ گھر میں ہفتہ بھر قیامت بپا رہی اور اس کے بعد احسن نے اندر کی آمد و رفت قطعاً بند کر دی۔ صفیہؔ برس چھ مہینے کی بیاہی نہ تھی۔ بیس بائیس برس کی گرہستن، نہایت ہی استقلال سے شوہر کا مقابلہ کیا۔ اس حالت اور ایسے موقعوں پر مسلمان مردوں کے پاس نکاح ثانی کا حربہ چلتا ہوا ہتھیار ہے۔ مگر صفیہؔ اس کو بھی خاطر میں نہ لائی اور میاں سے صاف صاف کہہ دیا کہ گھر اگر موم و نون کا ہے کہ دھوپ سے پگھلے اور پانی سے بہے تو میں کہاں تک روکوں گی۔

بسم اللہ! آج نہ کیا کل اور کل نہ کیا پرسوں۔

مطالبۂ حقوقِ نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے مسلمان جو کچھ فرمائیں ہمارے سر آنکھوں پر مگر خدا را وہ بتائیں کہ اس موقعے پر جب احسن نے ہر طرف سے ناکام ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ رضیہؔ کے نکاح ہی کا خاتمہ کر دے اور تمام عمر بیٹی وداع نہ کرے تو صفیہؔ کیا کرتی؟ اس فیصلے نے صفیہؔ کی گردن شوہر

کے سامنے جھکوا دی۔ اس کی اکڑ، اس کا استقلال، اس کا ضبط سب فنا ہو گئے اور اب جائداد یا جائداد کی تقسیم تو الگ رہی اس کو نکاح ہی کے لالے پڑ گئے اور یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے غریب بچی کی عمر تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس نے کاغذ پر دستخط کیے اور اس طرح رضیہؔ ماں باپ کی جائداد سے محروم وداع ہو کر سسرال رخصت ہو گئی۔

(۳)

محسن بی۔ اے کے بعد قانون میں کامیاب ہوا۔ رضیہؔ ایک بچے کی ماں بنی۔ صفیہؔ حج سے فارغ ہوئی۔ احسن پر فالج گرا اور وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس وقت گھر کا مالک اور سپید و سیاہ کا مختار، جائداد کا منتظم محسن تھا اور گو آمدنی معقول تھی۔ اللّے تلّلوں نے مقروض کیا اور نوبت یہاں تک آئی کہ جس گھر میں دس پانچ ہزار روپیہ ہر وقت موجود رہتا تھا، اس میں سے سو پچاس بھی مشکل سے نکل سکتے تھے۔ صفیہؔ کی دور اندیشی تھی کہ کچھ روپیہ اپنے پاس الگ رکھا تھا۔ باقی زیور سے مدد لی اور حج کر لیا۔ واپس آئی تو محسن کا یہ رنگ دیکھ کر سناٹے میں رہ گئی۔ مگر جو لڑکا زندہ باپ کو مردہ سمجھ رہا تھا، وہ ماں کو کیا خاطر میں لاتا۔ محسن کی بعض دفعہ پریشانیاں اور پریشانیاں نہیں فضول خرچیاں ماں کو سخت خلجان میں ڈال دیتیں اور وہ اب یہ سمجھ گئی تھی کہ عنقریب یہ مجھ سے روپیہ طلب کرنے والا ہے۔ اس لیے گھر کی برابر والی مسجد کی تعمیر اس کے واسطے بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے فوراً شوہر کے کان میں بات ڈال کر جو کچھ زیور بچا تھا، مسجد کی نذر کیا۔ مگر یہ خبر احسن اور صفیہؔ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ تھی کہ فالج کا دورہ ایسا سخت ہوگا اور سنگدل محسن عاشق زار باپ

تو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلا دے گا۔ صفیہ کے پاس ابھی تھوڑی بہت کھرچن موجود تھی۔ اس کے طفیل اتنا تھا کہ معمولی علاج جاری رہا۔ ڈاکٹروں، حکیموں کی فیس نکل رہی تھی اور نسخے بھی آ رہے تھے، ورنہ محسن نے ایک دن تو کیا، ایک گھڑی بلکہ ایک لمحے کو بھی نہ پوچھا کہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، جب متواتر باپ نے بلایا تو کھڑے کھڑے آیا اور ایک آدھ بات کی اور چلتا ہوا۔

احسن کے پندرہ روز اسی طرح گزرے۔ نہ اٹھ سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اس موقع پر صفیہ نے ایسی خدمت کی جس کی شریف بیویوں سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کو سوا رونے کے کوئی اور کام نہ تھا رات رات اور دن دن بھر پٹی پکڑے بیٹھی رہی۔ اس کی نیند اور بھوک دونوں اڑ چکی تھیں اور اسی کا صدقہ تھا کہ حکیم اور ڈاکٹر آ رہے تھے اور علاج ہو رہا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر نے بجلی کا علاج تجویز کیا جس کا تخمینہ چار ہزار روپے کے قریب تھا۔ احسن اور رضیہ دونوں کو یہ شبہ تھا کہ محسن باپ ہی کا روپیہ جس کی بدولت وہ نواب بنا پھر رہا تھا، باپ کی زندگی اور راحت سے عزیز کرے گا

صبح سے بلاتے بلاتے شام ہو گئی۔ دنیا بھر آئی مگر محسن نہ آیا۔ خدا خدا کر کے شام کو لوٹا تو باپ نے اپنے منہ سے ساری کیفیت سنائی اور چار ہزار روپے مانگے۔ بے وفا مسکرا کر اٹھا اور بغیر جواب دیے چلا تو ماں پیچھے پیچھے گئی اور کہا: "میاں! بجلی کے علاج کا انتظام کرو۔" ایک ایسی نظر سے جس میں تعجب اور غصہ دونوں شامل تھے، محسن نے ماں کو دیکھ کر کہا:

"تمھاری تو عقل جاتی رہی ہے۔ اول تو روپیہ ہی نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول ہے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ

موت یقینی ہے ۔ اگر کچھ روز کو بچ گئے تو سوہان روح ہوں گے ۔"
صفیؔہ کا قدم آگے نہ اٹھ سکا ۔ دہِم ہوگئی ۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا ۔ اس کو تو کچھ نہ کہہ سکی مگر اپنے دل میں کہا کہ "ایسے نا ہنجار لڑکے کی ماں زمین شق ہو اور سما جائے ۔ اب میں جاکر کیا جواب دوں ۔" کھڑی سوچ رہی تھی کہ رضیؔہ کا خط ملا ۔

اماں جان !

آداب عرض کرتی ہوں ۔

جب سے ابا جان کی بیماری اور ان کی کیفیت سنی ہے دل ہوا ہو رہا ہے ۔ ہائے میرے ابا جان کو کیا ہوگیا ۔ میں تو بھلا چنگا چھوڑ کر آئی تھی ۔ مجھ بد نصیب کو تو ابھی معلوم ہوا ہے ۔ اے اللہ ! کیا کروں ؟ ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں ۔ جس طرح سے ہوگا آج ہی رات کو یا کل فجر حاضر ہوں گی ۔ میرے آنے کا تذکرہ نہ کیجیے خفا ہوں گے ۔ میں سامنے نہ جاؤں گی ، دور ہی سے شکل دیکھ لوں گی ۔

اچھی اماں جان ! علاج میں کمی نہ کرنا ۔

آپ کی فرمانبردار بیٹی

رضیؔہ

(۴)

رضیؔہ علی الصبح میکے پہنچی ۔ باپ کی حالت اور مفصّل کیفیت سن کر الٹے پاؤں واپس آ گئی ۔ رات کے دس بجے تھے ، احسن یہ سن کر کہ محسن نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا ، انگاروں پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا ۔ مگر مجبور تھا کہ ہلنے کی طاقت نہ تھی اور کوئی دم کا مہمان تھا ۔ آنکھیں بند تھیں کہ ایک ہاتھ نے اس کا

مفلوج ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ احسن نے آنکھ کھولی تو دیکھا رضیہؒ سامنے کھڑی ہے اور آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

وہ یہ سمجھ کر کہ باپ کو میری صورت سے تکلیف نہ ہو، ہاتھ جوڑتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی تو صفیہؒ نے کہا:

"رضیہؒ یہ چار ہزار روپے لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے جو پانچ ہزار روپے اس کو نقد دیے تھے، اس میں سے یہ لے لیجیے اور علاج کیجیے۔ جس رضیہؒ کی صورت سے باپ کو نفرت تھی، جس پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا بارِ گراں تھا، اس کا سر اس وقت باپ کے قدموں میں تھا اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے:

"ابا جان یہ آپ ہی کا روپیہ ہے میرا نہیں۔"

آج احسن کو معلوم ہوا کہ بھولی بھالی بچیاں کیا چیز ہیں۔ اس نے بچی کو بلا کر سینے سے لگایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

سوالات

۱۔ کیا احسن اپنی اولاد سے یکساں سلوک کرتا تھا؟
۲۔ رضیہؒ کے ساتھ احسن کا رویہ کیا تھا اور کیوں؟
۳۔ کیا اسلام میں بچیوں سے کمتر سلوک کرنا روا ہے؟
۴۔ رضیہؒ کو جائیداد سے کیوں محروم کیا گیا؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟
۵۔ محسن نے باپ کی بیماری میں جو سلوک کیا، وہ شرافت اور انسانیت کے مطابق تھا؟ اس سلسلے میں اسلام کیا تعلیم دیتا ہے؟

۶۔ اس افسانے سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

۷۔ "روپیہ پانی کی طرح بہایا"۔ اس فقرے میں روپیہ کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے؟ اس تشبیہ کا سبب کیا ہے؟

۸۔ محاورہ کسے کہتے ہیں؟ اس افسانے میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کریں اور ان کے معنی بیان کریں۔

۹۔ مصدر اور حاصل مصدر میں کیا فرق ہے؟ اپنے استاد صاحب سے دریافت کیجیے اور پھر اس افسانے میں استعمال ہونے والے مصدر اور حاصل مصدر الگ الگ لکھیے۔

———:o:———

مولانا الطاف حسین حالی

زبان گویا

اے میری بلبل ہزارداستان ! اے میری طوطئ شیوا بیان ! اے میری قاصد ! اے میری ترجمان ! اے میری وکیل ! اے میری زبان ! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے ؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے - کبھی تو ایک حرفِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رونا جادو کا اتار - کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی - تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی -

اے میری زبان ! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے ، جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں -

اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی ! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رولانا ، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا اور کس سے سیکھا ؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں اور اور کہیں بول

تیرے شربت کے گھونٹ ہیں ۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل ، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق ۔

اے زبان ! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں ، ہمارے سینکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے ، ہماری عزت ، ہماری ذلت ، ہماری نیک نامی ، ہماری بدنامی ، ہمارا سچ ، ہمارا جھوٹ ، صرف تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے ۔ ایک تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے ۔ اے زبان ! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرت الٰہی ہے ۔ دیکھ ! اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا ۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور ۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا ۔ تو دل کی امید ہے اور روح کی ایلچی ۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا ۔

اے زبان ! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز ۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز ۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی ، حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی ۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا ۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض اور تلقین و ارشاد تیرا کام ۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام ۔ خبردار اس کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچڑا رہ جائے گا ۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے ، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے ، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی

کھائے اور پھر وہی زبان کہلائے ۔ نہیں ہرگز نہیں ۔ اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ، ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیان ہے ۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے ۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکال لی جائے گی ۔

اے زبان ! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے ، انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے ۔ کسی نے انہیں فریبی اور مکار کہا ، کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا ۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا ، کسی نے سخن ساز ۔ کسی نے بد عہد بتایا ، کسی نے غدار ۔ غیبت اور بہتان ، مکرّ اور افتراء ، طعن اور تشنیع ، گالی اور دشنام ، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی ، غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے ۔ اے زبان ! یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے ۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے ۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے ۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے ۔

اے زبان ! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے ، اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہوجاتا ہے ، تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے ۔ سبحان اللہ ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں ۔ ہم نام کے آدمی مگر ہمارے دل میں نہیں ، اور زبان پر ہاں ۔

الٰہی ! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے ۔ ہم جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور تیرے دربار

میں آئیں تو سچے بن کر آئیں ۔ آمین ۔

سوالات

۱ ۔ بلبل ہزار داستان ۔ طوطیٔ شیوا بیان ۔ قاصد ۔ وکیل ۔ ترجمان کسے کہا گیا ہے ۔

۲ ۔ زبان ماں باپ کا دل کیسے دکھاتی ہے ؟

۳ ۔ زبان کا جوہر اور زیور کیا ہے ؟

۴ ۔ زبان کا منصب کیا ہے ؟

۵ ۔ زبان کا خطاب اور لقب کیا ہے ؟

۶ ۔ زبان کا نام اور کام کیا ہے ؟

۷ ۔ زبان کس وقت زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی ؟

۸ ۔ زبان کا حکم بجا لانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے ؟

۹ ۔ انسان اور جانور میں کیا فرق ہے ؟

۱۰ ۔ مندرجہ ذیل کے معانی لکھیے اور جملوں میں استعمال کیجیے :
بلبل ہزار داستان ۔ طوطیٔ شیوا بیان ۔ قاصد ۔ ساحر ، فسوں ساز ۔ تہمت ۔ غیبت ۔ افعی ۔ جان گداز ۔ حنظل ۔ پارۂ گوشت زبوں ۔ منصب ۔ کاشفِ اسرار ۔ محرمِ راز ۔ خزانۂ غیبی ۔ ناصحِ مشفق ۔

۱۱ ۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے ۔
جی لبھانا ۔ خاک میں ملانا ۔ جی نہ چرانا ۔ دل دکھانا ۔ الزام اٹھانا ۔

۱۲ ۔ جس جملے میں کسی کو حکم دیا جائے ، کسی بات کی تلقین کی جائے یا کسی بات سے منع کیا جائے اسے قواعد کی اصطلاح میں جملۂ انشائیہ کہتے ہیں ۔ اس مضمون میں انشائیہ جملوں کی نشاندہی کیجیے ۔

——:o:——

چراغ حسن حسرت

(۱۹۰۲ - ۱۹۵۵ء)

چراغ حسن حسرت بارہ مولا (کشمیر) کے قریبی گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے - قدیم دستور کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد سے پائی - پونچھ سے میٹرک پاس کیا بعد میں پرائیویٹ طور پر منشی فاضل اور بی - اے کیا ابتدائی دور میں کشمیر اور پھر شملے میں بطور مدرس کام کرتے رہے بعد میں کلکتے چلے گئے اور وہاں اخبار نویسی شروع کی ''عصر جدید''، ''نئی دنیا'' اور ''استقلال'' سے وابستہ رہے کچھ دیر مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''پیغام'' میں بھی کام کیا - ۱۹۲۸ء میں لاہور آ گئے یہاں ''تہذیب نسواں'' اور دوسرے جرائد میں کام کرتے رہے ''سندباد جہازی'' کے نام سے اخباروں میں مضمون بھی لکھتے رہے جو زیادہ تر سیاسی ہوتے تھے- یہیں سے ان کی مزاح نگاری کا چرچا ہوا - کچھ مدت تک فوج میں پبلسٹی کے شعبے سے منسلک رہے پاکستان بن جانے کے بعد اخبار ''امروز'' کے مدیر رہے - آپ کے مضامین کے مجموعے 'مردم دیدہ'، 'کیلے کا چھلکا'، ''حرف و حکایت'' وغیرہ بہت مقبول ہوئے -

کیلے کا چھلکا

۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو نواب چھٹن نہر کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے کہ ایک کیلے کے چھلکے پر سے جو خدا جانے کس ناشدنی نے وہاں پھینک دیا تھا ، پاؤں پھسلا اور نواب عالی قدر

غڑاپ سے نہر میں جا رہے۔ ذرا ۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی تاریخ میں دھیان رکھیے۔ اگر بلرام پور کے شیخ شبراتی اس موقع پر موجود نہ ہوتے تو دنیا نواب چھٹن کو نیلی کوٹھی والے مرحوم نواب کے نام سے یاد کرتی۔ اب یہ سنیے کہ شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کی جان کیسے بچائی؟

کہتے ہیں کہ جب شیخ جی نے جو نہر کے پاس سے گزر رہے تھے، پانی میں بلبلے سے اٹھتے دیکھے تو بول اٹھے، ہائیں یہ کیا؟ ادھر نواب چھٹن بھی پکار اٹھے کہ: "اماں بچائیو، میں ڈوبا۔" شیخ شبراتی نے اچکن اتارتے ہوئے کہا: "یار ابھی نہ ڈوبیو، میں آتا ہوں۔"

شیخ جی نے نہر میں کودتے ہی نواب کو بالوں سے پکڑ لیا کہنے لگے "تم بھی ذرا ہاتھ پاؤں مارو۔ تمھیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ مجھے نہ مارو، بھئی، ہاتھ پاؤں مارو۔"

غرض شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کو کھینچ کھانچ کر کنارے پہنچایا لیکن کنارے پہنچنے سے پہلے نواب صاحب کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ اگر یہ مرد آدمی آج یہاں نہ ہوتا تو وہ مرحوم باپ نواب رفیع الشان کے پاس پہنچ چکے ہوتے۔ چنانچہ کنارے پہنچتے ہی انھوں نے کہا "یار اگر تم یوں نہر میں کود نہ پڑتے تو میں ختم ہو چکا تھا۔"

شیخ شبراتی کہنے لگے: "آج زیادہ کھا گئے تھے کیا؟"

نواب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ادھر آدھر ٹٹولتے ہوئے کہنے لگے: "بھئی تو نے میرا چشمہ تو نہیں دیکھا؟"

"ارے یار اس حالت میں بھی تمھیں چشمے کی پڑی ہے، ذرا اپنی طرف دیکھو تو سہی سارا لباس چوڑا ہو رہا ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نہر میں گرا کیسے ؟"

''معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز پر سے تمھارا پاؤں پھسل گیا ۔''

''آخر کاہے پر سے ؟"

شیخ شبراتی اِدھر اُدھر ٹٹول کر بولے : ''لو مل گیا ۔''

''میرا چشمہ ؟"

"جہنم میں جائے تمھارا چشمہ ، مجھے تو وہ کیلے کا چھلکا ملا ہے جس پر سے تمھارا پاؤں پھسلا تھا ۔ اب میری صلاح مانو تو سیدھے گھر چلے جاؤ ، کپڑے اتار کر سو جاؤ ، اگر تھوڑی سی برانڈی مل جائے تو سبحان اللہ ۔"

''کم بخت برانڈی کا ہی تو سارا فساد ہے ، اگر آج کچھ زیادہ نہ پی گیا ہوتا تو کیا مجھے کیلے کا چھلکا نظر نہ آ جاتا ؟"

"تم رہتے کہاں ہو ؟"

"میں پاس ہی رہتا ہوں ۔ آؤ چلیں ، ہاں بھئی میں تو تمھارا نام بھی نہیں جانتا ۔"

''میرا نام شبراتی ہے ، شیخ شبراتی ۔"

"عجیب بات ہے کہ میں نے تمھارا نام پہلے کبھی نہیں سنا ، حالانکہ تم نے ابھی میری جان بچائی ہے ۔"

"آؤ چلو میں تو سردی سے ٹھٹھرا جا رہا ہوں ۔"

''ہاں چلو ۔ لیکن بھئی تمھیں معلوم ہے کہ اگر تم نہ ہوتے تو میں ڈوب گیا ہوتا ۔"

''اب اسے بھول بھی جاؤ ۔"

"کیسے بھولوں ، مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔"

"اتنے میں نیلی کوٹھی کا بیرونی پھاٹک آ گیا اور نواب چھٹن اس کے پاس پہنچ کر رک گئے ، شیخ شبراتی نے پوچھا "یہاں کیوں ٹھہر گئے ؟"

"اچھا اب رخصت ، میں یہیں رہتا ہوں لیکن میاں تم نے میری جان بچائی ہے اور مجھے تمھاری کوئی نہ کوئی خدمت ضرور کرنا چاہیے ۔ اچھا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا ؟"

"لاحول ولا قوۃ ۔ ابھی بھول گئے ، میرا نام شیخ شبراتی ہے ۔"

"لیکن میاں شیخ شبراتی، تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھیں جانتا تک نہیں ۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ تمھارا نام سنا ہے ۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ، کل یہاں نیلی کوٹھی میں ضرور آئیو اور مجھ سے ملیو ۔"

"لیکن تمھارا نام کیا ہے ؟"

"میرا نام ۔ چھٹن ہے چھٹن ۔"

"ہاں چھٹن ۔"

"تو اچھا خدا حافظ میں تمھارا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن تم نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر جان بچائی ہے میری ۔ اچھا خدا حافظ کل ضرور ملیو ۔ میرا نام چھٹن ہے ۔ خدا حافظ،خدا حافظ ۔ یہ کہہ کر نواب چھٹن تو نیلی کوٹھی میں گھس گئے اور ہمارا شیخ شبراتی اپنے گھر کی طرف چل پڑا ۔ یہاں سے اس کا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا ۔ ایک تو اندھیری رات ، دوسرے سارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے ۔ بچارہ بڑی مشکل سے گرتا پڑتا گھر پنہچا اور سارا راستہ یہی سوچتا گیا خوب آدمی ہے یہ چھٹن بھی ۔ کوئی سائیس یا

خانساماں معلوم ہوتا ہے اور کیا عجیب ہے کہ کسی بڑے آدمی کا داروغہ ہو ۔

نواب چھٹن بڑے عالی خاندان رئیس تھے لیکن کچھ ان کے باپ کی فضول خرچی اور کچھ ان کے اللے تللوں کی بدولت وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی ۔ نیلی کوٹھی کے ارد گرد ہزاروں ایکڑ زمین تھی جس میں سے بہت سی بک گئی تھی اور جو باقی رہ گئی تھی وہ بھی نواب کے ہاتھوں نکلتی چلی جا رہی تھی لیکن یہ نیلی کوٹھی کا ٹھاٹ باٹ ابھی تک وہی تھا ۔ اس لیے شیخ شبراتی نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تو بہت چکرایا ۔ الٰہی میں کہاں آ گیا ہوں ؟ ایک خدمت گار نے بڑھ کر روکا ۔ تمھیں یہاں کیا کام ہے ؟ خدمتگار نے کچھ ایسے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ بچارہ شیخ بد حواس ہو گیا اور کہنے لگا ”حضور مجھے یہاں چھٹن سے ملنا ہے ۔“

خدمتگار بولا ”میاں چھٹن تو یہاں نہیں رہتے یہ نواب چھٹن کی کوٹھی ہے ۔“

”یوں ہی سہی ۔“

”کیا کام ہے تمھیں ؟“

”یوں ہی ان سے ذرا ملنے چلا آیا تھا ۔“

”ملنے چلے آئے تھے آپ لیکن ــــــ

”میں خود تھوڑے ہی آیا ہوں ، انھوں نے بلایا تھا ۔“

خدا جانے خدمتگار کیا کہتا اور شیخ شبراتی پر کیا گزرتی کہ حسن اتفاق سے خود نواب چھٹن کسی کام کو برآمدے میں چلے آئے ۔ شبراتی نے انھیں دیکھتے ہی غل مچایا چھٹن ۔“

"نواب چھٹن چونک پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شبراتی کو تکنے لگا۔ شبراتی بولا "کہو اچھے تو ہو۔ میں ذرا یوں ہی ملنے چلا آیا تھا۔"

"نواب چھٹن لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "کیا تم سے میری جان پہچان ہے؟"

"بس بھول گئے؟"

"نہیں تو — تمھارا چہرہ کچھ چشم آشنا معلوم ہوتا ہے دھیان نہیں آتا تمھیں کہاں دیکھا ہے؟"

"وہ نہر کی بات یاد ہے؟"

ہاں یاد آیا "آؤ اندر چلو۔"

"نہر کا نام سن کر خدمتگار بہت گھبرایا کہ خدا جانے کیا قصہ ہے۔ دم بھر میں یہ خبر سارے نوکروں میں مشہور ہو گئی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

نواب چھٹن شیخ شبراتی کو دیوان خانے میں بٹھا کے کہنے لگے" اب مجھے یاد آیا رات کو میں نہر میں غوطے کھا رہا تھا کہ تم نے میری جان بچائی۔"

"اماں اسے بھول بھی جاؤ۔"

کیسے بھولوں بھائی تمھارا بڑا احسان ہے مجھ پر، اب کہو تمھاری کیا خدمت کروں؟"

"کچھ بھی نہیں میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ گرمیوں میں شربت بیچتا ہوں، جاڑے میں نان کباب۔ ایک مرغی خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ انڈوں اور مرغیوں سے بھی خاصا منافع ہو جاتا ہے۔

اور کیا چاہیے ہم تم دوست ٹھہرے اب دوست سے کوئی کیا مانگے ؟
”ہم تم دوست تو ہیں لیکن پھر بھی مجھے تمھارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے ۔“

”تمھیں ایسا ہی اصرار ہے تو اپنے ہی ہاں کے سنگتروں کی ایک ٹوکری بھجوا دو اور بجھوانا کیا ہے میں خود ہی لیے جاتا ہوں ۔“

غرض شیخ شبراتی نے باغ میں پہنچ کر اچھے اچھے سنگترے چھانٹے اور انھیں لے کر گھر کا رخ کیا لیکن اتفاق یہ کہ نواب سے اس کی جو باتیں ہوئی تھیں وہ باورچی کے چھوکرے نے سن پائیں ۔ اس نے اپنے باپ کو سارا قصہ سنایا ۔ اس نے بوا لطیفن سے کہا اور بوا لطیفن نے نواب چھٹن کی خالہ خورشید لقا بیگم کو جا سنایا ۔ یہ بیگم بڑی سلیقے والی اور دانشمند خاتون تھی ۔ نواب کی جاگیر کا سارا انتظام اسی کے ہاتھوں میں تھا ۔ اس نے سنا تو نواب کو بلا بھیجا اور کہا چھٹن ! میں یہ کیا سنتی ہوں ؟ تم نے کس موئے خدائی خوار کو سر چڑھا رکھا ہے ؟“

”نواب چھٹن کچھ دیر تو سر نیہوڑائے کھڑے رہے ۔ پھر بولے ”میں کیا کروں ؟ اس کمبخت کا مجھ پر بڑا احسان ہے ۔ میری جان بچائی ہے اس نے ۔“

”خورشید لقا بیگم تنک کر بولیں ”جان بچائی ہے تو کچھ دے دلا کر رخصت کرو ۔ ایسے لچے شہدوں سے یوں ربط ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں ۔“

نواب چھٹن نے کچھ جواب نہ دیا اور دیوان خانے میں آ گئے ۔ دوسرے دن نواب چھٹن کے ہاں ایک پر تکلف ضیافت کا انتظام

تھا شہر بھر کے رئیس اور اعلیٰ عہدیدار مدعو تھے ۔ کچھ مہمان آ چکے تھے کچھ آ رہے تھے کہ نواب چھٹن اپنے دوست افتخار علی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے باغ کی طرف آ نکلے ۔ اتنے میں کسی نے پکارا ۔ ''چھٹن'' ۔ نواب صاحب گھبرا گئے ، نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے نظر آئے ۔ ان میں سے ایک نے صرف غرق باندھ رکھی تھی ۔ دوسرا صرف کرتہ پہنے ہوے تھا ۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹوکری بھی تھی ۔ انہیں دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا تم میں سے نواب چھٹن کس کا نام ہے ؟''

''نواب نے آگے بڑھ کر کہا میں ہوں ۔''

لڑکا بولا : ''اچھا تم ہو وہ نواب جسے میرے ابا نے نہر سے نکالا تھا ۔ ہم دونوں بھائی تمھیں دیکھنے آئے ہیں ۔ ابا نے سنگتروں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے اور یہ ٹوکری واپس بھیجی ہے ۔''

''سر افتخار علی کہنے لگے یہ عجیب واقعہ ہے ۔''

نواب چھٹن بولے ''ہاں بھائی بات یہ ہے میں پرسوں رات نہر میں گر پڑا تھا ۔''

''لڑکا بیچ میں بول اٹھا ''اور تم نے پی رکھی تھی ۔''

ان دنوں خورشید لقا بیگم کو نواب چھٹن کے بیاہ کی بہت فکر تھی ۔ بہتیرے پیغام آئے لیکن نواب چھٹن نے کوئی رشتہ پسند نہ کیا ۔ دراصل وہ مسٹر لطیف احمد بیرسٹر کی صاحبزادی زہراء لطیف سے بیاہ رچانے کی فکر میں تھے ۔ لڑکی ایک تو بڑی حسین دوسرے اس نے بڑھنے لکھنے میں مردوں کے کان کاٹے تھے ۔ نواب کی خالہ کو اس رشتہ پر اگر کوئی اعتراض تھا تو صرف یہ کہ زہراء لطیف پردہ نہیں کرتی تھی لیکن نواب صاحب نے منت

خوشامد کر کے خالہ کو رضامند کر لیا ۔ ایک شام کا ذکر ہے ۔ نواب چھٹن زہراء کو سنیما دکھانے لے گئے ۔ پل کے قریب ان کی موٹر کوئی لمحہ بھر کے لیے رکی تھی کہ آواز آئی ذرا ٹھہرے رہیے ۔ نواب چھٹن نے دیکھا کہ شیخ شبراتی سر پر انڈوں کی ٹوکری اٹھائے بغل میں مرغیاں داب چلے آ رہے تھے ۔ کمبخت آتے ہی موٹر کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور کہنے لگا "یار تمھیں تکلیف تو ہوگی لیکن چمن بھٹیارے کے ہاں یہ مرغیاں اور انڈے پہنچانا ہیں ۔ مجھے اگلے نکڑ پر اتار دیجیے اور دوست یہ نیک بخت کون ہیں ؟ آداب عرض کرتا ہوں مزاج اچھے ہیں آپ کے ؟"

نواب پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا لیکن بچارہ کہے تو کیا کہے اتنے میں اگلا نکڑ آیا اور شیخ شبراتی آداب عرض کر کے رخصت ہوا ۔ ادھر راستہ بھر زہرہ لطیف نے نواب سے بات نہیں کی ۔ نواب نے بہتیرا کہا "بات یہ ہے لیکن بے سود سنیما میں بھی بات یہ ہے" وقت بڑی بے لطفی سے کٹا ۔"

دوسرے دن زہراء نے لکھ بھیجا کہ میں آپ سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی ۔ بیگم خورشید لقا کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑیں اور نواب چھٹن سے کہنے لگیں "تم نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ۔ میں اب اس کمبخت سے پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر کرتی ہوں ۔"

یہ کہ کر داروغہ کو بلوایا اور اس نے شیخ شبراتی کے نام اس مضمون کا خط لکھوایا کہ تم نے نواب چھٹن کی جان بچائی ہے اس لیے ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم تمھاری نذر کی جاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ نیلی کوٹھی میں قدم نہ رکھو کیونکہ نواب چھٹن تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے ۔ خط کے ساتھ ڈیڑھ ہزار روپے کا

چیک تھا ۔"

دوسرے دن نواب چھٹن چھنا مل ہزار کی دکان سے کچھ خرید رہے تھے کہ شیخ شبراتی نے آ لیا اور کہنے لگا ۔

"میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ سامنے چائے کی دکان ہے ، وہاں پانچ منٹ کے لیے چل بیٹھیو ۔"

نواب نے کہا : "لیکن بات یہ ہے کہ ـــــ ۔"

"شیخ شبراتی نے بات کاٹ کر کہا "تو اچھا یہیں کر لیتا ہوں ۔ آج مجھے ایک خط ملا ہے ۔ تمھاری اس بڑھیا خالہ نے لکھوایا ہوگا ۔"

نواب کی زبان سے صرف اتنا نکلا : "دیکھو دیکھو ۔"

شبراتی نے جواب دیا "دیکھو کیا اس نے مجھے ڈیڑھ ہزار روپے کا چیک بھیجا ہے ۔ میں روپے کا بھوکا تو نہیں مگر اس خیال سے قبول کر لیا کہ تمھاری دل شکنی نہ ہو ہاں تو خط میں لکھا ہے کہ نواب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا ۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا حرکت ہے میں نے تم سے کیا برائی کی ہے ؟"

نواب نے کہا : "قسم ہے قسم جناب امیر[ؑ] کی . . . ۔"

شیخ شبراتی گرج کر بولا "یہی ہے میرے احسان کا بدلہ ۔ اگر میں اس رات جان پر کھیل کر تمھیں نہر سے نہ نکالتا تو آج تم کہاں ہوتے ۔ ارے مجھ جیسے دوست سے تمہارا یہ سلوک ہے ۔ مجھ ایسے دوست سے ، جس نے تمھاری جان بچائی ۔ میں تو تمھیں دوست سمجھتا تھا ، جگری دوست ۔"

اتنے میں لوگ جمع ہو گئے ۔ نواب فضیحتے کے ڈر سے بولا :

"بھائی مجھے تو خبر بھی نہیں ۔ خالہ اماں نے مجھ سے پوچھے

بغیر تمھیں خط لکھوا دیا ۔"

یہ سن کر شیخ شبراتی کا غصہ دھیما ہوا اور کہنے لگا "یہ تو مجھے بھی شبہہ ہوا تھا ۔ خیر اس قصے کو جانے دو ، آؤ چل کے چائے پئیں ۔"

جمن بھٹیارا آج تک ہر گاہک سے کہتا ہے کہ میرے ہاں نواب چھٹن اکثر چائے پینے آتے رہے ہیں ۔

نواب آٹھ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے ۔ خورشید لقا بیگم بھی آٹوانٹی کھوانٹی لیے پڑی ہیں ۔ نویں دن نواب ٹہلتے ٹہلتے پھاٹک تک آئے کہ سامنے سے آواز آئی "نواب صاحب ۔" سڑک کے اس پار ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے سامنے شیخ شبراتی کے دونوں صاحبزادے کھڑے تھے ۔ اتنے میں شبراتی کا چہرہ دکھائی دیا ۔ اس نے دونوں لڑکوں کو ایک ایک چانٹا رسید کیا اور نواب کے قریب پہنچ کر کہنے لگا "یہ مکان مدت سے بکاؤ تھا تم نے جو ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیجا تو میں نے سوچا کہ مکان ہی کیوں نہ خرید لوں ؟"

اب تمھارے پڑوسی ہیں ہم ۔ آؤ نواب تمھیں مکان دکھاؤں ۔"

نواب نے سر کجھایا "پھر کبھی سہی ۔"

رات کو نواب چھٹن خورشید لقا بیگم سے کہنے لگے : "خالہ اماں آپ نے شیخ شبراتی سے خوب پیچھا ۔ چھڑایا اس ڈیڑھ ہزار روپے سے شیخ صاحب نے ہمارے پڑوس میں ایک مکان خرید لیا ہے ۔ اب وہ رات دن میرے سر پر مسلّط رہیں گے ۔"

۲۳ جون ۱۹۲۷ء کی رات کو نہر کے پاس ایک ٹوپی پڑی پائی گئی ۔ تھوڑی دیر میں پولیس والے نیلی کوٹھی کے نواب کو نہر سے کھینچ کنارے لے آئے ۔ نواب میں صرف ایک رمق

جان باقی رہ گئی تھی ۔

اب نہر کے کنارے کوئی کیلے کا چھلکا بھی باقی نہیں تھا ۔

سوالات

۱ ۔ کیلے کھا کر چھلکے ادھر اُدھر پھینکنا کیسی عادت ہے ؟
کیا ایسا کرنے والے کو انسان کہا جا سکتا ہے ؟
۲ ۔ چھٹن کیوں ڈوبنے لگا تھا ؟
۳ ۔ خورشید لقا بیگم کون تھیں ؟ انھیں چھٹن اور شبراتی کی باہمی ملاقات پر اعتراض کیوں تھا ؟
۴ ۔ اس کہانی کے آخر میں نواب چھٹن دوبارہ نہر میں گر پڑے ؟
اس کا سبب کیا تھا ؟
۵ ۔ فعل امر سے کیا مراد ہے ؟ اس کہانی میں اس قسم کے افعال کی نشان دہی کیجیے ۔
۶ ۔ ”مجھے نہ مارو بھئی ! ہاتھ پاؤں مارو“ ۔
اس جملے میں ’مارو‘ کو مختلف معنوں میں برتا گیا ہے ۔
دونوں میں فرق بیان کیجیے ۔
۷ ۔ نواب کچھ دیر تو سر نیہوڑائے کھڑے رہے اس جملے میں ’سر نیہوڑائے‘ نواب کی حالت کو ظاہر کرتا ہے ۔ اسے قواعد کی زبان میں اسم حالیہ کہتے ہیں ۔ اسم حالیہ کی چند ایک مثالیں اس کہانی سے تلاش کیجیے ۔

—— : ० : ——

پطرس بخاری

(۱۸۹۸ - ۱۹۵۸ء)

پطرس بخاری، کا پورا نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ ادب کی دنیا میں احمد شاہ بخاری کے بجائے پطرس بخاری کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ایک مدت تک گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ کافی مدت تک آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر کام کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اقوامِ متحدہ سے وابستہ رہے۔ پہلے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے رہے اور پھر اسسٹنٹ سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ نیویارک میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

پطرس کا شمار اردو کے اعلیٰ درجے کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ الفاظ اور واقعات دونوں کے ذریعہ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے، وہی ان کو زندۂ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔ "مضامینِ پطرس" اردو میں اعلیٰ درجے کے مزاح کا نمونہ ہے۔

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنا پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک

ی دفعہ ملی۔

جب ہم نے انٹر پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں، محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، در اصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشو و نما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے۔ فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاسِ وضع اور حفظِ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہر حال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لیے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار اور ایمان دار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق

کرچکی تھی ۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا ۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے ۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ہی ناقص ہے ۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم ، فوٹوگرافی ، تصنیف و تالیف ، دندان سازی و عینک سازی ، ایجنٹوں کا کام غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشیں پیشے سیکھے جاسکتے ہیں اور تھوڑی مدت میں انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے ۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا ۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں ۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا ۔ اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی ۔

اس کے بعد پھر ہمارے والد ، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے ۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی لیکن جب ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں ۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی ، بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا ۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا ، بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا ۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور

اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں ۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک تا کہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے ۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی اسی تک محدود نہ رہی اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا ۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے ۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا ۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو لڑکے باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں ، اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزاروں روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر لیتے ہیں ۔ چنانچہ گھر والوں نے طے کیا کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے ۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں ۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر ۔ وہ ٹھیک مگر یہ ناممکن ۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنایا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل

کی زد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ بے حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیلِ علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا، وہ بیٹھ گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قوٰی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہوجائے گا چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات "اندر سبھا" سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو جیسے تیرنا نہ آتا ہو، وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک ارامش، ایک فراخی ایک وارفتگی ہونی چاہیے تھی وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت کھولا جا سکتا ہے، کون سا ملازم موافق ہے، کون سا نمک حلال ہے جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشو و نما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طَلَبہ کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا اور ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے بے حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور

ہیبت ناک پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری
اور بچارے نے [illegible] صرف کا واقعہ بیان کیا! بس صاحب اس پر ایک دن شام کے وقت بچارا
ہاسٹل [illegible] واپس آ رہا تھا [illegible] دو تحقیقات
[illegible] صرف دو منٹ! اس لیے صاحب کا جیب خرچ بند کر دیا۔
فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات
کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔
لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے
مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن
موقع پا کر بچارے [illegible]
[illegible] ایک رونے
[illegible] ایک دفعہ میں چار آنے [illegible]
[illegible]
[illegible] متاثر نہ ہوتے۔ ان کے
روپے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک اور دو روپے کے بجائے
آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

ناکام کوششوں میں تعطیلات گذر گئیں اور ہم نے پھر
ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی [illegible] چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم
نے ایک اور نیا ڈھنگ اختیار کیا اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد
ہمارے خیالات میں [illegible] پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت
میں جو دلائل ہم نے پیش کیے تھے، وہ اب ہمیں نہایت بور
معلوم ہونے لگے تھے۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر

دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو، اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطہ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبہ کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اور جانتا ہے کہ والدین اغراض کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا موجب محض الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر چلا آتا ہے

بناداں آں چناں روزی رساند[۱]
کہ دانا اندراں حیران ماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک ان دو مضمونوں یعنی شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا: ”آخر شخصیت سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض معروض کا موقع دیں۔ خدا نے ... میں نے کہا ”دیکھیے نا، وہ مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب دیکھیے تو اس کا دماغ ...

۱۔ وہ نادان کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے کہ دانا اس بارے میں حیران ہو جاتا ہے۔

کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو بہت ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے اور نہ دماغ سے ہوتا ہے۔ کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو۔ اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو لیکن پھر بھی اس کی شخصیت۔۔۔ نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔۔۔ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔۔۔ ٹھہرے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کے بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہیے تھا۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے الفاظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن کہہ لیجیے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے۔"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا۔ "جی ہاں!"

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز، روزے کے زیادہ پابند

ہوتے ہیں ، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں ، سچ بولتے ہیں ، نیک زیادہ ہوتے ہیں ۔"

میں نے کہا "جی ہاں"

کہنے لگے "وہ کیوں ؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا ۔ اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا !

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا ۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا ۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری ، ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ۔ لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا ۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا ۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا ۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا ۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے ہیں اور ان بیرون از کالج ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے ۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں بیان کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے ۔ صفائی کا خاص طور خیال رکھا جاتا ہے ۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں ۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں ۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے ۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میری تقریروں

میں جوش بڑھتا گیا، معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد انھوں نے یک لفظی "انکار" کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی دفعہ بی اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ یہی واقعہ پھر پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ بی اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت نہ تھی۔ میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں فیل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی۔ کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لیے ہم اس میں کچھ پاس ہو ہی گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں

تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق
یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر
دے ڈالو۔ ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا
جاتا ہے۔ شاید یہ اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں
کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں نقل نویسی کی سخت
ممانعت ہے۔)

اب جب ہم بی اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ
بی اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے
فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن سب لوگوں نے یہی مشورہ
دیا کہ ہم ریاضی مت لو۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے
ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی
یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی اے میں ہمارے
مضامین انگریزی، تاریخ، اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی
کے امتحان کی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون
پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا
اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا
تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں
پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر بجائے چار کے صرف تین مضامین
پڑھنا ہوتے تو جو وقت فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا
وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے اس سے بڑا
فرق پڑ جاتا اور فرض کیا کہ اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ
کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون
کے لیے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس
ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔
یعنی کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ، توجہ نہ کرسکا۔ کمپارٹمنٹ

کے امتحان میں تو پاس ہوگیا - لیکن بی.اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا ، وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں - اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہوگیا - اب آپ ہی سوچیے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹممنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا ، وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کے بجائے - مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کرچکا ہوں -

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو ، لوگوں کے لیے بے حد حیرت کا موجب ہوا اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی - لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی اور فارسی میں پاس ہوگئے - اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہوگئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں -

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی.اے کا سرٹیفیکیٹ مل جانا چاہیے - لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں ایک وقت پاس ہونا ضروری ہے - بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو مطالعہ نہیں کرسکتیں ، کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے - ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید شاید - باقی دو مضمون ہم نے دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کردیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہوسکتے ہیں -

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہتے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہوسکا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے - یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد

کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکے، تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے۔ اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے، وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:

(۱) انگریزی فارسی تاریخ

(۲) انگریزی تاریخ

(۳) انگریزی فارسی

(۴) تاریخ فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے۔ وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا نا ممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل

(۶) انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے ہر چند کہ یہ سانحہ بے حد

جانکاہ ہوگا لیکن اس میں مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ ابھی یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے کہ اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں ... ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم ... فیل ہونے کے بعد ... انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ ... اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔ اے میں پاس ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے سے ہی تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ ... خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے ... ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ ... کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسی ... کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں پرچوں پر کیا لکھ آیا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر ... حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے ... یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن کبھی ... میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری ... میں والد صاحب کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا کیونکہ ... پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا لیکن ادھر ادھر کے لوگ "ابھی ... صاحب ... " ... بات ...

اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیش گوئی کر دی۔ دل کو تسلی دی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔

اگلے سال ایسی پیش گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی

۳۰۱

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے

اگلے سال ایسی پیش گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی

اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے [illegible]

[illegible] اور جب ماموں کے دڑبے سے نکلے تو شاید اپنا ایک دڑبا بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام مسالہ بڑی احتیاط سے جمع کیا جن میں پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر تھا ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور ہاسٹل میں [illegible]

[illegible]

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا [illegible]

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔

ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔

باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں ، پھر بھی خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے ۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبہ علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں ۔ علی الصبح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے ۔ کھانے کے کمرے میں ، کامن روم میں ، غسلخانوں میں ، برآمدوں میں ، ہر جگہ لوگ فلسفہ اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں ۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے ، وہ رات دن آپس میں شکسپئیر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں ۔ ریاضی کے طلبہ اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں ۔ فارسی کے طلبہ رباعیوں میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں ۔ تایخ کے دلدادہ تاریخ کی باتیں کرتے ہیں ۔ والد نے اجازت دے دی ۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی ، جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا ۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آ رہے ہیں ۔ جس سے ہم طلبہ کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے ۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے ارد گرد نا تجربہ کار طلبہ مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے ، لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے

آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے ۔ اطلاعاً عرض ہے ۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہوگئے ۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا ۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے ۔

سوالات

۱ ۔ اس مضمون کے دوسرے پیرے میں آپ کے خیال میں لکھنے والے نے تعریف کی ہے یا مذاق اڑایا ہے ؟ اس قسم کی تین مثالیں اسی مضمون سے اور تلاش کریں۔

۲ ۔ گھر والوں نے ہاسٹل کی مخالفت کیوں کی ؟

۳ ۔ اس مضمون میں ہاسٹل میں داخلہ لینے کے لیے طالب علم کی طرف سے کیا دلیلیں پیش کی گئی ہیں ؟

۴ ۔ جس طالب علم کا اس مضمون میں ذکر کیا گیا ، وہ کیا ہے ؟

۵ ۔ مضمون نگار نے مزاح پیدا کرنے کے لیئے اس مضمون میں کیا طریقے استعمال کیے ہیں ؟

۶ ۔ ضمیر اضافت سے کیا مراد ہے ؟ مثالیں لکھیے ۔

۷ ۔ 'نیک نیتی' کیا کلمہ ہے ؟ اس قسم کی چند مثالیں اور لکھیے ۔

۸ ۔ ماضی تمنائی کی تعریف کیجیے اور بتائیے کہ اس قسم کے فعل کا استعمال کس وقت ہوتا ہے ۔ چند ایک مثالیں تحریر کیجیے ۔

———: o :———

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی ضلع جونپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے (فارسی) کیا اور [illegible] ۱۹۰۷ء میں ضلع جونپور [illegible] کالج [illegible] اردو [illegible] علی گڑھ [illegible] آج [illegible] اکثر [illegible]

[illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible] کی سرگزشت (۸) تاریخ یورپ جدید (ترجمہ) (۹) ہم نفسان رفتہ (۱۰) دیباچہ باقیات

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے

سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ گو معنی نہ رکھنا بھی بعض کے نزدیک بڑی پر معنی بات ہے۔ ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے لیکن ان میں مجھ میں اتنا فاصلہ ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔

گو معنی نہ رکھنا بھی بعض کے نزدیک بڑی پر معنی بات ہے۔ ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے لیکن ان میں مجھ میں اتنا فاصلہ ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔

شعراء کی تقسیم بڑی مشکل ہے۔ اس کو جنس کے اعتبار سے نہیں تقسیم کر سکتے، اس لیے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے۔ جوان بوڑھے کے اعتبار سے بھی نہیں کر سکتے کیونکہ آج کل کا شاعر منہ زور ہونے کے اعتبار سے جوان، خیالات کے اعتبار سے بوڑھا اور اعمال کے اعتبار سے کچھ غیر جانبدار سا ہوتا ہے اور یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتبار کر کے آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش کروں، ایک تقسیم جثے اور حلیے کے اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کو ہر جثے اور حلیے کے شاعر ملیں گے۔ میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جن کا طول و عرض ہے، حجم نہیں اور ایسے بھی جن میں حجم ہی حجم ہے، طول و عرض کا گزر نہیں اور یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں۔ آپ بھی واقف نہ ہوں تو پھر بڑی سہولت ہوگی۔ یعنی نظریہ تو رہا اپنی جگہ، ہم، آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے۔

آئن سٹائن کے نظریے کے ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلے اور رفتار کے اعتبار سے طول و عرض کا تصوّر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے اشعار کچھ اس دھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے صحیح رقبے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں بلکہ انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں۔

اچھا آئیے، ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی ''تقطیع'' کر ڈالیں۔ یہ کوئی اندیش ناک بات نہیں، بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی۔ دنیا میں ہر شخص کھلونے کھیلتا ہے۔

کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں ۔ شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے مصور رنگ اور خط سے ، مجسمہ تراش پتھر سے ، رقاص حرکت سے ، سیاست دان قوم سے ، لیڈر جہلاء سے ، یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے ، تعلیم یافتہ بیکاری سے ، بیکاری انقلاب سے اور انقلاب زندہ باد سے ۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے ۔ الفاظ کی اہمیّت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ تعزیراتِ ہند اور نقشِ سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے ۔ قانون اور تعویذ سے کون آزاد رہ سکتا ہے ۔ تعزیراتِ ہند کی رو سے سزا ملتی ہے ۔ نقشِ سلیمانی سے محبوب ۔ بہرحال الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے ۔ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہو چکی ہے اور ہم آپ اس سے نت کیسے نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں ۔

شاعر کا سارا کھیل الفاظ سے ہے ، اس کھیل کو ہمارے شعراء نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ تلاش کر لیجیے ۔ معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے ۔ کبھی معنی کے لیے سرگرداں رہتے تھے ، بڑی ریاضت ، بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی ۔ اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں ، ان کو ادھر ادھر کرتے رہیے ۔ ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو بچ رہیں گے ، ان کو سامعین پورا کر دیں گے ۔

آج کل کے بیشتر شاعروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انھیں صرف الفاظ یاد ہیں جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں ، ترتیب دیتے رہتے ہیں ۔ بعض حالتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب بحروں اور ترکیبوں

کی چرخ پر خود بخود الفاظ آ جاتے ہیں جن کے لانے میں شاعر کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ معنی تو سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر لیتی ہے ۔ شاعر کا فرض صرف الفاظ کی ترتیب اور بندش ہی نہیں ہے اور نہ صرف وہ خیالات ہیں ، جن کی وہ الفاظ ترجمانی کرتے ہیں ۔ سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے ۔

یہاں شاعر سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے ، جس کا ایک تخلّص ہو یا جس کا ایک خاص طرح کا حلیہ یا مشتبہ قسم کی صحت ہوتی ہے بلکہ وہ شعریت ہے جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے ۔ حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل و دماغ کے تأثرات کو بھی جذبات یا تخیلات کا جزو بنا لیتا ہے ۔ ایسا نہ ہو تو پھر کسی دوا ساز یا شاعر میں کیا فرق رہ جائے جو ہمیشہ چند ادویات ملا کر عرق ، سفوف یا معجون تیار کر سکتے ہیں ۔

حالانکہ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر بالکل نہیں ، صرف دوا ساز ہوتے ہیں ۔ یہ آپ کے دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے ۔ ان کے اشعار کلیہ شعر سازی کے اتفاق یا میکانکی نتائج ہوتے ہیں ۔ اچھا اب تصور کیجیے جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اور مصرع یہ ہے ، فرض کیجیے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے جس کو تیسرے درجے کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہے ، وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر مصرع طرح پر زور لگانا شروع کر دے گا ۔ اس درمیان میں اس کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کو پیٹ بھرنے کو روزی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی میسر ہے یا نہیں ۔ نہ دن کو دن سمجھے گا ، نہ رات کو رات ۔ بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں ۔ دوست دشمن سب سے بے نیاز ، تخیّل کے زور سے

آسمان پر چڑھ جائے گا۔

شفق سے عبیر اور سپیدۂ سحر سے کافور اڑاتا، سورج رخسارِ محبوب کی سیر کرتا، ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا، زہرہ کی تان اڑاتا تاریخ سے گھبراتا قاضی فلک سے کلخپ کرتا .... اوروں پر مسکراتا، فرشتوں سے آنکھ ملاتا، حوروں کو ورغلاتا، رضوان سے لڑتا، مالک سے کتراتا، قلم سا لکھتا، لوح کو پڑھتا، طوبیٰ اور سدرہ پر جھولتا، کوثر و تسنیم میں ڈبکیاں لگاتا، جبریل کو صید زبوں بناتا، اسرافیل کو فنا کی تعلیم دیتا، یک لخت پاتال پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم! تو نے گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے۔ لالہ و گل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب و تسلیمات کرتا۔ قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹایا تھا، اسے ٹھکراتا۔ کسی سوختہ ساماں کو فلس ماہی سے شمع روشن کرنے کی ہدایت دیتا۔ ہر موج میں صد حلقۂ کام نہنگ ہیں، قطرہ کو گوہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا، عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا، ساحل کو سفینے اور سفینے کو ساحل سے اور دونوں کو سبک سارانِ ساحل سے ٹکراتا، اس دنیا میں جاتا ہے، جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے اور بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں۔

یہاں کی دقت بھی کچھ کم نہیں ہے، شعر کسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ کبھی لیلیٰ ملتی ہے تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں۔ فرہاد قابو میں آتے ہیں تو جوئے شیر غائب۔ حضرت موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے تو تجلیٔ طور کا پتہ نہیں اور نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہاتھ نہیں لگتا۔ محمود ملتے ہیں تو ایاز غیر حاضر۔ محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے۔ بہار آئی تو زنجیر نہیں۔ ہجر میں مرغِ سحر نہیں ملتا تو وصل

میں مؤذن حائل ہو جاتا ہے۔ مے خانہ تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساقیِ مہوش کی بجائے لٹھ بند والنٹیر موجود ہیں۔ عالمِ وحشت میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کی ترقی کے لیے مرغیوں اور مویشیوں کو بسا دیا گیا ہے۔ داورِ محشر سے نپٹنا چاہتے ہیں تو جمعیت اقوام معترض ہوتی ہے۔

ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے، کہیں الف بڑھ گیا ہے تو کہیں 'ی' دب گئی ہے۔ ایک طرف روزمرے کا منہ سوجا ہوا ہے تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے۔ زحاف میں تذبذب ہے تو مصرعوں میں شتر گربگی۔ کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت غرا رہی ہے۔ بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں۔

ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے تو غزل لے کر دربارِ مشاعرہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ بھلی میں اور نزلہ زکام میں مبتلا فاقہ کرتے، سردی سے اکڑتے مشاعرہ میں پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا، ایک نے مصرع اٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھایا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور اور بے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روس کی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذابِ قبر سے مشابہ تھی۔ پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختے پر جانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک وجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد

سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی اور پیدائشی ہیں ، پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمعے سے ہنگامہ بلند ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا ۔ دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں ۔ جناب صدر ، سیکریٹری ، مشاعرہ ، شعراء ، مصرع طرح ، سب کے سب شامیانہ کے نیچے گل حکمت ہو گئے ۔

یہ تو ہوا شاعر ہونا لیکن اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہونا ہے ۔ شاعر ہمیشہ مشاعرے کو برا بھلا کہتا آیا ہے لیکن مشاعرے پر جان دیتا ہے ۔ میزبان کو سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنا پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے ۔ برف پڑ رہی ہو تو اسے نمونیے کا اندیشہ نہیں ، آگ برس رہی ہو تو اسے لو لگنے کا خوف نہیں ۔ لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی ۔ میزبان کو شاعر کے عجیب و غریب معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنا پڑتی بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی پڑھنا پڑتے ہیں اس کو داد اس طور سے دینا چاہیے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سنے گئے نہ آئندہ اس کی توفیق ہوگی ۔ شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں ۔ اول تو فرمائش اس طور پر کیجیے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں دینے جا رہا ہے اور شرم و خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا ہے یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے ۔

اس کے بعد موصوف مصرعِ اول پڑھیں گے ، اسے آپ اٹھائیں یعنی دہرا دیں ۔ آپ کے بعد ممدوح اس مصرع ثانی کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول اور منہ پھاڑ لینا چاہیے ۔ دو تہائی کلماتِ تحسین ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیے اور بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے ذرا پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجیے ، اس طور پر

کوئی دو درجن شعر سنیے اور بغیر مستائے یا دم لیے چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں جائیے ۔ مجھے اس قسم کی سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں ۔

مگر بد نصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری ہے کہ میں لکھا ہوا مصرع بھی آنکھ سے دیکھ کر اکثر پہلے ہلے میں غلط پڑھ جاتا ہوں ۔ چہ جائیکہ مصرع اٹھانے کے سلسلے میں اسے سنتے ہی دہرا دوں ۔ میری اس کمزوری سے اکثر شعراء واقف ہیں اور کچھ یہ سمجھ کر مصرع اٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہوں ۔ بدنصیبی سے ایک بار میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا ۔ ان کے ہاں ایک بزرگ بیٹھے ملے ، دوست نے میری پذیرائی کچھ غیر معمولی مسرت سے کی ، میرے بیٹھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے زنان خانے میں چل دیے کہ فلاں شاعر ہیں ۔ آپ ان کا کلام سن کر بے حد مسرور ہوں گے ۔ کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب و تسلیمات و خلوص و احترام کے ایسے پینترے شروع کر دیے کہ میں کچھ نہ کر سکا اور انھوں نے اپنی بیاض کی مشین گن میری طرف کر دی ۔ پہلے تو میں ڈر کے مارے چپ رہا لیکن ان کی آنکھوں میں طیش و لجاجت کے باری باری کچھ ایسے آثار ملے کہ میں بھی داد دینے کے لیے سر بکف ہو گیا ۔ میں نے ایک ترکیب نکالی ، وہ مصرع شروع کیا اور میں نے پھر سے انھیں الفاظ کو دہرانا شروع کر دیا ۔ کئی دفعہ ان کا سٹارٹ (ابتداء) بگڑا تو ایک دفعہ الف ہی تو ہو گئے ۔ جھلا کر بولے ”حضرت ! مصرع تو ختم ہونے دیجیے ۔“ میں نے بڑی مری ہوئی آواز سے کہا ”قبلہ پورا کر لیجیے ۔ انھوں نے مصرع پڑھ کر میری طرف دیکھا تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا اس کے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی سی ترمیم کے بعد پڑھ دیا ۔ انھوں نے چیں بر جبیں ہو کر صحت کر دی ۔ ان

کو اطمینان نہ ہوا اس لیے انھوں نے پورا مصرع پڑھ دیا ۔ میں نے بھی پڑھ دیا لیکن ذرا رک رک کر جس کی وجہ سے نظم ، نثر میں تبدیل ہو گئی ۔ میرے اس اضطراری تصرّف پر انھوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا اور میزبان باہر نکل آئے ۔

یہ سب تو ہوا لیکن میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر کیا بات ہے کہ شاعر اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ ممکن ہے یہ اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی مشاعرہ ہی سمجھنے لگے ہیں ۔ وہی اناپ شناپ خیالات جن کو کبھی رقص کر کے کبھی رو کر اور کبھی چیخ کر پیش کرتے ہیں ۔ کسی کو گالی دے دی ، کبھی اپنا قصیدہ پڑھ لیا ، خود جی میں خوش ہوئے ۔ دشمنوں کو ہوشیار یا بدگمان کیا ۔ اپنوں نے داد دی اور دوسروں نے ڈنڈا سنبھالا ۔ مشاعرے کی محفل کو دنیا کی بساط سمجھ لی، وہاں سے اٹھے تو یہ سمجھا کہ سارے جہان کو زیر و زبر کر لیا ہے ۔

سوالات

۱ ۔ مضمون نگار نے شاعر کی کیا تعریف کی ؟

۲ ۔ کن شاعروں کو مضمون نگار دوا ساز کہتا ہے اور کیوں ؟

۳ ۔ 'مصرع اٹھانا' کسے کہتے ہیں ؟

۴ ۔ مشاعرے سے کیا مراد ہے ؟ کیا مضمون نگار مشاعرے کے حق میں ہے یا خلاف ؟

۵ ۔ کیا سبھی شاعر ویسے ہی ہوتے ہیں ، جیسے اس مضمون میں بیان ہوئے ہیں ۔

۶ - مندرجہ ذیل محاوروں کے معنی بتائیے اور جملوں میں استعمال کیجیے ۔

عہدہ برآ ہونا ۔ کسی پر جان دینا ۔ سرگرداں رہنا ۔ خاک اڑانا ۔

۷ - مندرجہ ذیل کلمات اور تراکیب کے معانی لکھیے اور بتائیے کہ وہ قواعد کے اعتبار سے کیا ہیں ۔

تقطیع ۔ افشاں ۔ حباب آسا ۔ ساقی مہوش ۔ شتر گربگی ۔ اناپ شناپ ۔ بساط ۔ اضطراری ۔

۸ - 'عبرت انگیز' میں انگیز لاحقہ ہے ۔ اس کے معنی اپنے استاد صاحب سے دریافت کیجیے ۔ اور اس لاحقے سے بننے والے دس اور مرکبات تحریر کیجیے ۔

———:o:———

مولانا ظفر علی خان

(۱۸۷۳—۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خان ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالے میں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ کچھ مدت تک حیدر آباد میں ملازم رہے۔ ترک ملازمت کر کے "زمیندار" اخبار نکالا جو ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔

مولانا نے تحریر اور تقریر کے ذریعے سے تمام عمر قوم کی خدمت کی۔ ان کا اخبار "زمیندار" مسلمانوں کا بے باک ترجمان تھا۔ شاعری میں فن اور زبان کے اعتبار سے بہت کم شاعر ان کی برابری کر سکتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں وقتی موضوعات پر ہیں جو "زمیندار" میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا کی مندرجہ ذیل نظم خدا تعالیٰ کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ جو نظم خدا کی تعریف میں لکھی جائے اسے حمد کہتے ہیں۔

حمد ذوالجلال

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دور جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اس کا

گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں سچا ایک نام اس کا

ہر اک ذرہ فضا کا داستان اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آ کے دیتا ہے پیام اس کا

نظام اپنا لیے پھرتا ہے کیا خورشیدِ نور افشاں
ہزاروں ایسی دنیاؤں کو شامل ہے نظام اس کا

سراپا معصیت میں ہوں ، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری ، خطا پوشی ہے کام اس کا

ہوئی ختم اس کی حجت اس زمین کے بسنے والوں پر
کہ پنہچایا ہے ان سب تک محمدؐ نے کلام اس کا

نہ جا اس کے تحمُّل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

سوالات

۱- حمد کسے کہتے ہیں ؟

۲- مندرجہٴ ذیل الفاظ کا مفہوم سادہ اور آسان لفظوں میں بیان کیجیے -

مے کش - دور جام - دوئی - نور افشان - خطا کوشی - خطا پوشی -

۳- اعراب لگائیے -

معصیت - مغفرت - تحمل - دیر گیری - گرفت

۴- اس نظم کی بنیاد اسلام کے کس اصول پر ہے ؟

۵- اس نظم کے مصرعوں کے آخر میں ہم آواز کلمات کی نشان دہی کیجیے - کیا ایسے کلمات ہر مصرعے میں ہیں ؟ انھیں کیا کہتے ہیں ؟

امیر مینائی

(۱۸۲۷—۱۹۰۰ء)

امیر احمد نام۔ امیر تخلص تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک صوفی اور عالم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۲۱ سال کی عمر میں اس زمانے کے علوم میں مہارت حاصل کی۔ عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد دربار لکھنؤ ہی سے متعلق ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد رام پور چلے آئے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

امیر مینائی نے ہر صنفِ سخن میں شاعری کی ہے۔ فن اور زبان پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ امیر کی نظم و نثر کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سے تقریباً نصف اردو زبان کے کلیات، محاورات اور دیگر تحقیقات پر مشتمل ہیں۔ یہاں امیر مینائی کی ایک مثنوی کا اقتباس دیا گیا ہے۔ یہ حمد کے اشعار ہیں۔ حمد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ غزل ہی کی طرح لکھی جائے۔ حمد مثنوی۔ مسدس یا کسی اور شکل میں بھی لکھی جا سکتی ہے۔

مثنوی

(حمد)

اسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف
ہزاروں نشاں ہے ہزاروں طرف

وہ اول کہ جس کی نہیں حد کہیں
وہ آخر کہیں جس کا آخر نہیں

زمانے میں سب کچھ ہے اِلّا شریک
وہی ہے وہی وحدہٗ لاشریک

اسیؔ ایک نے سب کو پیدا کیا
یہ سب کارخانہ ہویدا کیا

مہ و مہر سے آسماں تابناک
گلوں سے لبالب گریبان خاک

یہ نیرنگیاں لا ابالی نہیں
کوئی پردہ نغمے سے خالی نہیں

یہ سب پردۂ ساز اسرار ہیں
صدا ایک ہے سینکڑوں تار ہیں

سوا اس کے کوئی یگانہ نہیں
ہمیشہ وہی ہے زمانہ نہیں

جہاں پر تو نورِ جانانہ ہے
یہ محفل نہیں آئینہ خانہ ہے

جو مطرب نوازندۂ ساز ہے
ہر اک ساز میں اس کی آواز ہے

توافُق تخالُف میں پایا گیا
عجب ایک ساگر بہایا گیا

رہِ فہم دل بھولتا ہی نہیں
شناور کا دم پھولتا ہی نہیں

چمن ہی پہ موقوف ہے کیا فضا
کہ ہر بزم میں اک چمن ہے بپا

ہُوا زلف و رخ کا برابر ظہور
کہ بے سایہ ممکن نہ تھی قدرِ نور

زہے صنعتِ خالقِ روز و شب
جدھر دیکھیے ہے تماشہ عجب

نہالوں کو ایسا سر معرفت
کہ ہے ہر ورق دفتر معرفت

پری رُو، سمن سینہ، نازک بدن
قد راست شمشادِ غنچہ دہن

اسی کا ہے جلوہ سہا تا سمک
اسی کا ہے پرتو زمیں تا فلک

وہی مادّہ اور وہی صَلب سنگ
تماشائے قدرت ہے تبدیل رنگ

ریاحین ہوں یا کہ نخل و نہار
اسی سے ہیں رحمت کے امیدوار

کسی سر پہ تاج شہی دھر دیا
کسی سنگ کو آئینہ کر دیا

شجر، ایک گلہائے تر نو بنو
نہال ایک، اس کے ثمر نو بنو

سوالات

۱- اس نظم میں خدا تعالیٰ کی جو قدرتیں بیان کی ہیں ان کا خلاصہ لکھئے۔

۲- آپ نے اس سے پہلے ظفر علی خاں کی حمد پڑھی۔ اس میں اور امیر مینائی کی حمد میں کیا فرق ہے؟

۳- مندرجۂ ذیل کے معانی بتائیے۔
سما - سمک - شنلور - پرتو - مطرب - نوازندہ - صلب - معرفت - فہم -

۴- مندرجۂ ذیل پر اعراب لگائیے۔
راست - ہویدا - تحائف - ساگر - توافق - ریاحین -

۵- 'پری رو' کس قسم کی ترکیب ہے؟ اس قسم کی اور تراکیب جو اس نعت میں موجود ہیں ان کی نشاندہی کیجیے -

۶- اس نظم کے تمام مصرعوں کے آخری کلمات پر نگاہ ڈالیے اور ان میں سے ہم آواز کلمات کی نشان دہی کیجیے - کیا ان ہم آواز کلمات کی ترتیب ویسی ہی ہے جیسی اس سے پہلی حمد میں تھی؟ دونوں کا فرق اپنے لفظوں میں لکھیے -

۷- اس حمد میں فعل کی کون کون سی قسمیں استعمال ہوئی ہیں؟ نشان دہی کیجیے -

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کا اصلی نام محمد حفیظ ہے - ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے - والد کا نام حافظ شمس الدین تھا - ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں حاصل کی - شاعری سے فطری لگاؤ تھا اس لیے جلد ہی تعلیم ترک کرکے شاعری کے کوچے میں آ گئے - ابتداء میں مولانا گرامی سے اصلاح لی - پہلے جالندھر میں کاروبار کرتے رہے پھر لاہور آ کر رسالہ "پھول" کے مدیر رہے -

حفیظ نے گیت - غزلیں اور نظمیں یکساں کامیابی سے لکھی ہیں - غنائیت اور کیف انگیزی کے علاوہ ان کی نظموں میں مشاہدے کا عنصر بھی غالب حیثیت رکھتا ہے - وہ پاکستان کے قومی ترانے کے خالق ہیں - نظم میں ان کی تصانیف شاہ نامۂ اسلام - نغمہ زار - سوز و ساز اور اور تلخابۂ شیریں خاص طور پر مشہور ہیں -

نعت

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی

ترے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی

سلام اے صاحب خلقِ عظیم، انسان کوسکھلا دے
یہی اعمالِ پاکیزہ یہی اشغالِ روحانی

تری صورت ، تری سیرت ، ترا نقشا ، ترا جلوہ
تبسم ، گفتگو ، بندہ نوازی ، خندہ پیشانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی

زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی

حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

ترا در ہو مرا سر ہو مرا دل ہو ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام ، اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام ، اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

سوالات

۱- حمد اور نعت میں کیا فرق ہے؟
۲- مندرجۂ ذیل کلمات پر حرکات لگائیے -
نوع - ربانی - معمور - مروت - طولانی - فضل
۳- مندرجۂ ذیل کے معانی لکھیے -
خلق عظیم - اعمال پاکیزہ - اشغال - بندہ نوازی - خندہ پیشانی -
شیرازہ بندی - بے نوا -
۴- اس نعت کے پانچویں شعر مین شاعر کا اشارہ کن باتوں کی جانب ہے؟
۵- اس نعت کے 'آخری شعر' میں 'آتشیں زنجیر باطل' میں 'آتشیں' کا کلمہ کس جانب اشارہ کرتا ہے؟

احسان دانش

احسان الحق نام ہے والد کے نام (دانش علی) کی نسبت سے احسان دانش کا قلمی نام اختیار کیا ۔ احسان دانش ۱۹۱۴ء میں کاندھلے (بھارت) میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی مگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے ۔ بچپن ہی سے محنت مزدوری کی زندگی بسر کرنا پڑی ۔ جوانی ہی میں لاہور چلے آئے ۔ یہاں بھی محنت مزدوری اور چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے رہے ۔ آخر کتابوں کی ذاتی دکان "مکتبۂ دانش" کے نام سے کھولی ۔ اب یہ دکان بھی بند ہو چکی ہے ۔

احسان صاحب نے خود بھی مزدوری کی ہے اور مزدوروں اور کسانوں کی بد حالی کے متعلق بڑی مؤثر اور درد انگیز نظمیں لکھی ہیں اس لیے انہیں "شاعر مزدور" بھی کہا جاتا ہے ان کی شاعری میں باغیانہ اور رومانی دونوں طرح کے رجحانات ملتے ہیں ۔ انھیں نظم اور غزل دونوں پر پوری قدرت حاصل ہے ۔ احسان صاحب کے کلام میں روایت کا رچا ہوا شعور اور فنی پختگی پائی جاتی ہے ۔ لیکن ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری بدلتے ہوئے حالات اور نئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے ۔

علم اٹھائے چلو

امید فتح رکھو اور علَم اٹھائے رکھو
عمل کے ساتھ مقدر کو آزمائے چلو

مسافروں میں مسافت کا ذکر کیا معنی
فضا پکار رہی ہے قدم بڑھائے چلو
بجا! بجا! کہ اندھیرا ہے شاہراہوں میں
چراغِ فکر جہاں تک جلے جلائے چلو
یہ دور آگ نہیں روشنی ہے منزل کی
قدم ملا کے بڑھو اور علم اٹھائے چلو
سفینہ غرق ہو یا کوئی گھاٹ پر اترے
تمہارا فرض یہ ہے روشنی دکھائے چلو
جو برق رو ہیں انہیں دو اصولِ ہمسفری
جو تیزگام نہیں ان کا دل بڑھائے چلو
نہیں ہے شاخ تراشی ہی شاملِ دانش
روش روش پہ نئے پھول بھی کھلائے چلو۔

سوالات

۱۔ شاعر نے اس ترانے میں جن فرائض کا تذکرہ کیا وہ کیا ہیں ؟
۲۔ زندگی میں ایسے حالات بھی پیدا ہوتے ہیں جو ہمت شکن ہوتے ہیں شاعر نے ان کا کیا علاج تجویز کیا ہے ؟
۳۔ مندرجۂ ذیل الفاظ کے جمع بنائیے ۔
عمل ۔ قدم ۔ منزل ۔ فرض ۔
۴۔ مندرجۂ ذیل تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے ۔
چراغِ فکر ۔ گھاٹ پر اترنا ۔ اصولِ ہمسفری ۔ تیز گام ۔ شاخ تراشی ۔
۵۔ 'چراغِ فکر' کیسی ترکیب ہے ؟ 'برق رَو' کس اعتبار سے اس ترکیب سے مختلف ہے ؟

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ — ۱۸۳۰ء)

ولی محمد نظیر اکبرآبادی آگرے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم اس وقت کے مشہور اساتذہ سے حاصل کی۔ فن کتابت میں بھی مہارت حاصل کی۔ نہایت سادہ اور قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے معلم تھے اور آگرے کی ایک مسجد میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ انکی قناعت پسندی نے انھیں کسی دربار سے وابستہ نہ ہونے دیا۔ وہ بڑے انسان دوست آدمی تھے اور تہواروں اور میلوں وغیرہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

نظیر زبان اور موضوعات کے اعتبار سے یقیناً عوامی شاعر ہیں ان کا مشاہدہ وسیع ہے اور وہ عوام کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ اُردو شاعروں میں انھیں منفرد مقام حاصل ہے۔

اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

دنیا عجب بازار ہے، کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے، بد دے بدی کی بات لے
میوے کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی ، سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے ، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اُس کو میاں ، دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر ، تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے

کرچک جو کچھ کرنا ہے اب ، یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے ، احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے ، طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے ، شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے ، مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہوئے گا ، اس بات پر بھی دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر ، پانی پئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر ، اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں ، یاں صاحب ادراک ہے
دل شاد رکھ دل شاد رہ ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں ، یاں پاک رہ بے باک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر سے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کہ اپنے کشف و کرامت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قرآن یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو اِن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی
چِلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے یاں نظیر
اور سب سے جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

پیٹ کے لیے

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لیے
سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لیے
سیکھا ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لیے
پھرتا ہے کوئی بے سر و پا پیٹ کے لیے
جو ہے سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لیے

عاجز ہیں اس کے واسطے کیا شاہ کیا وزیر
محتاج ہیں اسی کے لیے بخشی و امیر
منشی ، وکیل ، ایلچی ، متصدی و مشیر
چاکر ، نفر ، غلام ، تونگر ، غنی ، فقیر
سب کر رہے ہیں فکر سدا پیٹ کے لیے

بیٹھے ہیں مسجدوں میں مصلے بچھا بچھا
جبے پہن کے ہاتھ میں تسبیح کو پھرا
واعظ کے ہر سخن میں ہے کھانے کا مدعا
عابد بھی دعوتوں کی عبادت ہے کر رہا
زاہد بھی مانگتا ہے دعا پیٹ کے لیے

فاضل کے فضل میں بھی اسی کی ہے التجا
عابد ، نجومی کا بھی اسی پر ہے مدعا
ملا بھی دن گزارے ہے لڑکے پڑھا پڑھا
شاعر بھی دیکھیئے تو قصیدے بنا بنا
کیا کیا کرے ہے وصف و ثنا پیٹ کے لیے

الفت کسی کے دل میں کسی میں پڑا ہے بَیر
مانے کوئی حرم کو کوئی پوجتا ہے دَیر
کھانے کی ساری دوستی کھانے کی ساری سیر
کہتا ہے اب فقیر بھی دے کر دعائے خیر
بابا کچھ آج مجھ کو دلا پیٹ کے لیے

جس کا شکم بھرا ہے وہ ہنستا ہے مثل پھول
خالی ہے جس کا پیٹ وہ روتا ہے ہو جلول
جبتک نہ اس گڑھے میں پڑے آ کے خاک دھول
سوجھے دھرم نہ دین نہ اللہ نے رسولؐ
جو جو کوئی کرے سو بجا پیٹ کے لیے

زردار ، مال دار ، گدا ، شاہ ، کیا وزیر
سردار کیا غریب تونگر ہو یا فقیر
ہر دم سبھوں کو دیکھا اسی حال میں اسیر
اپنی یہی دعا ہے شب و روز اے نظیر
دے شرم و آبرو سے خدا پیٹ کے لیے

سوالات

۱- نظم ''اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کا خلاصہ تحریر کیجیے -
۲- اس نظم میں نظیر اکبرآبادی کن باتوں کی نصیحت کرتے ہیں ؟
۳- نظم ''آدمی نامہ'' کا مرکزی خیال کیا ہے ؟
۴- نظم ''پیٹ کے لیے'' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے -
۵- شاعر اس نظم میں معاشرے کے کن کن لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے ؟
۶- نظیر اکبرآبادی کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے ؟
۷- ''غمناک'' میں ''ناک'' لاحقہ ہے ایسے چند الفاظ تحریر کیجیے جن میں یہی لاحقہ استعمال ہوا ہو -
۸- ''حرم'' ظرف مکاں ہے - ان نظموں میں ایسے ہی کچھ اور الفاظ تلاش کیجیے جو ظرف مکاں ہو -
۹- 'آدمی نامہ' اور 'پیٹ کے لیے' کے مصرعوں کے آخر میں ہم آواز الفاظ کی ترتیب کس انداز کی ہے ؟ کیا ان سے پہلی نظم میں یہی ترتیب رکھی گئی ہے ؟ اپنے استاد صاحب سے اس قسم کی ترتیب والے مصرعوں کے گروہوں کے نام پوچھیے -

میر انیس

(۱۸۰۱-۱۸۷۴ء)

میر ببر علی نام ۔ انیس تخلص میر خلیق کے بیٹے تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے وہیں رہ کر تعلیم حاصل کی اور سپہگری کا فن سیکھا ۔ پہلوانی کا بھی شوق تھا ۔ بانک بٹے اور لکڑی کا فن بھی سیکھ رکھا تھا ۔

جوانی میں لکھنو آئے اور اسی شہر کے ہو رہے ۔ ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ لکھنو سے نکلے اور عظیم آباد ۔ بنارس ۔ الہ آباد اور حیدر آباد کے سفر کئے اور مجلسیں پڑھ کر ان شہروں میں بڑا نام پایا ۔

شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی ۔ مگر باپ کی ہدایت پر غزل کو چھوڑ کر مرثیے کی طرف آ گئے اور ایسے آئے کہ وہ مرثیے کے سب سے بڑے شاعر بن گئے ۔ مرثیے کے ساتھ سلام اور رباعی میں بھی نام پیدا کیا ۔ انیس کی زبان بے عیب ہے ۔ بیان بہت شائستہ اور پاکیزہ ہے ۔ منظر نگاری میں کمال رکھتے ہیں ۔ انسانی فطرت اور انسانی تعلقات کے تانے بانے کو اس کی تمام نزاکتوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

(۱)

علم کے ننھے مدعی

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار آدھر ہوا علم سید انامؑ
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
روتی تھی تھامے چوب علم خواہر امامؑ
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینبؑ کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہ اُممؑ
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھنے لگے ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصہ ہے علیؑ ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا عَلم نانا جان کا

زینبؑ نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام؟
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علیؑ اکبر کو چھوڑ کے

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے ہی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہمسنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشاؑ کا لال
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ کیوں کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
میں لٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امامؑ کے
معلوم ہوگیا مجھے طالب ہو نام کے

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
غصے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امامؑ
واللہ کیا مجال جو اب لیں علم کا نام
کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ با وفا غلام
فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

بس کہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر
ٹھیرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بری لگی
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

(۲)

حضرت عباسؑ میدان جنگ میں

حملہ دلیر کا غضبِ کردگار تھا
گر سامنے تھا شیر تو وہ بھی شکار تھا
تلوار کوندتی تھی فرس بے قرار تھا
مقتل میں گرم معرکۂ کار زار تھا
بہتا تھا خوں بدن سے تو منہ زرد ہوتے تھے
تلوار کی ہوا سے بدن سرد ہوتے تھے

وہ تیغِ جاں گداز جدھر چل کے رہ گئی
گردن عدو کی ، شمع صفت ڈھل کے رہ گئی
یہ غول بھن گیا تو وہ صف جل کے رہ گئی
بھاگا کوئی تو ہاتھ اجل مل کے رہ گئی
کہتی تھی تیغ مجھ سے کہاں بچ کے جائے گا
ٹھنڈا کروں گی میں تو جہنم جلائے گا

ہوش و حواسِ شمر سیہ رو اڑا دیے
دو دو کے ایک ہاتھ میں بازو اڑا دیے
راکب کے پاؤں گھوڑے کے زانو اڑا دیے
ڈالی کسی نے آنکھ تو ابروٗ اڑا دیے
تھا نور چشم شیر الٰہی جلال میں
پتلی چھپی ہوئی تھی سیاہی کی ڈھال میں

بجلی تھی جس پرے کی طرف آ کے پھر گئی
ناگن تھی اک کہ فوج پہ لہرا کے پھر گئی
دم میں لہو زمین پہ برسا کے پھر گئی
اللہ رے منہ صفیں کی صفیں کھا کے پھر گئی
کاٹے جگر تو اور دلیری ہوئی اسے
سیروں لہو پیا پہ نہ سیری ہوئی اسے

غصہ تھا یہ کہ کانپتے تھے بزدلوں کے دل
سینے میں ہو گئے تھے لہو قافلوں کے دل
لوہے کو اس کے مان گئے جاہلوں کے دل
کیا چال تھی کہ لوٹتے تھے بسملوں کے دل
تھی ماہ نو، پہ پھرتی تھی بجلی بنی ہوئی
چمکی تو زخمیوں کے لیے چاندنی ہوئی

لرزاں ہر ایک بانیِ بیداد وجور تھا
لشکر تھا بے حواس تباہی کا طور تھا
رخ زرد تھے سپاہ کے، کچھ رنگ اور تھا
نیزوں کا تھا نہ اوج نہ ڈھالوں کا دور تھا
کشتوں کے پشتے اور سروں کے پہاڑ تھے
فوجیں کٹی ہوئی تھیں محلے اجاڑ تھے

گر اس طرف بڑھا کسی بیداد گر کا ہاتھ
بالائے تن رہا نہ ادھر بے اُدھر کا ہاتھ
رکتا نہ تھا علیؑ ولی کے پسر کا ہاتھ
دو ہو کے گر پڑا جسے مارا کمر کا ہاتھ

ہنستی تھی موت آنکھ جو پڑتی تھی زین پر
آدھا فرس پہ جسم تھا آدھا زمین پر

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ
سینہ کمر کے ساتھ کٹا دل جگر کے ساتھ
ہل چل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ
اور معرکے میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ

بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کر
روحیں روانہ ہوگئیں قالب کو چھوڑ کر

گرتی تھی برق تیغ جو ہر پل ادھر اُدھر
سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل ادھر اُدھر
شیدیر تھا کہ پھر رہی تھی کل ادھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہل چل ادھر اُدھر

ہر جا تنوں کے ڈھیر، سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں؟ گریز کے کوچے تو بند تھے

سرہنگ شام، ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے
جو بچ گئے ادھر سے اُدھر جا کے مر گئے
کتنے جواں، سموں کے تلے آ کے مر گئے
پس پس کے سرمہ ہوگئے، ٹکرا کے مر گئے

ہل چل نے استخوانِ بدن چور کر دیے
بیٹوں نے پاؤں باپ کی چھاتی پہ دھر دیے

بھڑکا دی آگ صاعقۂ شعلہ ریز نے
چن کر صفوں کو صاف کیا تیغ تیز نے
کچلا انھیں، سمند کی ہر جست و خیز نے
گیتی الٹ دی ابن علیؑ کی ستیز نے
ترکش نہ تھے درست نہ ثابت کماں تھی
تیغوں میں دم رہے تھے نہ لشکر میں جان تھی

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ کانپتی تھی وادیِ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمین بھی زرد
خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

تھا الاماں کا شور، پریشاں تھے اہل شر
تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر
پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس، ہر اس سے تھی ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

مصروف تھے جہاد میں عباسؑ باوفا
ناگاہ آئی خیمے کی ڈیوڑھی سے یہ صدا
اب کیا سکینہؑ پیاسی ہی مر جائے اے چچا
کب تک لڑو گے فوج سے بس ہو چکی وغا
سوکھے ہوئے لبوں پہ مری جان آئی ہے
اے نور چشم ساقیٔ کوثرؑ دہائی ہے

سوالات

۱ - مرثیے کی تعریف بیان کیجئے -

۲ - کیا آپ نے انیس کے علاوہ کسی اور شاعر کے مرثیے سنے ہیں ؟
اگر سنے ہیں تو ان کے نام بتائیے ؟

۳- پہلے مرثیے میں علم کے مدعی کون ہیں ؟

۴- دوسرے مرثیے میں کس واقعے کا بیان ہے ؟

۵- حضرت عباسؑ کون تھے ؟

۶- مندرجہ ذیل کو فقروں میں استعمال کیجئے
چوب‌علم - خواہر - تیغ ذی حشم - عدیل - کردگار -
جاں گداز - کارزار - استخوان - سرہنگ - صاعقہ - جست و خیز -
ستیز - محیط - پھریرے - الاماں -

۷- اعراب لگائیے -
ہوس - جلیل - سبیل - عدیل - پاتال - علم - فرس - عدو -
اجل - راکب - ٹاپو - سپہر - ہراس - خس -

۸- مندرجہ ذیل محاوروں کے جملے بنائیے -
معرکہ گرم ہونا - ہاتھ ملنا - ٹھنڈا کرنا - لوہا ماننا - دانتوں میں خس لینا -

۹- مندرجہ ذیل فقروں میں مبتدا اور خبر کی نشان دہی کیجیے -
(ا) نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال
(ب) حملہ دلیر کا غضب کردگار تھا
(ج) ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے

مرزا دبیر

(۱۸۰۳-۱۸۷۵ء)

سلامت علی نام - دبیر تخلص - مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے - دلی میں پیدا ہوئے - چھ سات برس کی عمر میں باپ کے ساتھ لکھنؤ آئے - پھر یہی شہر ان کا وطن ٹھہرا - پندرہ برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا اور میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے - انیس کی طرح انہوں نے بھی لکھنؤ سے پہلی بار قدم اس وقت نکالا جب ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکا تھا - عظیم آباد، آگرہ اور کانپور کا سفر کیا - مجلسیں پڑھیں اور ہر جگہ سے قبول علم کی سند لی آخر عمر میں بینائی جاتی رہی - علاج معالجے کے بعد بحال ہوئی تو اجل سر پہ آ کھڑی ہوئی -

زور بیان شوکت الفاظ صنائع بدائع یہ ان کے مرثیے کے امتیازی اوصاف سمجھے جاتے ہیں - اور یہی ان کے مرثیے کا عیب بھی بن جاتے ہیں - زور بیان دکھانے کے جوش میں اور زبان کا شکوہ پیدا کرنے کی دھن میں وہ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جسے بیان کی سادگی اور بے ساختگی کہتے ہیں وہ کم ہو جاتی ہے - مگر گریہ کا مضمون خوب باندھتے ہیں - ان کے مرثیوں میں مصائب کا بیان بہت درد اور اثر رکھتا ہے -

(۱)

شیر خوار میدان جنگ میں

بانو کے شیرخوار کو ہفتم سے پیاس ہے
بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
پھرتی ہے آس پاس یہ جینے سے یاس ہے
کہتی تھی کیا کروں سب دہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نور عین کی

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم
پھیلا رہے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیے پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم
چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

ہاتھوں پہ اس کو لے کے چلے شاہِ اتقیاؑ
اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا
اصغرؑ پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرہ پر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم یہ سوچتے تھے سبطؑ مصطفیٰؐ
لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو دیں گے بھلا وہ کیا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو میری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو میری

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانگ کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیر جانستاں
جوڑا کماں میں، تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا
سوکھے گلے میں خون بھرا، دم اٹک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ، قامت سرک گیا
ٹوپی گری زمین پہ، منکا ڈھلک گیا
ننھی کلائیوں میں تشنُّج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

منہ آسماں سے شہؑ نے پھرایا کہ کیا ہوا
دیکھا کہ پار حلق کے تیرِ جفا ہوا
بچہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہوا
یوں دیکھتا ہے جیسے کہ کوئی ڈرا ہوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دودھ اگلتے تھے اب خون اگلتے ہیں

(۲)

تلوار کی تعریف

اس سے الجھ گئی کبھی اس سے الجھ گئی
بُرَّش نئی، صفائی نئی، کج رخی نئی
اک سر سے لگ چلی تو الگ بر ہوے کئی
گہ زرد گہ سفید ہوا چرخ سرمئی
بھاگے ہوؤں کو ضرب پہ لاتی تھی گھیر کے
رد کرتی تھی اڑی ہوئی رنگت کو پھیر کے

ہر سو تھا شور ، تیغ کا کچھ اور ڈھنگ ہے
قالب میں تیرتی ہے مگر یہ نہنگ ہے
داخل میانِ خانۂ دل بے درنگ ہے
حق کی قسم یہ تیغ بڑی خانہ جنگ ہے

حق تو یہ ہے کہ مسئلہ داں تیغِ شاہ ہے
سر چڑھ کے سب سے لڑتی ہے اور بے گناہ ہے

کہتی تھی بار بار قضا کیا ہے؟ میں ہوں، میں
طوفانِ حشر، قہر و بلا کیا ہے؟ میں ہوں ، میں
دوزخ ، سقر، عذابِ خدا کیا ہے؟ میں ہوں، میں
راہِ عدم ، دیارِ فنا کیا ہے ؟ میں ہوں ، میں

حق سے ڈرو تو مژدۂ فضلِ الٰہ ہے
توبہ کرو تو قبضے میں میرے پناہ ہے

یاں سب کو تھا یقیں کہ وہاں تھی وہیں نہ تھی
یاں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہرجا تھی اور جو پوچھو کہاں تھی؟ کہیں نہ تھی
لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی، نہیں، نہ تھی

اُس برقِ ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھی جہاں زمین نہ تھی ، آسماں نہ تھے

آنکھوں میں کوندتی تھی، پہ پیشِ نظر نہ تھی
صف کون سی تھی رن میں جو زیر و زبر نہ تھی
کچھ انتہائے بُرّش تیغِ دو سر نہ تھی
یہ کون مبتدا تھا کہ جس کی خبر نہ تھی

واں تھی، وہاں نہ تھی، جو اُدھر تھی اِدھر نہ تھی
پر یہ نہ کچھ کھُلا کہ کدھر تھی ، کدھر نہ تھی؟

سوالات

۱- پہلا مرثیہ کس شہید کے بارے میں ہے -
اس مرثیے میں بانو کے شہید شیر خوار کا نام بتائیے -

۲- شاعر نے ماں کی پریشانی کی کن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے -

۳- مندرجۂ ذیل الفاظ کے معانی بتائیے -
شیرخوار - نورعین - پتلی - عدو - ترکش - نہنگ - چوب -
مبتدا - خبر - مژدہ - بے درنگ -

۴- اعراب لگائیے -
حلقوم - جھولے - اتقیا - اجلی - لہو - اگلتے - نخوت - تکبر -
مسکن - اجر - عوض - ترحم -

۵- چادر نہ تھی وہ چہرہ پر آب‌وتاب پر ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر
مندرجہ بالا شعر میں چادر اور چہرے کو کن کن چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے -

۶- جملۂ خبریہ وہ جملہ ہوتا ہے جس میں کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے کی خبر دی گئی ہو - مرثیے کے ان اقتباسات میں سے چند خبریہ جملے تلاش کیجیے -

مولانا الطاف حسین حالی

مولانا حالی کے حالات حصہ نثر میں بیان ہو چکے ہیں - وہ جدید اردو شاعری کے بانیوں میں بھی شمار ہوتے ہیں - وہ مسلمانوں کے پہلے قومی شاعر ہیں اور ان کی زیادہ تر نظمیں اصلاحی مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں - اردو غزل کو انھوں نے بے جا مبالغے سے پاک کیا اور فرضی عشق و عاشقی کی داستانوں کے بجائے زندگی کے عام مسائل کو جگہ دی -

(۱)

امید

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آ کر بڑھا تو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے
تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دسترس نارساؤں کو تو نے
کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے
سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحطِ انسان
نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خزف کے ہیں انبار گر یاں
جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں اُن میں پنہاں
چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ

جو بے غم ہیں ان میں تو غم خوار بھی ہیں
جو بے مہر ہیں کچھ تو کچھ یار بھی ہیں
انہیں غافلوں میں خبردار بھی ہیں
خرابات میں چند ہشیار بھی ہیں
جماعت سے اپنے نرالے بھی ہیں یاں
نکموں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں

جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا
کہ ایک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا
جہازوں کو ہے زورقوں نے ترایا
یونہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یوں جلتا رہا ہے

(۲)

رسالت کی پہلی تبلیغ

وہ فخر عرب زیب محراب و منبر
تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر،
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
سُوے دشت، اور چڑھ کے کوہ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ اے آل غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب؟

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کروگے اگر میں کہوں گا

کہ فوج گراں پشت کوہ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے
تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا
حقیقت کا گُر ان کو ایک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا
بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا سے
نہ آگاہ تھے مبدء و منتہا سے
لگائی تھی ایک اک نے لَو ماسوا سے
پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لَو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

سکھائی انھیں نوع انساں پہ شفقت
کہا "ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایے سے رکھتے ہیں وہ محبت
شب و روز پنہچاتے ہیں اس کو راحت

وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر
پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

(۳)

شعر سے خطاب

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان انکو ، جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے سچ سے لئے جا دِلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علَمِ امتیاز تو

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر ، پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پر ناز ہے کر اس پر ناز تو

سوالات

۱- نظم " امید " میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں اپنے الفاظ میں لکھیے -

۲- " رسالت کی پہلی تبلیغ کا خلاصہ بیان کیجئے -

۳- " شعر سے خطاب میں حالی کے مطابق اچھے شعر میں کیا صفات ہونا چاہئیں ؟

۴- مندرجۂ ذیل محاورات کو فقروں میں استعمال کیجیے -
ڈھارس بندھانا - دل بڑھانا - جان پڑنا - کایا پلٹنا -

۵- مسدس کسے کہتے ہیں ؟ مثال کے طور پر حالی کی نظم کا ایک بند لکھیے -

۶- مندرجۂ ذیل الفاظ کے معانی تحریر کیجیے -
داور - فرمان - صادق - کاذب - جبل - صوت - املا - فریفتہ -

۷- مندرجۂ ذیل پر اعراب لگائیے -
کڑکا - مغتنم - بیٹروں - علم - نشیب - خزف - ترایا -

۸- " راستی کا جوہر " میں راستی مضاف الیہ ' جوہر مضاف اور کا حرف اضافت ہے - آپ ایسی ہی پانچ مثالیں لکھیے - اور ان میں - مضاف ' مضاف الیہ اور حروف اضافت کی نشاندہی کیجیے - اس قسم کے مرکبات کو کیا کہتے ہیں ؟

اسمٰعیل میرٹھی

(۱۸۴۴ء-۱۹۱۷ء)

محمد اسمٰعیل میرٹھی ، میرٹھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی - تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے ۱۸۸۸ء میں سینٹرل نارمل سکول آگرے میں اردو اور فارسی کے مدرس ہو گئے - ۱۸۹۹ء میں ریٹائر ہوئے -

اسمٰعیل میرٹھی کا مرتبہ نظم اور نثر دونوں میں بلند ہے - ان کے کلام کا ضخیم مجموعہ "کلیات اسمٰعیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے - انہیں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بچوں اور بڑوں سب کے لیے لکھا ہے - تعلیمی اصلاحی اور قومی پہلو ان کی نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہیں - وہ مناظر قدرت کی بڑی سادگی اور روانی سے تصویر کشی کرتے ہیں - شاعری میں وہ جدید اصلاحی تحریک سے زیادہ متاثر تھے -

ملمّع کی انگوٹھی

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
اوچھی تھی لگی بولنے اِترا کے بڑا بول

چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہوں گی
وہ اور ہے میں اور، یہ ذِلّت نہ سہوں گی

میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانا
وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اس کا ٹھکانا

میری سی چمک اس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی ہے کہ ہے رانگ مجھے اس میں بھی شک ہے

میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ
وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ

اے دیکھنے والو تمھیں انصاف سے کہنا
چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا

یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل
اللہ رے ملمع کی انگوٹھی تیرے چھل بل

سونے کی ملمع پہ نہ اترا میری پیاری
دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائے گی ساری

کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا
جھوٹوں سے جو سچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا

مت بھول کبھی اصل کو اپنی اری احمق !
جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائے گا منہ فق

سچے کی تو عزت ہی بڑھے گی جو کریں جانچ
مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا
چھوٹے کو بڑا بن کے ابھرنا نہیں اچھا

قلعہ اکبر آباد

وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت

بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے، وہ عمارت
سیاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا

اورنگ سیہ رنگ جو قائم ہے لب بام
بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام
اشعار میں ثبت اس پہ جہانگیر کا ہے نام
شاعر کا قلم اس کی بقا لکھتا ہے مادام
پر صاف نظر آتا تھا کچھ اور ہی انجام
سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردش ایام
فرسودگی دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لیے خاموش ہے او تخت جگرریش
کس غم میں سیہ پوش ہے کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورت درویش
جوگی ہے ترا پنتھ، کہ صوفی ہے ترا کیش ؟
بولا کہ زمانے نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوے تھے
شاہان معظم کے قدم میں نے چھوے تھے

اس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب
فوّارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جام بلوریں ہیں نہ وہ گوہرِ نایاب
وہ چلمنیں زرتار نہ وہ بسترِ کمخواب

ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب
یہ معرضِ خُدّام تھا وہ موقف حُجّاب

وہ بزم ، نہ وہ دور ، نہ وہ جام ، نہ ساق
ہاں طاق و رِواق اور در و بام ہیں باق

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام ولیالی
جو واقعہ حسی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان ، ہر اک منزل عالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا ، نہ خداوند ، اہالی ، نہ موالی
جز ذات خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی

یہ جملہ محلات جو ویران پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

سوالات

۱- نظم ''ملمع کی انگوٹھی'' سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ؟
۲- کیا چاندی کی انگھوٹھی کی طرح انسانوں پر بھی ملمع ہوتا ہے ؟
۳- ''قلعہ اکبر آباد'' میں شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں اپنے الفاظ میں لکھیے -
۴- ''قلعہ اکبر آباد'' سے شاعر ہمیں کیا سبق دینا چاہتا ہے ؟
۵- مندرجہٴ ذیل الفاظ کو فقروں میں استعال کیجیے -
بارگہ - بشارت - معزول - ثبت - فرسودگی - کیش - عبرت - والی -
۶- مندرجہٴ ذیل کے واحد لکھیے -
ممالک - ایام - عظام - خُدّام - حُجّاب - اہام - لیالی - اہالی - موالی - محلات -
۷- مندرجہٴ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے -
جھول - ملمع - پاسنگ - گہنا - چھل بل - اوچھی - بھڑک - معرض - موقف - اورنگ - سالم - سوگ -

اکبر الٰہ آبادی

(۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء)

سید اکبر حسین اکبر الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد نیشاپور سے ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کے والد سید تفضّل حسین رضوی معروف عالم تھے۔ خاندان کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے باقاعدگی سے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ سب سے پہلے محکمۂ تعمیرات میں ملازمت کی۔ پھر مختاری کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۶۷ء میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا اور ملازمت چھوڑ کر وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں منصف مقرر ہوئے اور ترقی کر کے جج کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لے لی۔ حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں خان بہادر کا خطاب دیا۔

اکبر کی بیشتر شاعری اصلاحی ہے۔ وہ قوم کو مغربی تہذیب کے برے اثرات سے بچانا چاہتے ہیں جس کے لیے انھوں نے طنز اور ظرافت کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں پر طنز کرتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کی طنز میں شائستگی ہے اور مزاح میں لطافت۔ زبان و بیان پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے انھوں نے اردو غزل کو سنوارا اور اسے نئے موضوعات سے آشنا کیا۔

"رہنے دیجیے"

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے
آپ اپنی عزتِ دربار رہنے دیجئے
کیجئے ثابت خوش اخلاق سے اپنی خوبیاں
یہ نمودِ جبہ و دستار رہنے دیجئے
ظالمانہ مشوروں میں میں نہیں ہوں گا شریک
غیر ہی کو محرمِ اسرار رہنے دیجئے
کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر! چندہ لیجیے ، طومار رہنے دیجئے
کیجئے رشوت ستانی سے ذرا پرہیز آپ
خیر خواہی کا یہ سب اظہار رہنے دیجئے
مل کے باہم کیجئے اغیار سے بحث و جدال
بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجئے
ٹیمز میں ممکن نہیں نظارۂ موجِ فرات
ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجئے

قطعات

(۱)

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد و وفا بھول گئے

پنہچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سِویّوں کا مزا بھول گئے

بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایۂ کفر میں انوارِ خدا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت آئی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسے کیسے دلِ نازک کو دُکھایا تم نے
خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے
بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ، کہ میری اصل ہے کیا، بھول گئے
کیا تعجّب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جبکہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

(۲)

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت
کہ ہم کیونکر وہاں کا حال جانیں
لحد تک آپ کی تعظیم کر دی
اب آگے آپ کے اعمال جانیں

(۳)

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بت نکال دیے تھے رسولؐ نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

(۴)

سوچو کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے
دیکھو! گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے
ہشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا
'یورپ نے یہ کہا ہے، یورپ نے وہ کہا ہے'

(۵)

کہا جب مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے ؟
میں گھبرایا کہ اس پرسش میں کوئی رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
تو فوراً کہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
و لیکن مولوی ہرگز نہیں بے خانساماں ہے

رباعیات

(۱)

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا جن کو بینا پایا

❋

(۲)

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

❋

(۳)

مشکل ہے یہ حالتیں کہی جاتی ہیں
پہنانیں ہیں نہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تمثیل تنہ پوچھو ، ہیں اشارے کافی
یوں ہیں یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

سوالات

۱- اکبر الٰہ آبادی کے کلام کا مخصوص رنگ کیا ہے ؟

۲- قطعہ اور رباعی کا فرق بیان کیجیے۔

۳- نظم " رہنے دیجیے " کے پانچ قافیے لکھیے۔

۴- اکبر کی پہلی رباعی میں آنکھوں کے بینا ہونے سے کیا مراد ہے ؟

۵- پہلے قطعے " عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے " میں کن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

۵- مندرجۂ ذیل پر اعراب لگائیے۔

سویوں ۔ ترنگ ۔ طومار ۔ پھانسیں ۔ قلب ۔ مضر ۔

۷- مندرجۂ ذیل الفاظ کے معانی بتائیے۔

بینا ۔ عیب ۔ اظہار ۔ بخل ۔ نمود ۔ دستار ۔ اسرار ۔ جدال ۔

۸- ردیف وہ ایک کلمہ یا کلمات ہوتے ہیں جو ایک غزل یا نظم کے بعض مصرعوں میں بار بار آئیں ۔ اکبر الٰہ آبادی کی ان نظموں قطعوں وغیرہ میں ایسے کلمات تلاش کیجیے جو ردیف کہے جا سکیں ۔ کیا ایسے کلمات ہر نظم یا قطعے یا رباعی میں موجود ہیں ؟

مولانا ظفر علی خان

(حالات اور تبصرہ حمد کے ضمن میں دیکھیے)

(۱)

"وادی جہلم"

گاتے ہوئے یہ نغمہ دومیلی سے چلے ہم
اسلام سے ہے گرمئی ہنگامۂ عالم
ہرگز نہ جھکے گا کبھی توحید کا پرچم
گا تو بھی یہی زمزمہ اور ہو یہی سرگم
اے وادی جہلم

میداں ترے شاداب سمن بو ترے ٹیلے
چشمے ترے شفاف چمن تیرے رنگیلے
کھیتی تری سرسبز ثمر تیرے رسیلے
رونق ترے باغوں کی خزاں کر نہ سکی کم
اے وادی جہلم

انساں ہیں تہمتن تو سرشت ان کی وفا نیز
توسن ہیں اگر تیز تو برق ان کی مہمیز
قابض تری اس صولت و سطوت پہ ہیں انگریز
یہ صولت و سطوت ہے تو انگریز کو کیا غم
اے وادی جہلم

یونان کے ہنگامے کو غزنی کے شغب کو
محمود کے غصے کو سکندر کے غضب کو
موجیں تری ندی کی بہا لے گئیں سب کو
اب کس کی تباہی کے ارادے ہیں مصمم
اے وادی جہلم

(۲)

الکاسبُ حبیب اللہ

سرمایہ نے محنت سے یہ کہا اس شور و شغب سے کان نہ دھا
تو کچھ بھی کرے ہونا ہے وہی جو ہم نے جی میں بچارا ہے
طوفاں کے تھپیڑے ایک طرف ، موجوں کے تڑیڑے ایک طرف
منجدھار میں پڑ گئی ناؤ تری ، اور کوسوں دور کنارا ہے
تیرے لیے ہے خوں ناب جگر اور میرے لیے ہے لقمہ تر
تقدیر کی انگلی اٹھ اٹھ کر کرتی یہی روز اشارا ہے
جس مٹی والی حویلی میں بسنے کی مجھے توفیق ملی
ہڈی تری اس کا چونا ہے ، تیرا لہو اس کا گارا ہے
جو سوکھے ٹکڑے میں تجھے دوں کھا کر انھیں سو قسمت کو نہ رو
نہوڑا مرے آگے گردن کو ، اور اس کے سوا کیا چارا ہے
سرمائے نے یوں جب دون کی لی محنت نے چمک کر اس سے کہا
اس وقت تو بیشک گردش میں ہم فاقہ کشوں کا ستارا ہے
لیکن تجھے اس کی بھی ہے خبر ، تو نے نہ سنا اب تک ہو تو سن
تقدیر پلٹتی رہتی ہے تقدیر کا رنگ نیارا ہے
جس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو تو اپنا ہی اجارا سمجھا ہے
آج اس پہ اگر قبضہ ہے ترا ، کل دعوٰی اس پہ ہمارا ہے
اسلام نے جب یہ بحث سنی سرمایہ کو ڈانٹا اور کہا
الٹے گا وہ اک دن ٹھاٹ ترا مزدور خدا کا پیارا ہے

(۳)

اَخلاق مرتضوٰی

روایت ہے کہ اک سرکش یہودی
ہُوا جنگ آزما شیرِ خدؑا سے

نہ تھا اس رمز سے شاید وہ آگاہ
کہ یہ کُشتی وہ لڑتا ہے قضا سے
جو اپنی جان کا ہو آپ دشمن
وہی الجھے علیؑ مرتضےٰ سے
ہوا واقف وہ پہلی ہی پکڑ میں
علیؑ کے زورِ مرحب آزما سے
زمیں پر آ رہا گرتا ہے جس طرح
خزاں کا آخری پتا ہوا سے
کھڑی تھی موت اس کے سر پہ اس وقت
نہ تھا خس کو مفر سیلِ فنا سے
برنگِ ذوالفقار اس کے لہو کے
نظر آتے تھے عرش و فرش پیاسے
یہودی نے یہ جب دیکھا کہ ہرگز
نہیں ممکن ہے بچنا اس بلا سے
مقابل چاند تھا تھوکا اسی پر
طبیعت کے پرانے اقتضا سے
کہ نکلے آخری نفرت کی حسرت
اسی حیلے، دلِ کفر آشنا سے
یہ گستاخانہ یہ بے ہودہ حرکت
جونہیں سرزد ہوئی اس ناسزا سے
معاً روکا علیؑ نے ہاتھ اپنا
وہ جو دو ہاتھ آگے تھا قضا سے
کیا خوں بھی معاف اور یہ خطا بھی
مئے احساں سے تھے لبریز کاسے

جرائم سے نوازش کچھ سوا تھی
عطائیں بڑھتی جاتی تھیں خطا سے
یہودی بس گیا تصویرِ حیرت
امیر المومنین کی اس ادا سے
لگا کہنے کہ اے سردار ذی جاہ
یہ سب کچھ کیوں ہے اور کس مدعا سے؟
مجھے کیوں میری اس حرکت سے اغماض؟
جو ہے مذموم پڑھ کر انتہا سے
مکافات عمل کا یہ تصور
ہے بالاتر مری فکر رسا سے
جواب اس نکتۂ باریک کا یوں
ملا اس کو لبِ مشکل کشا سے
جو سچ پوچھے تو غصہ آ گیا تھا
مجھے اس تیرے فعلِ ناروا سے
مگر یہ غصہ رکھتا تھا تعلق
فقط میرے ہی نفسِ فتنہ زا سے
میں اس حالت میں تجھ کو قتل کرتا
تو ہوتا سرخرو کیونکر خدا سے؟
کہ میں جو کام بھی کرتا ہوں اس میں
غرض ہوتی ہے مولا کی رضا سے
یہودی سن چکا اچھی طرح جب
یہ ارشاد انتہا تک ابتدا سے
پکار اٹھا کہ ہے اسلام سچا
ہے دنیا قائم اس دینِ خدا سے

تہی داماں رہا ہوں آج تک میں
چنوں گا پھول اب بستانِ سرا سے
مرا گھر شعلہ زارِ طور ہوگا
اب اس شمعِ فروزاں کی ضیا سے
نہ سرتابی کروں گا آج کے بعد
خدا سے اور محمد مصطفیٰ سے

سوالات

۱- ''الکاسبُ حبیب اللہ'' میں مولانا ظفر علی خاں نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے ؟

۲- ''اخلاقِ مرتضوی'' میں جو روایت بیان کی گئی ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیے ۔

۳- یہودی کس بات سے متأثر ہوکر مسلمان ہوگیا ؟

۴- مندرجہٴ ذیل کو فقروں میں استعمال کیجیے ۔
جنگ آزما ہونا ۔ قضا سے کشتی لڑنا ۔ تصویرِ حسرت بن جانا ۔ سرخرو ہونا ۔ دون کی لینا ۔

۵- مندرجہٴ ذیل پر اعراب لگائیے ۔
سرگم ۔ توسن ۔ شفاف ۔ صولت ۔ سرکش ۔ خس ۔

٦- مندرجہٴ ذیل کے معانی لکھیے ۔
ہنگامہٴ عالم ۔ سمن بو ۔ وفا خیز ۔ صولت و سطوت ۔ شور و شغب ۔ لقمۂ تر ۔

علامہ شیخ محمد اقبال

(۱۸۷۷ء — ۱۹۳۸ء)

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے حالات زندگی حصۂ نثر میں بیان ہو چکے ہیں ۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنا شروع کر دیے تھے ۔

شاعری میں وہ داغ کے شاگرد ہوے ۔ غزل سے ابتداء کی ۔ ان کا ابتدائی کلام غزلیات پر مشتمل ہے جن میں داغ کا اثر بہت نظر آتا ہے ۔ مگر بہت جلد انھوں نے اس رنگ سے بغاوت کی اور شاعری میں اپنی راہ الگ نکالی ۔ اپنے منفرد رنگ میں ایک ملی شعور کے ساتھ نظمیں لکھیں ۔ پھر اسی شعور نے ان کی غزل میں راہ پائی اور ان کی غزل ایک نئے شعور اور ایک آہنگ کی حامل ہوئی ۔ اس نئے شعور کے ساتھ وہ فارسی شاعری کی طرف متوجہ ہوے اور اس زبان میں بھی ایک منفرد شاعر مانے گئے ۔

ان کی اُردو شاعری کے مجموعے تین ہیں ۔ بانگِ درا ۔ بالِ جبریل ۔ ضربِ کلیم ۔ آخری زمانے کا اُردو اور فارسی کلام اکٹھا 'ارمغانِ حجاز' کے عنوان سے شائع ہوا ۔

اقبال کی نظموں نے مسلمانوں میں ایک نیا حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا کی ۔ ان کی شاعری نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا ۔ وہ مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت یاد دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب بھی اگر وہ قرآن کو مشعل راہ بنائیں تو نہ صرف پستی سے نکل سکتے ہیں بلکہ پوری دنیا کی قیادت کر سکتے ہیں ۔

شکوہ

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا اسکو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوند کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآں کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و تصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

تجھ کو چھوڑا کہ رسولؐ عربی کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسمِ سلمانؓ و اویسؓ قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالؓ حبشی رکھتے ہیں!

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

جواب شکوہ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
اُمتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر، اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا!
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا شیدائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملتِ احمدِ مرسَل کو مقامی کر لو

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسٰی ہی نہیں

کون ہے تارکِ آئینِ رسُولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدریؑ فقر ہے، نے دولتِ عثمانیؓ ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

طلوع اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ کہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؑ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی

ثبات زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائیدہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ آقا و بندہ فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہ نما ہوں میں
ہوں زمیں پر گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتاب ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تُو لیکن
غیرتِ لعل بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

طارق کی دعا

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظِر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں!
کشاد درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں!

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن!
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن!

سوالات

۱۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں کن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے؟
۲۔ ان دونوں اقتباسات سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟
۳۔ ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' میں علامہ اقبال نے قومی اتحاد کا جو درس دیا ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔
۴۔ ''طارق کی دعا'' کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۵۔ ''زور حیدرؑ''۔ ''فقر بوذرؓ'' اور ''صدق سلمانیؓ'' کی وضاحت کیجیے۔
۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے۔
استبداد ۔ اخوت ۔ تحمل ۔ حذر ۔ منفعت ۔ سلف ۔ خم ۔ ازل ۔ مبارک۔

۷۔ مندرجۂ ذیل الفاظ میں سے واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے ۔

قوم ۔ احرار ۔ نبی ۔ دین ۔ عمل ۔ سلف ۔ اغیار ۔ اوصاف ۔ قصور ۔ الطاف ۔ عنایات ۔ اسلاف ۔

۸۔ ''لوح و قلم'' میں ''و'' حرف عطف ہے ۔ اقبال کی نظموں میں سے مرکب عطفی کی ایسی پانچ مثالیں تلاش کیجیے ۔

۹۔ ''درۂ خیبر'' مرکب اضافی ہے اقبال کی نظموں میں سے اس کی کم از کم آٹھ مثالیں لکھیے ۔

۱۰۔ زورِ حیدرؓ مرکب اضافی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت اور بہادری کے واقعات کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے ۔ اسے اصطلاح میں تلمیح کہتے ہیں ۔ اقبال اپنی شاعری میں ایسی تلمیحیں بہت استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی ان نظموں میں سے جو آپ نے پڑھی ہیں ، تلمیحیں چنیے اور بتائیے کہ وہ کن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

حفیظ جالندھری

(ان کے حالات حصہ نظم کی ابتدا میں دیئے جا چکے ہیں)

تصویرِ کشمیر

برف کی اونچائیاں ، برفاب کی گہرائیاں
رنگ وبو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پر دیواروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندیاں ہر سو تھرکتی ، ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی ، پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا ، پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی

کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وادیِ کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جسکی محنت سے چمن میں روئے گل پرخندہ ہے
اسکا گھر تاریک ، اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقش ، صناعی کا جس کی لوح دل پر کندہ ہے
اسکی مجبوری کو دیکھو ، بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
زندگانی ہے یہاں مرگ دوامی کے لئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لئے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۲)

شہسوار کربلا

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے ، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فنِ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغہ دوسر ، کہ ایک ایک وار پر
اٹھی صدائے الاماں ، زبان شرق و غرب سے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ مردِ حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
ادھر ہزار گھات ہے، مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزارہا کا حوصلہ شکست ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مرد تیغ زن، یہ صف شکن، فلک فگن
کمالِ صبر و تن دہی سے محو کارزار ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے
حبیبِ مصطفےٰؐ ہے یہ مجاہدِ خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد برد ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُدھر سپاہ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دین ادھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

(۳)

ہلالِ استقلال

خدائے پاک نے لاہور کو دست قوی بخشا
رسولؐ اللہ نے جوش جہاد غزنوی بخشا
زہے یہ شانِ لاہور، اور یہی شان اس کے شایاں ہے
ہلالِ ضبط و استقلال افق پر اب نمایاں ہے
ہلالِ نو کی ضو ہے عزت و اقبال کا پرچم
مبارک برسرِ لاہور استقلال کا پرچم
وہ شب تاریک تھی خوابیدہ شہری، شہر خطرے میں
مگر تھی موجزن غیرت لہو کے قطرے قطرے میں
حق و باطل کا جیسا معرکہ لاہور نے دیکھا
چونڈے کے سوا کب اور کہاں، کس دور نے دیکھا؟
اندھیری شب میں چپکے چپکے چوروں کی وہ یلغاریں
نہتے گاؤں والے جن کے سر پر تیز تلواریں
اچانک جانب لاہور وہ شبخون دشمن کا
خدا و مصطفیؐ کے دائمی ملعون دشمن کا
سنیں لاہور نے یک لخت سینہ چاک آوازیں
دھماکے، صاعقے، پر ہول ہیبتناک پروازیں
جزاک اللہ لاہوری مسلمانوں کا دل گردہ
بہادر شہریوں میں کوئی محزوں تھا نہ افسردہ
مضافاتی علاقے سے درندوں کی وہ چنگھاڑیں
ارے لاہوریو، ٹھہرو تمہیں چیریں تمہیں پھاڑیں

---

*۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد لاہور کو "پرچم استقلال" دیئے جانے کی تقریب میں یہ نظم پڑھی گئی۔

یہ قوت کی نمائش تھی، یہ کثرت کا دکھاوا تھا
فقط لاہور پر لا انتہا فوجوں کا دھاوا تھا
نہ تھی لیکن خبر ان بد سرشتوں، بد نہادوں کو
کہ اُن دیکھا خدا بھی دیکھتا ہے ان ارادوں کو
شگفتہ، زندہ دل، داتا کی نگری کے "جواں لہری"
محاذ جنگ پر جانے کے طالب تھے سبھی شہری
چڑھی آتی تھی ٹینکوں کی جو آندھی شہر کے اوپر
اسے مردان حق نے دھر لیا تھا نہر کے اوپر
فضا میں دفعۃً اللہ اکبر کی ندا گونجی
محمد مصطفےٰؐ کے نام نامی سے ہوا گونجی
بطون فرش سے تا عرش اذکار جلی گونجے
زمیں سے آسماں تک نعرہ ہائے "یا علیؑ" گونجے
ہماری ماؤں بہنوں بیٹیوں کے پاسباں بن کر
گرے باطل کے سر پر اہل حق شیر ژیاں بن کر
ہوئی لاہور کی زندہ دلی اب اور بھی زندہ
مثال کوہ آہن بن گیا ہر ایک باشندہ
خطاب تازہ اک آوازہ ہے لاہور والوں کو
کبھی ہرگز نہ بھولیں حملہ آور بد خصالوں کو
یہی لاہور جسم غرب پاکستان کا دل ہے
یہی داتا کی نگری غیرت و ایماں کا دل ہے
فلک پر معرکے تھے برسر لاہور جنگوں کے
نڈر لاہور پر یہ کھیل تھے گویا پتنگوں کے
خدا رکھے، یقیں لاہور کا تھا فتح پر کامل
رضاکارانہ تھا ہر فرد اپنے کام پر عامل
شہیدوں غازیوں نے پے بہ پے دے دے کے قربانی
کسی بزدل کے دل میں بھی نہ آنے دی پریشانی

یہ پرچم اصل میں غازی شہیدوں کی طرف سے ہے
ہمارے ملک و ملت کا شرف ان کے شرف سے ہے
ہلال خنجر قومی عطیہ ہے شہیدوں کا
جو خود قربان ہو کر بھر گئے دامن نویدوں کا!
یہ استقلال کا رایت جو ہے لاہور پر چھایا
فضائی ، بری و بحری عساکر نے ہے لہرایا
یہ پرچم ہے فدا کاری کی رسم و راہ کا پرچم
یہ پرچم ہے جہاد فی سبیل اللہ کا پرچم
علَم ہے رحمتِ عالمؐ کا پرچم ہے نبوت کا
یہی پرچم ہے اسلامی مساوات و اخُوت کا
اسی پرچم کا خیبر میں علیؑ کے سر پہ سایا تھا
اسی پرچم نے میدان میں دل خالد بڑھایا تھا
حسینؑ ابن علیؑ کے اسوۂ مردانہ کا پرچم
برائے شمع ملت سوزش پروانہ کا پرچم
محمد ابن قاسمؒ کے سحاب جود کا پرچم
یہ طارقؒ کا صلاح الدینؒ کا محمودؒ کا پرچم
یہ پرچم ہے روایات عظیم الشان کا پرچم
یہی پرچم ہے استقلال پاکستان کا پرچم
بصدق دل جو استقلال کا پرچم اٹھاؤ گے
جدھر "لاہوریو" تم رخ کروگے فتح پاؤ گے
دعا مانگو ، رہے اللہ ان کا حافظ و ناصر
رکھا جن غازیوں نے دشمن اسلام کو قاصر
طفیل رحمۃ للعالمینؐ یہ بھی سعادت دے
ہمیں اسلام کے غازی بنائے اور شہادت دے
مبارک بر سر لاہور ، استقلال کا پرچم
ہلال نو کی ضو ہو عزت و اقبال کا پرچم

سوالات

۱- "تصویر کشمیر" میں شاعر نے کشمیر کے کون کون سے دو پہلو پیش کیے ہیں ؟

۲- "شہسوار کربلا" میں شاعر نے حضرت حسین[ؑ] کا جو کردار پیش کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجئے ۔

۳- "ہلال استقلال" میں شاعر نے اہل لاہور کے حوصلے کی جو تعریف کی ہے اسے آسان الفاظ میں لکھیے ۔

۴- نظم "ہلال استقلال" میں شاعر نے دشمن کے حملے کے بارے میں کیا لکھا ہے ؟

۵- مندرجہ ذیل پر اعراب لگائیے ۔

ابر ۔ سبز ۔ کسمساتی ۔ وجد ۔ صبر ۔ افق ۔ صفر ۔ نذر ۔ شرف ۔ اخوت ۔ شقی ۔

۶- "رنگ و بو" میں "و" حرف عطف ہے ۔ حفیظ کی نظموں میں سے اس کی چند مثالیں تلاش کر کے لکھیے ۔

۷- رضاکارانہ کا کلمہ رضاکار میں 'انہ' کا اضافہ کر کے بنا ہے ۔ اسی قسم کے چند اور کلمات تلاش کیجیے جن میں کسی اور کلمے کے بعد 'انہ' کا اضافہ کیا گیا ہو ۔

۸- 'ہلال استقلال' کے کن اشعار میں ردیف کا استعمال ہوا ہے ؟ ردیف اور قافیے میں فرق بیان کیجیے ۔

احسان دانش

(ان کے حالات حصۂ نظم کی ابتدا میں دیے جا چکے ہیں)

دیہات کی شام

سرخ مے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب
سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرما رہے تھے سبزہ زار
آ رہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار
دامنِ شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی امنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جلترنگ
آ چکی تھیں گاگریں بھر کر حسین پنہاریاں
اُٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں
بند کیں ذروں نے آنکھیں اور لہریں رک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی پلکیں جھک گئیں
راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے
مست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے
آسماں کے سرخ جلوؤں پر سیاہی آ گئی
جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اُداسی چھا گئی
اوڑھ کر اک تیرگوں چادر بیاباں سو گیا
سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلّط ہو گیا
عالمِ ایجاد پر افسردگی چھانے لگی
جھونپڑوں سے دودھ دوہنے کی صدا آنے لگی
خامشی پر رنگ آیا شورشِ عالم گئی
آسماں پر انجمِ تاباں کی محفل جم گئی

شام کے اندھیر میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا
بالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ
مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں
سادہ خاطر بہہ چلے تقریر کے سیلاب میں
یہ وہ ہیں جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں
جن کی گرد رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتی ہے زلف روزگار
جن کی فطرت سے ہوسناکی ہے فرسنگوں پرے
شہریوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے
بازوؤں پر جن کے نازاں فطرتِ گلشن طراز
کاوشوں سے جس کی حسنِ انجمن مائل بہ ناز
واہ رے دیہات کے سادہ تمدّن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زر نگار
دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

سوالات

۱- اس نظم میں شاعر نے دیہات کی شام کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲- آخری شعر میں شاعر اس تمنا کا اظہار کرتا ہے کہ وہ شہر چھوڑ کر گاؤں میں جا رہے؟ اس کا سبب کیا ہے؟

۳- اس نظم میں بہت سی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے صرف اضافی اور توصیفی تراکیب چنیے۔

۴- اس نظم میں جو استعارے استعمال ہوئے ہیں ان کی ایک فہرست بنائیے اور ان کی وضاحت کیجیے۔

میر انیس

رباعی اردو کی سب سے مختصر صنف سخن ہے یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے جن کی تعداد ۲۴ ہے رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں ردیف اور قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے بعض رباعیوں کے چاروں مصرعوں میں ردیف اور قافیہ ہوتا ہے۔

میر انیس کے حالات آپ پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے مراثی کے علاوہ سلام اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ ان کی رباعیات بھی ان کے مرثیوں کی طرح اردو شاعری میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔

رباعیات

(۱)

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

(۲)

جو شے ہے فنا، اسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم، اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب
غافل! اس زندگی کو کیا سمجھا ہے؟

(۳)

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پنہچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

(۴)

توقیر ترے ہی آستانے سے ملی
عزت ترے در پہ سر جھکانے سے ملی
مال و زر و آبرو و دین و ایماں
کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

(۵)

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

سوالات

۱- رباعی کی تعریف بیان کیجیے۔

۲- رباعی میں بطور خاص کن موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔

۳- ان رباعیات میں جن اخلاقی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴- مندرجۂ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

پیمانہ ۔ توشۂ آخرت ۔ فنا ۔ بقا ۔ اطفال ۔ آغوش لحد

۵- اعراب لگائیے۔

بحر ۔ لحد ۔ اعمال ۔ بچھونا ۔ آغوش ۔ بچھونا ۔

خواجہ میر درد

(۱۷۲۰ء-۱۷۸۵ء)

خواجہ میرنام - درد تخلص - خواجہ ناصر عندلیب کے بیٹے تھے - ساری عمر دلی میں بسر ہوئی - لڑائیوں نے دلی کی خلقت کو تتر بتر کر دیا - بہت سے شاعر بھی شہر چھوڑ کر لکھنؤ اور دوسرے مقامات کی طرف نکل گئے - مگر خواجہ میر درد اپنے ٹھکانے سے نہ ہلے - بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب ان کے تکئے پر حاضری دیتے - یہیں شاعر جمع ہوتے اور مشاعرہ منعقد ہوتا -

میر درد صوفی تھے ان کی غزلیں بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں - عشقیہ مضمون اس طرح باندھتے ہیں کہ عشق، مجازی سطح سے گزر کر عشق حقیقی بن جاتا ہے ان کی غزلیں ایک عاشق سے زیادہ ایک صوفی کی واردات ہیں میر درد کو اُردو کا پہلا صوفی شاعر کہنا چاہیے -

میر درد کی زبان شستہ اور پاکیزہ ہے - کلام میں درد اور اثر ہے کم لکھا ہے مگر جتنا لکھا ہے وہ خوب لکھا ہے -

(۱)

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

افشائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے درد چاہے لائے بخود، پر نہ لا سکے

(۲)

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہُوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا، چپ رہ، عبث وے سابقے مت یاد رکھ
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

(۳)

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اُودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو، اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

سوالات

۱۔ مطلع اور مقطع کا فرق بتائیے۔
۲۔ درد تصوف کے شاعر ہیں۔ تصوف سے کیا مراد ہے؟
۳۔ کسی چیز کو کسی مشترک صفت کی وجہ سے کسی دوسری چیز کے مانند قرار دینے کو تشبیہ کہتے ہیں۔ درد کی غزلوں میں سے تشبیہ کی کوئی مثال دیجیئے۔
۴۔ معانی لکھیے۔
ارض۔ سہا۔ فتادہ۔ طلسم۔ افشا۔ دیر۔ حیف۔ تاراج۔ عبث۔

میر تقی میر

(۱۷۲۳ء—۱۸۱۰ء)

نام میر محمد تقی ۔ باپ میر علی متقی جو اکبر آباد میں رہتے تھے۔ میر بھی اکبرآباد ہی میں پیدا ہوئے ۔ مگر باپ کے انتقال کے بعد دلی چلے گئے ۔ پھر دلی ہی کے ہو رہے ۔ کچھ زمانہ لکھنؤ میں بھی گزرا جہاں وہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے ۔

غزل، قصیدہ، مثنوی ۔ یہ سب اصناف میر کے یہاں نظر آتی ہیں مگر ان کا سب سے زیادہ مؤثر اظہار غزل میں ہوا ہے غزل ہی کے واسطے سے وہ اُردو کے بڑے شاعر شمار کئے جاتے ہیں ۔ ان کی غزلیں آدمی کی جذباتی زندگی کی ایک بھرپور تصویر پیش کرتی ہیں ۔ بیان میں سادگی اور لہجے میں دھیما پن ہے اسی کے ساتھ ایک اداسی کی کیفیت ہوتی ہے ۔ یہ خصوصیتیں مل جل کر ان کی غزل کو ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہیں ۔

(۱)

جور کیا کیا جفا کیا کیا ہیں
عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں

خوبرو ہی فقط نہیں وہ شوخ
حسن کیا کیا ادائیں کیا کیا ہیں

فکرِ تعمیرِ دل کسی کو نہیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں

گہ نسیم و صبا ہے گاہ سموم
اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں

منظر دیدِ قصرِ دل اے میر
شہر تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں

(۲)

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
دل نے صدمے بہت اٹھائے تھے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو
داغ چھاتی کے سب دکھائے تھے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے
کس توقّع پہ دل لگائے تھے

فرصتِ زندگی سے مت پوچھو
سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

میر صاحب رلا گئے سب کو
کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

(۳)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا اِحرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونا مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(۴)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

سوالات

۱- میر کی پہلی غزل کے قافیے لکھیے -

۲- چوتھی غزل کی ردیف کیا ہے -

۳- نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں کس چیز کو کس سے تشبیہ دی گئی ہے -

۴- میر کی شاعری کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں ؟

۵- 'سپید و سیاہ' کس قسم کی ترکیب ہے ؟ اس قسم کی چند اور ترکیبیں لکھیے -

۶- 'ہستی اپنی حباب کی سی ہے' اس مصرع میں 'سی' کس قسم کا حرف ہے - اس قسم کے حروف کی اور مثالیں تلاش کیجیے -

۷- میر کی مندرجۂ بالا غزلوں میں فعل ماضی کی کون کون سی قسمیں استعمال ہوئی ہیں ؟ وضاحت کیجیے -

میرزا اسد اللہ خان غالب

(۱۷۹۷ء—۱۸۶۹ء)

غالب فارسی اور اُردو کے مایہٴ ناز غزل گو ہیں لیکن ان کی اصل شہرت اُردو کلام کی وجہ سے ہے۔ غزل میں وہ ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ اُردو شاعری میں انھیں جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ معنی آفرینی، جدتِ ادا، اور ندرتِ خیال ان کی غزل کی چند خصوصیات ہیں۔ انھوں نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کا اصل میدان غزل ہے جس میں انھوں نے ایک طرف انسان کی رنگا رنگ جذباتی کیفیتوں کو پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان جذباتی کیفیتوں کو فلسفے کے رنگ میں رنگا اور یوں اپنے بعد کی غزل کے لیے مزید راہیں نکالیں۔

(۱)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھا
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستاں روا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۲)

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاو
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پنہچائیں کیا ؟

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا ؟

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(۳)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۴)

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

سوالات

۱۔ غالب کی غزل کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں ؟

۲۔ دوسری غزل میں ردیف کی نشان دہی کیجیے ۔

۳۔ جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
اس شعر کی تشریح کیجیے ۔

۴۔ لگاو حاصل مصدر ہے ۔ یہ کس مصدر سے بنا ہے ؟ ایسے ہی چند اور مصادر سے حاصل مصدر بنائیے ۔

مولانا الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء—۱۹۱۴ء)

مولانا حالی کے حالات زندگی آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں غزل سے آغاز کیا اور غالب کی شاگردی اختیار کی۔ مگر جلد ہی اظہار کے نئے راستے تلاش کر لیے اور نئی طرز کی نظمیں لکھیں۔ جن سے اردو میں نیچرل شاعری کی تحریک شروع ہوئی۔ اس شاعرانہ زبان سے ہٹ کر جو بہت مصنوعی ہو چکی تھی انھوں نے سیدھی سادی زبان میں نظمیں لکھیں۔ پھر وہی زبان غزل میں اپنائی ان کی انھیں غزلوں سے اردو کی نئی غزل کی ابتدا ہوتی ہے۔

(۱)

قلق اور دل میں سوا ہوگیا
دلاسا تمھارا بلا ہوگیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہوگیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلہ ہوگیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہوگیا

ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

(۲)

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

شوق میں اس کے مزا درد میں اس کے لذت
ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

(۳)

دلوں کا کھوٹ اگر کہئے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہ زن خلق، رہنما ایک ایک

رہا ہوں رند بھی، اے شیخ، پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دلخراش جہاں
رہے گی حالیٔ دلگیر کی صدا ایک ایک

سوالات

۱- تخلص کسے کہتے ہیں ؟ جن اشعار میں تخلص استعمال ہوا ہو انھیں کیا کہتے ہیں ۔

۲- مطلع کسے کہتے ہیں ؟ حالی کی کسی غزل کا مطلع لکھیے ۔

۳- "خضر" اسم معرفہ ہے ۔ اسم معرفہ کی تعریف کیجیے اور مثالیں دیجیے ۔

حسرت موہانی

(۱۸۷۵ء—۱۹۵۱ء)

فضل الحسن نام ۔ حسرت تخلص موہان ضلع اناو (یو ۔ پی بھارت) میں پیدا ہوئے مگر بڑے ہو کر موہان سے کنارہ کر کے کانپور میں رہ پڑے ۔ علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا۔ وہاں سے ادب اور سیاست دونوں کا شوق اکٹھا لے کر اٹھے۔ شاعری میں تسلیم لکھنوی کے شاگرد بنے ۔ سیاست میں پہلے کانگرس سے پھر مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے ۔ شاعری میں طرز جدید کے غزل گو کی حیثیت سے نام پیدا کیا ۔ سیاسی زندگی میں ایک ایثار پیشہ مرد حق گو کی حیثیت سے ابھرے اور رئیس الاحرار کہلائے ۔ زندگی فقیرانہ بسر کی ۔ عمر قید کاٹنے اور شعر کہنے میں گزری ۔

حسرت موہانی غزل میں ایک نئے رنگ کے بانی سمجھے جاتے ہیں ۔ ان کے یہاں اردو غزل کی روایت بھی بہت رچی بسی نظر آتی ہے اور پرانے اساتذہ کے اثرات کی جھلک جا بجا ملتی ہے ۔ اسکے ساتھ روایت سے بغاوت کا رنگ بھی موجود ہے ۔ انھوں نے عشق کے روائیتی بیان کو رد کرکے اسے اپنے زمانے کے پس منظر میں سیدھے سچے انداز میں بیان کرنے کی راہ نکالی ۔

(۱)

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شراب بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قید ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشت خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

(۲)

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی
شادی مرگ کا بہانہ ہوا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ
تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا

حیف ہے اس کی بادشاہی پر
تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہوا

(۳)

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دم واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

سوالات

۱- حسرت موہانی کی شاعری کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۲- "ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا"
اس شعر میں بتائیے کہ دشمنی کا حق کیا تھا؟

۳- غزل نمبر ۱ میں "دشت خود فراموشی" سے کیا مراد ہے۔

۴- مندرجۂ ذیل کے معنی تحریر کیجیے۔
شراب بیخودی۔ خاکساری۔ گریۂ عشاق۔ خواب آغاز وفا۔

۵- خود فراموش میں فراموش لاحقہ ہے۔ اسی طرح کے اور کلمات لکھیے جن میں یہی لاحقہ استعمال ہوا ہو۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

(علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے حالات آپ پڑھ چکے ہیں۔ علامہؒ مرحوم نے شاعری میں نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہیں اور ان میں بھی اپنے مخصوص اندازِ فکر کا اظہار کیا۔

(۱)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(۲)

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائیدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

(۳)

مجھے آہ و فغان نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا!

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا!

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا!

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے!
وہ محفل اُٹھ گئی جس دم، تو مجھ تک دور جام آیا!

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا!

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا!

(۴)

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

سوالات

۱- اقبالؒ کی غزلوں کی خصوصیات تحریر کیجیے -

۲- دوسری غزل کے مطلع میں "گزار ہست و بود" سے کیا مراد ہے ؟

۳- چوتھی غزل میں لیلیٰ مجنوں تلمیحات ہیں - آپ بتائیے تلمیح کسے کہتے ہیں ؟ اس کی چند مثالیں بھی دیجیے -

۴- مندرجۂ ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے -

جولاں گاہ - بے حجابی - طلسم - ردائے نیلگوں - نقش کفِ پا - تیغ بے نیام -

۵- ان غزلوں کے پڑھنے سے علامہ اقبالؒ کے افکار اور ان کے پیغام کے بارے میں جو باتیں آپ سمجھے ہیں انہیں اپنے لفظوں میں قلمبند کیجئے -

فرہنگ

آ

آب و گِل کا کھیل : پانی اور مٹی کا کھیل ۔ مراد دنیا

آب خورے : مٹی کے پیالے

آرزومند : تمنا رکھنے والا

آزار : تکلیف ۔ رنج

آزردگی : رنج ۔ خفگی

آزردہ : رنجیدہ ۔ خفا

آستاں : دہلیز ۔ چوکھٹ ۔ درگاہ ۔ بارگاہ

آشوبِ چشم : آنکھ آنا ۔ آنکھوں کی بیماری

آغشتہ : آلودہ ۔ متواتر

آفات : (آفت کی جمع) بلائیں ۔ مصیبتیں

آفریں : شاباش ۔ واہ واہ ۔ سبحان اللہ

آفرینش : پیدائش

آگہ : خبردار ۔ واقف

آوازِ رحیلِ کارواں : قافلے کی روانگی کی (گھنٹی کی) آواز

آواگون : ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر جاندار مر کر کسی اور شکل میں پیدا ہوتا ہے ۔ تناسخ

آئین : قاعدہ ۔ قانون

ابیض : سفید

اِتّباع : پیروی کرنا

اتر پورب : شمال مشرق

اِتّحاد : میل جول ۔ محبت ۔ دوستی

اِلتزام : کسی بات کو لازم کر لینا ۔ اہتمام

اتھاہ : جس کی گہرائی نہ معلوم ہو

اِلتیام : زخم کا بھرنا

اثبات : (نفی کی ضد) ۔ ثبوت ۔ تصدیق

اجر : بدلا ۔ جزا ۔ انعام ۔ ثواب

اجل : موت ۔ مقررہ وقت

اِحتراز : بچنا ۔ پرہیز کرنا

احتِیاج : حاجت ۔ ضرورت ۔ غرض

احرار : آزاد اور شریف لوگ

اِحیاء : زندہ کرنا ۔ جان ڈالنا

اِختلافات : (اختلاف کی جمع)
پھوٹ - فرق - نفاق

اخگر : انگارہ - چنگاری

اِخلاص : دوستی - خلوص - محبت

اُخوّت : بھائی چارہ - بھائی بھائی ہونا

اِدبار : پریشانی - بد نصیبی

اِدراک : فہم-عقل

اِدّعاء : دعویٰ کرنا - بے دلیل بات
کہنا

اِرتِباط : میل جول - دوستی

ارزانی ہُوا : عطا ہوا - دیا گیا

استخوان : ہڈی

اِستِعجاب : تعجب

استوار : مضبوط

اِستِغراق : کسی فکر یا خیال میں
گم ہو جانا

اِستِفادہ : فائدہ حاصل کرنا

اسلوب : طریقہ - طرز - روش

اسم با مسمّیٰ : جیسا نام ویسی ہی
صفات

اَسوَد : سیاہ

اسیر : قیدی

اِشتہاء : بھوک - خواہش

اشہب : گھوڑا - سبزہ گھوڑا

اضطِراب : گھبراہٹ - بیقراری

اَطوار : (طور کی جمع ڈھنگ -
چال چلن - طریقے

اظہار : کھولنا - ظاہر کرنا -

اِعتدِال : یکساں اور برابر ہونا -
میانہ روی -

اِعتراف : مان لینا - تسلیم کرنا -
اقرار کرنا -

اِعتماد : بھروسہ - یقین -

اعجاز : معجزہ -

اَعِزّاء : (عزیز کی جمع) رشتہدار -

اعلائے کلمۃُ الحق : سچی بات کا
اعلانیہ کہنا -

اِغماض : چشم پوشی - بے پروائی -

افتادگی : عاجزی - خاکساری -

افتاں و خیزاں : گرتے پڑتے -
بدحواسی کی حالت میں -

افزائش : ترقی - بڑھنا -

افضل : سب سے اچھا -

افضلیت : بڑائی - بزرگی - اولیت -

اَفعال : (فعل کی جمع) کلام -
اعمال -

اِفلاس : مفلسی -

اقبال : خوش نصیبی - قبول کرنا -

اکارت : ضائع - بیکار -

اِکتِفاء : کافی سمجھنا - قناعت کرنا -

الامان : خدا کی پناہ -

اِلتِفات : توجہ - مہربانی -

المانی : المانیہ (جرمنی) کا رہنے والا

امانت دار : سپرد کی ہوئی چیز کی پوری حفاظت کرنے والا ۔

امتیاز : شناخت ۔ پہچان ۔ فرق ۔

امر اضافی : وہ کام جو اصلی یا لازمی نہ ہو ۔

اَنجب : انتہا درجہ کا نجیب باندی کی اولاد ۔

اندوہ : رنج و غم ۔

اَنساب : (نسب کی جمع) نسل ۔ خاندان کا سلسلہ ۔

انسداد : بند ہونا ۔ روک دینا ۔

انیس : محبت رکھنے والا ۔ دوست ۔

اوائل : ابتدا ۔ آغاز ۔

اوتار : خدا یا دیوتا کا دنیا میں انسان کی شکل میں آنا ۔

اورنگِ سلیمان : سلیمان کا تخت ۔

اوسان : حواس ۔

اولاً : پہلے ۔

اپلے گہلے پھرنا : اتراتے پھرنا ۔ خوش و خرم پھرنا ۔

ایذائیں : تکلیفیں ۔

اِیفائے عہد : وعدہ پورا کرنا ۔

ب

بات پانا : اصل مطلب سمجھ جانا ۔ بات کی تہ کو پہنچنا ۔

با لوضاحت : وضاحت کے ساتھ ۔ تفصیل سے ۔

بازیچہ : کھیل کود کی جگہ ۔

باصفا : پاک ہونا ۔ بے کدورت ہونا ۔

باطِل : (حق کی ضد) غلط ۔ جھوٹ ۔ بیکار ۔

بالائے طاق رکھنا : طاق پر رکھنا ۔ مراد بھول جانا ۔ بھلا دینا ۔

بالمواجہہ : روبرو ۔ آمنے سامنے ۔

باوا آدم نرالا ہونا : عجیب طرح کا انداز ۔ نرالا ڈھنگ ۔

بخارات : (بخار کی جمع) بھاپ ۔ دھواں ۔

بدرجہا : بہت زیادہ ۔

بدرقہ : وہ شخص جو راستے میں مسافر کی حفاظت کرے ۔ قافلے کا رہنما ۔ نگہبان ۔ (طب میں وہ دوا جو کسی دوسری دوا کی معاون ہو)

بد ظنی : بدگمانی

بدیہی : یقینی ۔ واضح ۔ (ایسی بات جو ثبوت کی محتاج نہ ہو)

براہین : (برہان کی جمع) دلیلیں

بردیمنی : ایک خاص قسم کی چادر

برزخ : وضع - دھج - انوکھی صورت - (مرنے کے بعد قیامت تک جہاں روحیں رہیں گی)
برگشتہ ہونا : پھرنا - مخالف ہونا
برودت : سردی - ٹھنڈ
برگ و بار : پھل اور پتے
برہم : پریشان - ناراض - تتر بتر
بزم طرب : خوشی کی مجلس
بِساط : قابلیت - طاقت - حیثیت
بشارت : خوش خبری
بقا : (فنا کی ضد) - قیام - وجود - زندگی
بقدرِ کافی : کافی حد تک - مناسب مقدار میں
بکاول : باورچی خانے کا داروغہ - وہ شخص جو امراء اور بادشاہوں کے سامنے کھانا چنے
بلدۂ فرّخ نہاد : مبارک شہر
بلوغت : بالغ ہونے کی عمر - جوانی کی عمر کو پہنچنا
بلیغ : اعلیٰ درجہ کا کلام - خوش بیان
بموجب : مطابق
بمقتضاء : ضرورت کے مطابق
بہ ایں ہمہ : ان سب باتوں کے باوجود

بہ تقاضائے انصاف : انصاف کی رو سے
بہ کار آمدنی : مفید - کام آنے والی چیز
بہرہ : فائدہ - نصیب - حوصلہ
بہرہ مند : خوش نصیب - فائدہ اٹھانے والا
بے بصر : اندھا
بے حرمتی : توہین - بے عزتی - بے ادبی
بیداد : ظلم - زیادتی - بے انصافی -
بے انتہاء : بے پناہ -
بیش بہا : بہت قیمتی -
بے ضرر : جس سے کوئی نقصان نہ ہو
بَیطار : گھوڑوں اور مویشوں کا علاج کرنے والا -
بیطاری : گھوڑوں اور مویشیوں کے علاج کا پیشہ -
بیعت : مرید ہونا - فرماں برداری کا عہد کرنا -
بے کنار : بے حد - بے انتہاء -
بیگانہ : غیر - پرایا - اجنبی -
بے مقدار : بے وقعت - بے وقار -
بے نوا : بیکس -
بیر : دشمنی - عداوت -
بیم و رجا : امید اور خوف
بین بین : درمیانی - بیچ کا -

پ

پاش پاش : ٹکڑے ٹکڑے ۔

پاکھا : بازو ۔ پہلو ۔ دیوار جس پر شہتیر رکھتے ہیں ۔ سائبان ۔

پالان : وہ کپڑا یا لکڑی کی ٹوکری جو اونٹ یا گدھے کی کمر پر ڈالتے ہیں ۔

پائندہ تر : زیادہ پائیدار ۔ زیادہ مضبوط ۔

پایاب : کم گہرا ، جس میں سے آدمی پار ہو سکے ۔

پر پرواز : اڑنے والے پر ۔

پرتو : عکس ۔ روشنی ۔ جھلک ۔

پرچا لینا : رام کر لینا ۔ لالچ دے کر ملا لینا ۔ راضی کر لینا

پرسش : پوچھ گچھ ۔ دریافت ۔ توجہ

پرشکوہ : شاندار ۔

پسنہاری : آٹا پیسنے والی ۔

پنگوڑا : پالنا ۔ بچوں کا جھولا ۔

پنہاں : چھپا ہوا ۔ پوشیدہ ۔

پوئی : گھوڑے کی چال کا نام ۔ دوڑنا ۔

پنپک : بڑھنا ۔ درخت کا بڑھنا ۔ سن کا بڑھنا ۔

پھریرے : جھنڈے ۔

پھینٹا : چھوٹی پگڑی ۔ دس بارہ گرہ کپڑے کا ٹکڑا جو ملازم سر پر باندھ لیتے ہیں ۔

پیش قدمی کرنا : سبقت کرنا ۔

پیش مصرع : مصرع اولیٰ ۔ پہلا مصرع ۔

پیش نظر : سامنے ۔ مدِ نظر ۔

پیش و پس : ہچکچاہٹ ۔

پیوستہ : ملا ہوا

پیر : بوڑھا ۔

پیکار : جنگ ۔ لڑائی ۔

ت

تابناک : روشن ۔ چمکدار ۔

تأثر : اثر لینا ۔ اثر قبول کرنا ۔

تاخیر : دیر کرنا ۔

تار و پود : تانا بانا ۔

تازی : عرب کا ۔ عربی گھوڑا ۔ شکاری کتا ۔

تازیانہ : کوڑا ۔ تازیانہ ۔

تامّل : سوچنا ۔ دیر کرنا ۔ وقفہ ۔

تپاں : تڑپنے والا ۔

تجاوز : حد سے گزرنا ۔ فرق ۔ انحراف ۔

تحسین : تعریف ۔

تحسینِ ناشناس : ناسمجھ کی واہ واہ ۔ ناواقف کی تعریف ۔

تحصیل : حاصل کرنا ۔ وصول کرنا ۔
تحقیق : کھوج لگانا ۔ تصدیق ۔ تفتیش ۔
تخالُف : مخالفت ۔
تدبیر : غور کرنا ۔ علاج ۔ چارہ ۔ کوشش ۔
تدریج : درجہ بدرجہ ۔ تھوڑا تھوڑا ۔
تدقیق : باریک بات نکالنا ۔ غورو فکر ۔
ترجمان : تفسیر کرنے والا ۔ بیان کرنے والا ۔
ترجیح : فوقیت ۔ فضیلت ۔
ترحُّم : رحم ۔ مہربانی ۔ ترس ۔
تردُّد : سوچ ۔ فکر ۔ پس و پیش ۔
تردُّدات : (تردد کی جمع) ۔ پریشانیاں ۔ فکریں ۔
ترکش : تیر دان ۔ جس میں تیر رکھے جاتے ہیں ۔
ترم : بگل ۔
تسخیر : قابو میں لانا ۔ تابع کرنا ۔
تسلُّط : غلبہ ۔ قبضہ ۔
تشدُّد : سختی کرنا ۔ جبر ۔ ظلم ۔
تشویش : پریشانی ۔ گھبراہٹ ۔ فکر
تصرف : قبضہ اختیار ۔ تبدیل ۔ اپنی طرف سے کچھ بنانا ۔

تصنُّع : بناوٹ ۔ دکھاوا ۔
تصوُّر : خیال ۔
تضییعِ اوقات : وقت ضائع کرنا ۔
تعارض : جھگڑا کرنا ۔ مقابل ہونا ۔
تعزیر : سزا ۔
تعصُّب : بےجا حمایت ۔ طرفداری ۔
تعمیر : مرمت کرنا ۔ بنانا ۔
تفاخُر : فخر جتانا ۔ ڈینگ مرنا ۔
تفاوُت : فرق ۔ جدائی ۔ فاصلہ ۔
تفریق : علیٰحدہ کرنا ۔ گھٹانا ۔
تفسیر : تشریح ۔ کلام پاک کی شرح ۔
تفضیح : رسوا کرنا ۔ فضیحت کرنا ۔
تفنُّن : دل لگی ۔ مذاق ۔ تفریح ۔
تفویض کرنا : سپرد کرنا ۔ عطا کرنا ۔
تقابُل : مقابلہ ۔
تقابلی : آمنے سامنے رکھ کر مطالعہ کرنا ۔
تکبر : غرور ۔ شیخی ۔ گھمنڈ ۔
تگ و دو : جہد و جہد ۔ بھاگ دوڑ ۔
تلف : ضائع کرنا ۔ ضائع ہونا ۔
تلقین : سمجھانا ۔ نصیحت کرنا ۔

تلخ کام : ناگوار مقصد والا ۔ کڑوا ہونا ۔
تمدّن : طرز ۔ معاشرت۔ رہنے سہنے کا انداز ۔ تہذیب ۔
تنازُع : جھگڑا ۔ نا اتفاق ۔
تند : تیز ۔ غضبناک ۔ سخت ۔ کڑوا ۔
تنظیم : انتظام کرنا ۔ منظم کرنا۔ درست کرنا ۔
تنعُّم : ناز و نعمت سے زندگی بسر کرنا ۔
تنقیح : عیوب سے پاک کرنا ۔ خالص کرنا ۔ تحقیق کرنا ۔
تنگدستی : مفلسی ۔
تن آساں : آرام طلب ۔
تنویر : روشنی ۔ چمک ۔
توازُن : ہموزن ہونا ۔ اعتدال قائم رکھنا ۔
تواضُع : خاطر مدارت
توافُق : مطابق ہونا ۔ موافق ہونا
توجیہیں : دلیلیں دینا ۔ وجوہات بیان کرنا ۔
توسن : گھوڑا ۔ شوخ اور سرکش گھوڑا ۔
توسیع : وسعت ۔ پھیلاؤ ۔
توشہ : زاد راہ ۔ مسافروں کا کھانا

توشہ خانہ : وہ مکان جس میں امیروں کی پوشاک وغیرہ رہتی ہے ۔ خیرات خانہ ۔
توضیح : وضاحت کھول کر بیان کرنا ۔
توقیر : عزت ۔ وقعت ۔
توکّل : قناعت ۔ سارے کام خدا پر چھوڑ دینا ۔
تونگر : مالدار ۔ دولت مند ۔
تیرگی : سیاہی ۔ اندھیرا ۔
تیغ بے نیام : ننگی تلوار ۔
تیغہ کرنا : دروازے کو اینٹ پتھر سے چن کر بند کر دینا ۔

ٹ

ٹاپو : جزیرہ ۔
ٹھاکر : کرشن ۔ دیوتا ۔
ٹھاکر دوارا : کرشن کا مندر ۔
ٹھلیا : گھڑیا ۔

ث

ثانیاً : مکرر ۔ دوبارہ ۔ دوسرا ۔
ثقافت : کسی قوم کی تہذیب تمدن اور روایات وغیرہ ۔
ثمرہ : بدلہ ۔ نتیجہ حاصل ۔
ثناء : تعریف ۔ مدح۔ حمد و نعمت

ج

جامع : جمع کرنے والا ۔ شامل ۔ حاوی ۔

جاں بحق ہونا : مر جانا ۔

جاں فشانی : سخت محنت ۔ بہت کوشش ۔

جاں گداز : جان گھلانے والا ۔

جاوید : ہمیشہ ۔ سدا ۔

جاہ و منصب : قدر و منزلت ۔ رتبہ شان ۔

جی ستی : سچا ۔ پکا ۔ پختہ عقیدے والا ۔

جدال : جنگ ۔ لڑائی ۔

جدت : نیا پن تازگی ۔

جزئیات : (جز کی جمع) چھوٹے چھوٹے کام ۔ حصے ۔ ٹکڑے ۔

جسد : جسم ۔ بدن ۔

جلو میں : ہمراہ ۔ ساتھ ۔

جلیل القدر : بڑے مرتبے والا ۔

جنجال : آفت ۔ مشکل ۔ الجھن ۔

جنگہ : میدان جنگ ۔

جود : سخاوت ۔ بخشش ۔

جور و جفا : ظلم و ستم ۔

جولاں گاہ : گھڑ دوڑ کی جگہ ۔ جد و جہد کا میدان ۔

جوہر ذاتی : وہ ہنر یا کمال جو کسی کی فطرت میں ہو ۔

جُویا : تلاش کرنے والا ۔ متلاشی ۔

جہاں بانی : دنیا پر حکومت کرنا ۔ دنیا کی نگرانی کرنا ۔

جہاں گیری : دنیا کو فتح کرنا ۔

جہل : جہالت ۔ گمراہی ۔

چ

چابکدستی : مہارت ۔

چار و ناچار : مجبوراً ۔

چارہ ساز : کام بنانے والا ۔ علاج کرنے والا ۔

چاؤ : ارمان ۔ حسرت ۔ لاڈ ۔ شوق ۔

چشم زدن میں : پلک جھپکنے کی دیر میں ۔ ذرا سی دیر میں ۔

چکھوتیاں : لذیذ کھانے ۔ چٹورا پن ۔

چوب : لکڑی ۔

چھتر : تخت شاہی کے اوپر والی چھتری ۔

چھدّا : احسان چڑھانا ۔

چُہل : ہنسی ۔ مذاق ۔

چھل بل : شوخی ۔ چالاکی ۔

ح

حبیب : دوست ۔

حادِث : فنا ہونے والا ۔ زوال قبول کرنے والا ۔

حباب : پانی کا بلبلا ۔

حتیٰ کہ : یہاں تک کہ ۔

حتی الوسع : جہاں تک ہو سکے ۔ جس قدر ممکن ہو ۔

حَشرات الارض : کیڑے مکوڑے ۔

حقارت : نفرت ۔ اہانت ۔ ذلت ۔

حقائق : (حقیقت کی جمع) سچائیاں ۔

حقانیت : سچائی ۔ صداقت ۔

حقیقت ثانیہ : مسلمہ سچائی ۔ ثابت شدہ صداقت ۔

حلقوم : حلق ۔

حلیم الطبع : برد بار ۔ مُتحمِّل مزاج ۔

حمیّت : غیرت ۔

حنظل : ایک نہایت کڑوا پھل ۔ ایلوا ۔

حوادِث : (حادثہ کی جمع) مصیبتیں ۔ تکلیفیں ۔

حور وَش : حور کی طرح حسین ۔

حیات افروز : زندگی کو بڑھانے والا ۔

حیات و ممات : موت اور زندگی ۔

حیص بیص : تکرار ۔ بحث

حیف : افسوس ۔

خ

خار و خس : گھاس پھوس ۔ کوڑا کرکٹ ۔

خاطر خواہ : مرضی کے مطابق ۔ پسند کے مطابق

خاک باز : محتاج ۔ آفت زدہ

خال : تل

خانوادہ : خاندان۔ صوفیہ کا سلسلہ

خبر تراش : خبر گھڑنے والے ۔ افواہ اڑانے والے

خداوند : آقا - مالک

خزف : کوڑی

خرد : عقل

خرابات : شراب خانہ

خرخشے : فکریں ۔ الجھنیں ۔ پریشانیاں

خرم : خوش

خس : تنکے ۔ سوکھی گھاس ۔ ایک قسم کی خوشبودار گھاس کی جڑ جس کی ٹٹیاں بناتے ہیں

خشت : اینٹ

خفتگان خاک : خاک میں سوئے ہوئے ۔ قبروں میں دفن

خفیف : ذلیل ۔ ہلکا ۔ چھوٹا

خفیف ہونا : شرمندہ ہونا ۔ ذلیل ہونا

خلد : جنت

خالقِ جمہور : مخلوق کا خدا ۔ انسانوں کو پیدا کرنے والا

خلل انداز ہونا : کسی چیز میں رکاوٹ ڈالنا

خُم : مٹکا

خواص : خاص لوگ ۔ (عوام کی ضد)

خوردنی : کھانے کے قابل

د

داد سخن گوئی : شاعری کی تعریف

دارالبقا : ہمیشہ رہنے کا گھر

دارالسلام : سلامتی کا گھر

دارالفنا : فنا کا گھر ۔ دنیا

دار و رسن : سولی اور پھانسی

دبازت : موٹائی

دخل در معقولات : کسی معاملے میں خواہ مخواہ دخل دینا

درماندہ : مجبور ۔ بے کس

دریدہ : پھٹا ہوا

دساور : غیر ممالک ۔ بیرون ملک

دستیاب : حاصل ہونا ۔ ملنا

دشت : صحرا ۔ جنگل

دفعۃً : اچانک

دکھڑا : تکلیف کا بیان ۔ گلہ ۔ شکوہ

دلکی : گھوڑے کی چال کا نام ۔ تیز چال جس میں گھوڑا اچھل اچھل کر چلتا ہے

دل کشا : دل کو خوش کرنے والا

دل گداز : دل کو نرم کرنے والا

دم پھولنا : سانس چڑھنا

دم واپسیں : آخری وقت ۔ مرنے کا وقت

دو بدو : آمنے سامنے

دو نیم : دو ٹکڑے

دہائی : فریاد ۔ داد خواہی

دیا : رحم ۔ بخشش ۔ عنائیت

دیارِ غیر : پردیس

دَیر : بت خانہ ۔ عیسائی راہبوں کے رہنے کی جگہ

دانتوں میں خس لینا : عاجزی کا اظہار کرنا

ذ

ذوالفضل : فضل و کرم کرنے والا

ذوالفقار : حضرت علیؓ کی تلوار کا نام

ذی جاہ : مرتبے والا

ذی حشم : شان و شوکت والا

ر

رابطہ : تعلق

راست : سیدھا ۔ سچا

راستی : سچائی ۔

رام ہونا : مطیع ہونا ۔

راہ و رسم : میل جول ۔ تعلقات ۔

راہ ماری : رہزنی ۔ مسافروں کو لوٹنا

رائج : رواج پانا ۔

رائیگاں : بے کار ۔ ضائع ۔

رب رع : قدیم مصر کا ایک دیوتا خدا۔

ربیب : لے پالک ۔

رجحان : میلان ۔ توجہ ۔

رجوع : لوٹنا ۔ جھکنا۔ مائل ہونا ۔

راکب : سوار

رزم گہ : میدان جنگ ۔

رسوم : (رسم کی جمع) طریقے ۔ رواج ۔

رسیا ; شوقین ۔

رفع ضرورت کے لیے : ضرورت پوری کرنے کے لیے ۔

رقابت : دشمنی ۔

رمز : اشارہ ۔ کنایہ ۔ پیچدار بات ۔

روابط : تعلقات ۔

روزگار : دنیا ۔ زمانہ ۔ مدت ۔ شغل

روش : طریقہ ۔ ڈھنگ ۔

رہرو : مسافر ۔

ریا ۔ دو رنگی ۔ دنیا سازی ۔

ریاحین : (ریحان کی جمع) خوشبودار پھول ۔ پھول

ریزہ : ٹکڑا۔

ز

زاد راہ : سفر کا سامان ۔ راہ کا خرچ

زاغ : کوا ۔

زائد المیعاد : میعاد سے زیادہ پرانا

زحمت : تکلیف ۔

زربفت : زری کا کپڑا ۔

زشت : برا ۔ بدنما ۔

زمزمہ : نغمہ ۔

زمن : وقت ۔ زمانہ ۔

زیارت : کسی متبرک مقام یا چیز یا آدمی کا دیکھنا ۔ درگاہ ۔

زیر دام آنا : جال میں پھنسنا ۔

زینہار : ہرگز ۔

س

ساختہ پرداختہ : بنایا ہوا ۔ سنوارا ہوا

ساز باز : سازش ۔

ساعی رہنا : کوشاں رہنا ۔

ساکن : ٹھہرا ہوا ۔

ساگر ۔ سمندر ۔

سانڈنی : تیز رفتار اونٹنی ۔

سان گمان نہ ہونا : خیال تک نہ ہونا ۔ شبہہ بھی نہ ہونا ۔

سُبقت : پہل کرنا ۔

سبک ہونا : رسوا ہونا ۔

سپر : ڈھال ۔

سپہر : آسمان ۔

ستیز : لڑائی ۔ جنگ ۔

سحر : جادو ۔

سحر سازی : جادو گری ۔

سخن پردازی : شاعری ۔ کلام ۔
بات چیت ۔

سرایت کرنا : تاثیر کرنا ۔ جذب کرنا

سربر آوردہ : مشہور ۔ بڑے ۔

سرخرو : کامیاب ۔ با آبرو ۔

سرزد ہونا : واقع ہونا ۔ ظہور میں آنا

سرعت : جلدی ۔ تیزی ۔

سرگرم : پر جوش ۔

سرگم : راگ کے ساتوں سروں کا مجموعہ

سریر : تخت ۔ مسند شاہی

سزاوار : مستحق ۔ لائق ۔ مناسب

سعی : کوشش

سفال : مٹی

سقہ : پانی بھرنے والا ۔ ماشکی

سکرات : نزع کی تکلیف ۔ جان کنی
کی تکلیف

سلاسل : زنجیر

سلسبیل : جنت کی ایک نہر کا نام

سلف : پہلے کا ۔ گزشتہ

سماء : آسمان

سماں : وقت ۔ زمانہ

سمند : بادامی رنگ کا گھوڑا ۔ گھوڑا

سنگریزہ : کنکر ۔ پتھر کا ٹکڑا

سنگلاخ : سخت ۔ پہاڑی زمین ۔
مشکل

سوا : زیادہ ۔ علاوہ

سوانح : واقعات ۔ کسی کی زندگی
کے حالات

سودمند : مفید ۔ فائدہ مند

سہارنا : برداشت کرنا ۔ سہنا

سہل : آسان

سیف : تلوار

سیل فنا : فنا کا سیلاب

سیلی : تھپڑ

سیماب : پارہ

سینہ زوری : زبردستی ۔ سرکشی

سیہ کار : گنہگار

ش

شادی مرگ : خوشی کی زیادتی سے
موت آ جانا ۔ افراط مسرت سے
مرنے والا

شاذ : کم ۔ نادر ۔ انوکھا

شاگرد پیشہ : نوکر چاکر

شان کئی : کیخسرو بادشاہ جیسی
شان

شانِ نزول : کسی بات کے واقع
ہونے کا موقع

شتاب : جلدی

شجر : درخت

شرابور : تربتر - بھیگا ہوا
شرطِ رضا : خدا کے حکم پر راضی رہنے کی شرط - راضی بہ رضا رہنے کا تقاضا
شرف : بزرگی - فوقیت - خوبی
شِعار : دستور - طور- طریقہ - عادت
شغب : فتنہ و فساد - شور - غل
شغف : بہت رغبت - بہت دلچسپی
شملہ : دستار - طرہ - پگڑی
شناور : پیراک - پیرنے والا
شور بور : شرابور
شورش : شور و غوغا - بلوہ - فساد
شیوہ : طریقہ - دستور - ڈھنگ

ص

صادق الولاء : دوستی میں سچا
صاعِقہ : بجلی جو زمین پر گرے
صائب الرائے : صحیح رائے والا
صبر آزما : صبر کا امتحان لینے والا - بہت مشکل کام
صِدق : سچائی - خلوص
صرّاف : سونا چاندی پرکھنے والا- مہاجن
صف آرا : پر جمانے ہوئے - مقابل ہونا
صُلب : نسل

ض

ضامن : ذمہ دار - ضمانت دینے والا
ضم ہونا : شامل ہونا - جذب ہونا
ضعفِ پیری : بڑھاپے کی کمزوری

ط

طبعی سعادت : فطری نیکی
طرب : خوشی
طفولیت : لڑکپن
طلسم : جادو
طواف : چاروں طرف پھرنا - چکر لگانا
طے الارض : ایک عمل جسکا عامل ایک جگہ سے دوسری جگہ خود بخود پہنچ جاتا ہے
طیور : (طائر کی جمع) پرندے

ع

عارضہ : مرض - بیماری
عاریت : ادھار - قرض
عافیت : سلامتی - خیریت
عاقلہ : عقلمند عورت
عبودیت : بندگی - اطاعت
عجَمی : غیر عرب - عجم کا رہنے والا
عدم تشدُّد : اہنسا - تشدد نہ کرنا

عدو : دشمن

عدیل : نظیر ۔ مثال ۔ برابر

عرض ہنر : اظہار کمال

عزیمت : ارادہ ۔ قصد

عسرت : تنگ دستی

عطائی : جس نے کوئی ہنر یا فن باقاعدہ نہ سیکھا ہو

عظمت و جلالت : بڑائی ۔ بزرگی

عفیفہ : پارسا عورت

عقوبتیں : مصیبتیں ۔ سختیاں

علاقہ : تعلق ۔ لگاؤ

عمق : گہرائی

عمل داری : حکومت ۔ اختیار

عناد : دشمنی ۔ عناں گیر ہونا ۔ چلنے سے روکنا

عواقِب : (عاقبت کی جمع) کاموں کے انجام

عوض : بدلا ۔ بجائے

غ

غایَت : غرض ، انتہاء

غرب : مغرب

غربت : پردیس

غرہ شوال : ماہ شوال کی پہلی تاریخ

غضب : غصہ ۔ آفت ۔ مصیبت

غلغلہ : شور ۔ دھوم

غماز : چغلخور ۔ اشارہ کرنے والا

غنا : بے نیازی ۔ راگ

غیور : غیرت والا

ف

فاسد : خراب کرنے والا

فائق : فوقیت رکھنے والا ۔ بڑھا ہوا ۔ معزز

فتنہ زا : فساد پیدا کرنے والا

فتوح : آمدنی

فدیہ : وہ مال جو قیدی کو آزاد کرانے کے لیے دیا جائے

فراخ : وسیع ۔ کشادہ

فرزانے : عقلمند ۔ دانا

فراموش کرنا : بھول جانا

فراوانی : افراط ۔ کثرت

فرحت : خوشی

فَرَس : گھوڑا

فریفتہ : فریب میں آیا ہوا ۔ عاشق۔ دل دادہ

فضائل : (فضیلت کی جمع) خوبیاں۔ اچھائیاں

فضیحت : رسوائی ۔ ذلت ۔ بدنامی

ففتھ کالمسٹ : جاسوس ۔ مخبر

فقدان : نہ ہونا

فقر : درویشی

فلاح : نجات ۔ بھلائی

فلک زدہ : قسمت کا مارا ۔ مصیبت زدہ

فہم : سمجھ ۔ عقل

ق

قاش : ٹکڑا ۔ پھانک

قانع : قناعت کرنے والا ۔ تھوڑی چیز پر صبر کرنے والا

قباحت : برائی ۔ نقص ۔ خرابی ۔

قبالے : وہ تحریر جس سے جاگیر وغیرہ کی ملکیت ثابت ہو ۔

قبے : گنبد ۔

قدرے : ذرا دیر ۔

قدم گیری کرنا : پاؤں پکڑنا ۔

قدیم : ہمیشہ کا ۔ ازلی ۔ جس کی کوئی ابتداء نہ ہو ۔

قرینِ مصلحت : وہ بات جو مصلحت کے مطابق ہو ۔

قسّام ازل : ازل کے دن کا تقسیم کرنے والا ۔ خدا ۔

قصد : ارادہ ۔ نیت ۔

قصیدۂ مدحیہ ۔ تعریف کے اشعار ۔ تعریف ۔

قضا را : اتفاق سے ۔ اتفاقاً ۔

قضا کرنا : مرنا ۔ وقت گزرنے کے بعد نماز پڑھنا

قطع : وضع ۔ وہج ۔

قلاش : مفلس ۔

قُلزم : سمندر ۔

قلق : رنج ۔ بیتابی ۔ پچھتاوا ۔

قلمرو : سلطنت ۔ دائرہ اختیار ۔

قوتِ حس : محسوس کرنے کی قوت ۔

قوت ناطقہ : بولنے کی قوت ۔

قہر : غصہ ۔ مصیبت ۔

قبضۂ قدرت : دائرہ اختیار ۔

ک

کار خیر ۔ نیک کام ۔

کار عظیم : بڑا کام ۔

کاسے : پیالے ۔

کالعدم : بے وقعت۔ختم کرنا ۔

کاہن : غیب کی خبریں بتانے والا ۔

کپوت : ناخلف ۔ نالائق بیٹا ۔

کجلانا : دھندلا ہو جانا۔ ماند پڑنا

کدورت : رنج ۔ ناراضگی ۔ غبار

کردگار : خدا ۔

کرشمہ سازی : شعبدہ دکھانا ۔ انوکھی بات کرنا

کرگس : گدھ ۔

کِرم شب تاب : جگنو ۔

کریم النفس : نیک دل ۔ نیک مزاج ۔ مہربان ۔

کسل : کاہلی ۔ تھکن ۔

کس مپرسی : بے کسی ۔

کِشت : کھیتی ۔

کُشتہ : مقتول ۔

کِلک : قلم ۔

کلک قضا : قدرت کا قلم ۔

کلیتہً : پوری طرح ۔

کماحقہ : مکمل طور پر۔ پوری طرح

کمال : خوبی ۔ بہت زیادہ ۔

کہن سال : بوڑھا ۔ بہت عمر کا ۔

کھیت آنا : لڑائی میں مارے جانا۔

کیفیتِ صہبا : شراب کا نشہ ۔

گ

گانٹھ کا پورا : دولتمند ۔ مالدار ۔

گزران : گزارہ ۔

گراں قدر : قیمتی ۔

گریز : فرار ۔ بھاگنا ۔ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف آنا

گریہ : رونا ۔

گڑھ : قلعہ ۔ مرکز ۔

گِل : مٹی ۔

گلزار ہست و بود : (مجازی معنی) دنیا

گم گشتگی : کھویا جانا ۔

گوہرِ مراد : مقصد کا موتی ۔

گویائی : بولنے کی قوت ۔

گھٹنا : ایک قسم کا تنگ موری کا پاجامہ ۔

ل

لا ابالی : بے فکر ۔ بے پروا ۔

لا شریک : جس کا کوئی شریک نہ ہو ۔ خدا ۔

لاگ : دشمنی ۔ تعلق ۔

لامتناہی : بے انتہا ۔ بے حد ۔

لپاڈگی : مار پیٹ ۔

لسانی عصبیت : زبان کے معاملے میں تعصب ۔

لطف : مہربانی ۔ مزا ۔

لغزش : لڑکھڑانا ۔ استقلال میں کمی آنا ۔ گمراہ ہونا ۔

لکنت : ہکلا پن ۔

لگاؤ : ایسا برتاؤ کرنا جس سے محبت غلط ظاہر ہو ۔ تعلق ۔

لن ترانی : تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا ۔

لوح : لکھنے کی تختی ۔

لیک : پگڈنڈی ۔

لیل و نہار : رات اور دن ۔

م

مبادا : ایسا نہ ہو ۔ خدا نہ کرے

مُبہَم : مشتبہ ۔ وہ بات جس کا مطلب صاف نہ ہو ۔

مبہوت : حیران ۔ ہکا ۔ بکا ۔

متاع : پونجی ۔ اثاثہ ۔

متامل : تامل کرنے والا ۔ غور کرنے والا ۔

متبدّل : تبدیل ہونے والا ۔

متحیّر : حیرت زدہ ۔ متعجب ۔

متعدد : چند ۔ کئی ۔ مختلف ۔

متلاطِم : موجیں مارتا ہوا ۔ (دریا)

متنازع فیہ : جس بات میں اختلاف ہو ۔ جس میں نزاع ہو ۔

متنبّہ : خبر دار ۔ چوکس ۔ ہوشیار

متنفِّس : سانس لینے والا ۔ جان دار ۔ آدمی ۔

متوکّل : صابر ۔ بھروسہ کرنے والا ۔

متین : مضبوط و مستقل مزاج ۔ سنجیدہ ۔

مجوزہ : تجویز شدہ ۔ مقررہ ۔

محاسدہ : حسد کرنا ۔

محاسن : خوبیاں ۔ اچھائیاں ۔

محال : غیر ممکن - مشکل -

محدب شیشہ : وہ شیشہ جس سے چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہو -

محرمانِ خاص : خاص راز دار -

محشور : حشر کیا گیا - اٹھایا گیا -

محکم : مضبوط - پائدار - پکا -

محکمیت : مضبوطی -

محنتانہ : محنت کا صلہ - وکیل کی فیس -

محنت کشی : جفا کشی - محنت کرنا -

محویت : محو ہونا - کسی خیال میں کھوئے ہونا -

محیط : احاطہ کرنے والا -

مخبوط الحواس : پاگل - خبطی -

مدارات : خاطر داری -

مدام : ہمیشہ - متواتر -

مدعی : دعویٰ کرنے والا - رقیب -

مراقی : خبطی -

مرجع : پناہ کی جگہ - رجوع ہونے کی جگہ -

مرحمت : مہربانی - عنایت - عطا -

مردہ شوئی : مردوں کو غسل دینے کا کام -

مرصّع : نگینے یا جواہرات جڑا ہوا - خوش بینی سے آراستہ -

مرقّع : تصویروں کی کتاب - البم -

مرکب : گھوڑا - سواری کی چیز -

مرکّبات : (مرکب کی جمع) کئی چیزوں سے مل کر بنا ہوا - ملی ہوئی دوائیں -

مزاحِم ہونا : روکنا - حائل ہونا -

مزروع : کھیتی - کھیت -

مژدہ : خوش خبری - مبارکباد -

مسافت : پہل کرنا - سبقت لے جانا -

مساعی : (سعی کی جمع) کوششیں -

مستحسَن : اچھا - پسندیدہ -

مستحکَم : مضبوط - پکا - پائیدار -

مسترَد : رد شدہ - واپس کیا گیا -

مستعمَل : استعمال کیا ہوا - کام میں لایا ہوا - مروّج -

مستغنی : بے پروا - مالدار - فارغ البال -

مستفید : فائدہ چاہنے والا - فائدہ اٹھانے والا -

مستقَر : ٹھہرنے کی جگہ - ٹھکانا -

مسطّح : ہموار -

مسکن : ٹھکانا - رہنے کی جگہ - مکان -

مسلک : راستہ - طریقہ - دستور -

مسلّم : تسلیم کیا گیا - مانا گیا -

مشّاطہ : بناؤ سنگار کرانے والی عورت - رشتے تلاش کرنے والی عورت -

مشرب : مذہب - طریقہ - ڈھنگ -

مشکوریت : ممنونیت - شکر گزاری -

مشیئت : خدا کی مرضی -

مشیخت : بزرگی - شیخی - گھمنڈ
مصارف : (صرف کی جمع) - اخراجات
مصالحت : میل ملاپ ـ صلح کرنا۔
مصمم : پختہ پکا ۔
مضائقہ : ہرج - پروا - قباحت ۔
مضر : نقصان دہ -
مضرّت : نقصان
مطبخ : باورچی خانہ -
مطرب : گانے والا ـ گویا ـ قوال ـ
مطہر : پاک - پاک کیا گیا ـ
معاذ اللہ : خدا کی پناہ ـ توبہ توبہ
معبد : عبادت خانہ ـ
معتبر : قابل اعتبار ـ
معتقدات : عقائد ۔
معتوب : عتاب کیا گیا ـ وہ شخص جس پر عتاب ہو ـ
معذرت : عذر کرنا ـ مجبوری ظاہر کرنا ـ
معذور : مجبور - معافی کے قابل -
معرفت : پہچان ـ خدا کی پہچان ـ وسیلہ -
معطّر : خوشبودار ـ خوشبو میں بسا ہوا ـ
معقول : عقل میں آنے والا ـ سمجھدار - پسندیدہ ـ

مغتنم : غنیمت ـ
مغلوب : ہارا ہوا ـ دبا ہوا ـ
مفاہمت : سمجھوتہ ـ
مفت کرم داشتن : خواہ مخواہ کا احسان چڑھانا -
مَفَر : بھاگنے کی جگہ - چارہ کار -
مفقود : کھویا ہوا - طائب - نوارد -
مفلوک : مفلسی - تباہ حال -
مقامِ اِنقطاع : الگ ہونے کی جگہ - کٹ جانے کی جگہ -
مقدَم : آگے کیا گیا ـ ضروری - لازم ـ
مقدّمہ : تمہید - پیش خیمہ -
مقصود : مطلب ـ غرض - قصد کیا گیا -
مقطّع : مہذب ۔ سنجیدہ ـ
مقہور : جس پر قہر ہو -
مقیاس النیل : دریائے نیل کو ناپنے کا پیمانہ -
مُکرّم : مہربانی کرنے والا -
مکرَمت : عنایت - مہربانی -
ملاحظہ کرنا : دیکھنا - توجہ کرنا ـ غور کرنا -
ملامت : برا بھلا کہنا - ڈانٹنا ـ
ملکہ : مہارت -

ملمّع : سونا چاندی چڑھانا ۔ قلعی کرنا ۔

ملوّث : آلودہ ۔ لتھڑا ہوا ۔

مناصِب : (منصب کی جمع) ۔ رتبے ۔ عہدے ۔

منت : احسان ۔ خوشامد ۔

منتقِل : تبدیل ہونا ۔ تبدیل کرنا ۔

منت کش : احسان لینے والا ۔

منحرِف ہونا : پھر جانا ۔ سرکشی کرنا ۔ غداری کرنا ۔

منغّض : مکدر ۔ ناخوش

منفعت ؛ فائدہ ۔ منافع

منقوش خاطر : ذہن نشین

منکِسر مزاج : وہ شخص جس کے مزاج میں انکسار ہو

منکِر و نکیر : وہ فرشتے جو قبر میں مردوں سے سوال و جواب کریں گے

منہا کرنا : کم کرنا ۔ گھٹانا ۔ تفریق کرنا

موافقات : (موافق کی جمع) مناسب ۔ ٹھیک

موالات : آپس کی دوستی ۔ میل ملاپ

مور : چیونٹی

مورِ بے حقیقت : کمزور چیونٹی ۔ بے حقیقت چیونٹی

مونِس : ہمدرد ۔ دوست

مہلک : ہلاک کرنے والا ۔ خطرناک

مہم : بڑا کام ۔ مشکل کام ۔ معرکہ ۔ لڑائی

مُہیب : خطرناک ۔ ڈراؤنا

میراث : ورثہ

مینائے لاجورد : نیلی صراحی ۔ آسمان

ن

نابلد : انجان ۔ ناواقف

نادر : کمیاب ۔ عمدہ ۔ عجیب

ناقہ : اونٹنی ۔ سانڈنی

ناگہ : اچانک ۔ اتفاق سے ۔ اتفاقاً

ناممکن العمل : جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہو ۔ محال

ناموری : شہرت

نامولود : جو ابھی پیدا نہیں ہوا

نبرد : جنگ ۔ لڑائی

نجّاری : بڑھئی کا کام ۔

نجیب : شریف

نجیب الطرفین : جو ماں باپ دونوں کی طرف سے شریف ہو

نخوت : غرور

نزاع : جھگڑا ۔ فساد

نشاط : خوشی ۔ عیش ۔ سرگرمی

نشان : کھوج - سراغ - جھنڈا - علم

نصب العین : اصل مقصد - مد نظر

نصف النہار : دوپہر کا وقت

نطق : قوت گویائی - بات - گفتگو

نظم و نسق : بندوبست - اہتمام

نقشِ کف پا : پیر کا نشان

نمودار ہوا : ظاہر ہوا

ننگ : شرم - عیب

نوازندہ : ساز بجانے والا

نوبت : نقارہ - نقار خانہ - باری - موقع - وقت

نہال : درخت

نیارا : انوکھا - جدا - مختلف

نہوڑانا : جھکانا

و

واشگاف : واضح طور پر - کھول کر - (اعلانیہ)

واضح : ظاہر - صاف

وجہ گرانی : ناراضگی کی وجہ

وداع : رخصت

وسعت : پھیلاؤ

وسیع : پھیلا ہوا

وصف : تعریف - خوبی - صفت

وصف ذاتی : فطری خوبی

وظیفہ : وہ چیز جو ہر روز کے لیے مقرر ہو

ہ

ہجو : برائی

ہراس : خوف ڈر

ہدفؔ : نشانہ

ہم صفیر : ایک طرح کی بولیاں بولنے والے پرندے - ساتھی - ہمنشیں

ہم مشرب : ایک ہی مشرب کے لوگ - ہم مذہب

ہوالشافی : (وہ شفا دینے والا ہے) حکیم نسخے کے اوپر لکھتے ہیں

ہول : خوف - دہشت

ہویدا : ظاہر - عیاں

ہیبت : دہشت - رعب

ہیچ مداں : نادان - بے علم - بولنے والا انکسار سے اپنے لیے کہتا ہے

ہیچ میرز : بے حقیقت - ناچیز

ہیولیٰ : ہر چیز کا مادہ - ہر چیز کی اصل اور ماہیت

ہیہات : افسوس

ی

یاس : مایوسی

ید طولیٰ : کمال - مہارت

یکتا : بے مثل - جواب

یکجہتی : اتفاق - اتحاد - دوستی

یکسر : تمام - بالکل

یگانہ : اکیلا - بے مثل